اسلامی اخلاق و آداب پر
لاجواب کتاب

اُسوۃ الصّالحین

ترجمہ

آدابُ الصّالحین

تالیف: حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

مُترجم:
حضرت مولانا عبدالرحمن جامی



ادبی دنیا

اسلامی اخلاق و آداب پر لاجواب کتاب

اُسوۃ الصّالحین

ترجمہ

آدابُ الصّالحین

تالیف

حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

مترجم

حضرت مولانا عبد الرحمٰن جامی

****

ادبی دنیا

510، مٹیا محل، جامع مسجد دہلی

نام کتاب	:	آداب الصالحین
مصنف	:	شیخ عبدالحق محدیث دہلوی
مترجم	:	حضرت مولانا عبدالرحمان جامی
اشاعت	:	2006
تعداد	:	1000
مطبع	:	ناحد آفسیٹ پرنٹرس، دہلی۔٦
قیمت	:	/-

ناشر

ادبی دنیا ۵۱۰ مٹیا محل دہلی ٦

فہرست اُسوۃ الصَّالحین

صفحہ نمبر

(باب چہارم)

باب پنجم

(باب ششم)

(باب ہفتم)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہٗ و نصلّی علیٰ رسولہ الکریم

مقدمہ از مترجم عفی عنہٗ

رسالہ آداب الصالحین مؤلفہ حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ فارسی زبان میں ایک نہایت ہی مفید اصلاحی رسالہ ہے۔ وجہ تالیف تو خود حضرت شیخ موصوفؒ نے اپنے مقدمہ میں بیان فرمائی ہے لیکن اس کے افادہ کو دیکھ کر حضرت شاہ محمد اسحٰق صاحب محدث دہلویؒ کے ایک تلمیذ خاص نواب مولانا محمد قطب الدین خاں صاحبؒ سے ان کے کسی مخلص نے فرمائش کی کہ حضرت شیخ کا یہ رسالہ نہایت ہی مفید اور نافع خاص وعام ہے۔ لہٰذا اگر اس کا ترجمہ اردو زبان میں بھی ہو جائے تو اس کا نفع عام ہو جائے۔ چنانچہ نواب صاحب موصوفؒ نے اس وقت کی مروجہ زبان میں اس کا ترجمہ کیا ہے۔ جس کا تاریخی نام ہادی النّاظرین رکھا اور جابجا (فائدہ) کا عنوان قائم کرکے اس میں بعض ضروری مسائل کا اضافہ بھی فرمادیا۔ (چنانچہ میرے سامنے اس وقت یہی کتاب ہے)

کتاب ہٰذا میں چونکہ معیشت اور معاشرت کے آداب نیز مصاحبت اور مخالطت کے احکام کا بیان تھا اس لئے ہمارے حضرت مصلح الامت نور اللہ مرقدہ کو بھی یہ رسالہ بہت ہی پسند ہوا چنانچہ مجلس میں تھوڑا تھوڑا کرکے تقریباً سارا ہی رسالہ سنایا اور اس کے بعض مضامین کو تو تفصیل سے مکرر سہ کرر بیان فرماتے اور جو مقامات اہم ہوتے ان پر حاشیہ میں نشان بنادیتے تھے۔ اس کے متعلق متعدد بار راقم (مترجم) سے فرمایا کہ حضرت شیخ دہلویؒ کی یہ کتاب نہایت ہی عمدہ ہے اور مجھے بہت پسند ہے لیکن اردو اس کی پرانی ہے۔ اب اس زمانہ میں زبان بدل جانے کی وجہ سے اس کا سمجھنا آسان نہیں اس لئے اتنی عمدہ کتاب کے استفادہ سے لوگ محروم ہیں۔ میں اخلاق پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں اور لوگوں کو آداب دین سکھانا چاہتا ہوں تو اس کے لئے یہ ذخیرہ اچھا خاصا موجود ہے ضرورت صرف اس کی ہے کہ اس کی زبان بدل دی جائے اور اس کتاب کی اشاعت کی جائے اور اس کے مضامین لوگوں کو پہنچائے جائیں۔ لہٰذا تم اگر ہمت کرو تو یہ ایک کام ہو جائے اور امید ہے کہ مسلمانوں کو اس سے بہت نفع پہنچے۔

مگر افسوس ہے کہ مشاغل کثیرہ نے اس وقت مہلت ہی نہ دی کہ میں اس کام کو حضرت اقدس کے سامنے ہی انجام دیتا حضرتؒ کے وصال کے ایک سال بعد جب کچھ وقت ملا تو توکلاً علی اللہ اس رسالہ کا ترجمہ شروع کیا جو رسالہ ''معرفت حق'' میں قسط وار شائع ہوتا رہا اس کے بعد ۱۹۷۷ء

میں مستقلاً اس کی دوبارہ طباعت ہوئی ادھر عرصہ سے نایاب ہوچکا تھا احباب کو اس کا شدید اشتیاق تھا اس لئے محترم حضرت قاری محمد مبین صاحب مدظلہ العالی کے حکم سے اب "دائرۃ الاشاعت" خانقاہ "مصلح الامت" سے اس کی طباعت اور اشاعت ہو رہی ہے۔ ناظرین کرام سے درخواست ہے کہ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ سب سے پہلے اس عاصی کو آداب سے متأدب ہونے کی توفیق بخشے اور اس کا نفع عام و تام فرمائے۔ اور بمضمون ارشاد نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم الدال علی الخیر کفاعلہ (یعنی کسی کار خیر کی جانب رہنمائی کرنے والا بھی اجر میں مانند اس کام کے کرنے والے ہی کے ہوتا ہے) اللہ تعالیٰ اس کے بہترین اجر وثواب سے ہمارے حضرت کو نوازے اس لئے کہ حضرت اقدس برّد اللہ مضجعہ کی توجہ ہی اس کی محرک بنی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ ناظرین کرام صفحات معرفت میں ترصیع الجواہر کی جگہ اب سے اس کو ملاحظہ فرمائیں گے۔

اللہ تعالیٰ اس کتاب سے سب مسلمانوں کو عموماً اور وابستگان حضرت مرشدی رحمتہ اللہ علیہ کو خصوصاً بہرہ یاب فرمائے۔ اصل کتاب میں جس مضمون کو پسند فرما کر حضرت نے نشان لگایا تھا۔ ہم بھی ان مقامات کی نشاندہی اپنے اس رسالہ (اسوۃ الصالحین ترجمہ آداب الصالحین) میں حاشیہ پر ☆ اس طرح کے نشان سے کردیں گے اور ترجمہ کے ذیل میں کہیں کہیں بین القوسین جو اضافہ ہے وہ احقر مترجم کی جانب سے ہے وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب

راقم مترجم عبدالرحمٰن جامی عفی عنہ

مقدمہ از مؤلفؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خطبہ : ازل سے لیکر ابد تک جس تعریف کرنے والے نے بھی اپنی زبان سے جس کسی ممدوح کی تعریف اس کے حسن و کمال کی بناء یا اس کے کسی نعمت کے شکریہ میں کی ہو اور جس جس عنوان اور جن جن طریقوں سے کی ہو یا کرنا متصوّر ہو سکتا ہو وہ تمام تعریفیں اس ذات کے لئے ثابت ہیں جو تمام موجودات کا خالق اور تمام ہی مخلوقات کا رازق ہے اور جملہ صفات کملیہ کے ساتھ متصف ہے اور ہر قسم کے نقص و عیب کی آمیزش سے پاک اور فنا و زوال کے توہم سے بری ہے۔ جَلّ جلالہ' اس کی شان ہے۔ دائمی اس کا کمال ہے اور عام اس کی عطا و نوال ہے۔

اور ان تمام درودوں سے جو کہ از اول تا آخر جملہ انبیاء و مرسلین (صلوٰت اللہ علیہم اجمعین) پر ان کے اپنے زمانوں میں ان کے شان و حال کے مناسب حضرت صمدیت کی جانب سے نازل ہوئے ہیں اور حق تعالیٰ شانہ' نے انہیں پسند بھی فرمایا اور تمام مخلوقات پر اس کے حکم کو عام فرمایا ہے۔ (ان سب سے) افضل ترین درود (یعنی رحمت کاملہ) نازل ہو ان پر جو کہ افضل الانبیاء اور خاتم المرسلین ہیں۔ تمام مخلوقات کے حاصل اور خلاصہ ہیں اور تمام موجودات سے اشرف و اعلیٰ ہیں۔ صلی اللہ علیہ وسلم اور (آپ کے طفیل میں درود ہو) آپ کی تمام اولاد اور خدام پر۔ اور جملہ اصحاب پر اور ان تمام حضرات پر جو قیامت تک آپ کے طریقہ کا اتباع کرنے والے ہیں۔ آمین۔

سبب تالیف رسالہ : بعد (حمد و صلوٰۃ کے) جاننا چاہئے کہ آج سے چودہ برس پہلے یا کچھ کم و بیش ہوئے واللہ اعلم میرے دوستوں میں سے ایک صاحب نے جو کہ طلب کے درد اور محبت کے سوز سے خالی نہیں تھے اس فقیر سے یہ درخواست کی کہ تم اگر صحبت اور معیشت کے وہ تمام احکام اور ہم نشینی اور مخالطت کے وہ جملہ آداب جن سے ایک مسلمان کا آشنا ہونا ضروری ہے یکجا ترتیب وار جمع کردو تو امید ہے کہ اس سے مجھ جیسوں کو بھی نفع پہنچے اور آخرت میں وہ تمہارے لئے بھی باعث اجر ثواب بنے۔ میری توجہ چونکہ ان دونوں اور دوسرے علوم کے اکتساب کی جانب تھی اس لئے فرصت نہ ملی کہ میں اپنے اس دوست کی فرمائش پوری کرنے کے لئے کتابوں کی ورق گردانی کرتا اور مطلوبہ فوائد جمع کرتا۔ چنانچہ میں نے اپنی مجبوری کے پیش نظر اس وقت تو عذر کر دیا۔

لیکن ایک مدت کے بعد مجھے کتاب احیاء العلوم جو کہ عالم ربانی امام غزالیؒ کی تصنیف ہے کے مطالعہ کی توفیق ہوئی۔ اس وقت پھر مجھے اپنے اس محب کی فرمائش یاد آئی۔ چنانچہ کچھ مسائل احیاء العلوم کے ربع معاملات سے میں نے نقل کر کے اس مجموعہ میں جمع کر دیئے اور ایسے مسائل بہت

ہی کم ہیں جنہیں میں نے احیاء کے علاوہ دوسری کتب سے لئے ہیں۔ مگر افسوس کہ اس رسالہ کے مکمل ہونے سے پہلے ہی میرا وہ دوست جو کہ اس جمع و تالیف کا سبب و محرک اور طالب تھا' اس دار فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کر گیا۔ اللہ تعالیٰ اس کا انجام بخیر فرمائے اور اس کو صالحین کے زمرہ میں داخل فرمائے (اناللہ وانا الیہ راجعون)

پھر یہ خیال ہوا کہ اس باب میں کتابیں تو بے شمار ہیں۔ اور رسالوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ چنانچہ خود امام غزالی کی کتاب "کیمیائے سعادت" جو کہ احیاء العلوم کا گویا ترجمہ ہی ہے اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے کافی ووافی ہے (لہٰذا کسی جدید رسالہ کی کوئی ضرورت نہیں خاص کر جبکہ اس کا اصل طالب اور محرک بھی اب دنیا میں نہیں رہا) لیکن اس امید پر کہ میں نے اس کو جس محنت سے لکھا ہے اور اس کی تالیف میں اپنا جو وقت صرف کیا ہے انشاء اللہ تعالیٰ' اللہ تعالیٰ اس کو عبادت ہی شمار فرمادیں گے۔ اور بموجب فرمان اِنِّی لَآ اُضِیۡعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنۡکُمۡ (یعنی بلاشبہ میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کا عمل ضائع نہیں کرتا) اس کے بھی اجر کو ضائع نہیں فرمائیں گے۔ اس کی تکمیل ہی کو مناسب جانا۔ فقط

اس فقیر حقیر عاصی (مؤلف) کو عبدالحق ابن سیف الدین دہلوی کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس پر اور اس کے جملہ مشائخ پر اپنا فضل خاص اور رحم فرمائے اور اس کو نیز اس کے تمام اسلاف کو اپنی برکتوں سے نوازے اور مالا مال فرمائے۔ آمین۔

میں نے اس رسالہ کا نام آداب الصالحین رکھا ہے۔ اور یہ سات ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب میں چند فصلیں ہیں۔

۱۔ پہلا باب - کھانے پینے کے آداب کے بیان میں (اس میں پانچ فصلیں ہیں)

۲۔ دوسرا باب - نکاح وغیرہ کے آداب کے بیان میں (اس میں بھی پانچ فصلیں ہیں)

۳۔ تیسرا باب - مصاحبت (ہم نشینی) کے آداب کے بیان میں (اس میں چار فصلیں ہیں)

۴۔ چوتھا باب - عام مسلمانوں اور قرابت داروں کے حقوق کے بیان میں (اس میں دو فصلیں ہیں)

۵۔ پانچواں باب - گوشہ نشینی اور عزلت کے آداب کے بیان میں (اس میں تین فصلیں ہیں)

۶۔ چھٹا باب - سفر وغیرہ کے آداب کے بیان میں (اس میں دو فصلیں ہیں)

۷۔ ساتواں باب - امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے آداب کے بیان میں (اس میں سات فصلیں ہیں)

پہلا باب

(کھانے پینے کے آداب کے بیان میں)

جان لو کہ اہل عقل اور اہل دانش کے نزدیک مقصود اعلیٰ اور مطلوب اعلیٰ حق تعالیٰ شانہٗ کا دیدار اور ان کی رضا کا حصول ہے دار آخرت میں۔ اور (اس دنیا میں) اس کا طریقہ تحصیل علم و عمل ہے اور علم و عمل پر مواظبت اور دوام موقوف ہے صحت بدن پر۔ اور عادۃ اللہ یونہی جاری ہے کہ بدن کی صحت و سلامتی کا ذریعہ کھانا پینا ہے۔ (چونکہ طعام ذریعہ ہے حیواۃ کا) اس لئے بقدر حاجت خورد و نوش واجب ہے۔ یعنی نہ اتنا زیادہ کھاوے کہ حد سے گذر کر موجب نقصان ہو جاوے اور انسان ہو کر سرحد حیوان میں داخل ہو جاوے۔ اور نہ اتنا کم کھاوے کہ عبادت کی قوت بھی میسر نہ ہو سکے۔

نہ چنداں بخور کز دھانت بر آید　　　نہ چندانکہ از ضعف جانت بر آید

(یعنی نہ اس قدر زیادہ کھالو کہ منہ سے نکلنے لگے اور نہ اس قدر کم ہی کھاؤ کہ ضعف کی وجہ سے جان ہی نکل جائے)

پس چاہئے کہ کھانے پینے میں بلکہ تمام ہی کاموں سے مقصود اللہ تعالیٰ کی عبادت اور طاعت ہو نہ صرف نفسانی خواہش کا بجالانا۔

اسی لئے علماء نے فرمایا ہے کہ اَلْاَکْلُ مِنَ الدِّیْنِ یعنی کھانا بھی دین ہی کا کام ہے۔

(فائدہ) اس قدر کھانا فرض ہے جتنے میں کہ جان باقی رہے اور آدمی ہلاک نہ ہو جائے۔ چنانچہ اگر حلال کھانا پینا نہ ملے اور بھوک کی وجہ سے جان جانے کا اندیشہ ہو تو اس صورت میں بقدر سدّ رمق کھانا اور پینا فرض ہے۔

(ادب) اتنی مقدار کھانا مستحب ہے جتنے میں نماز کھڑا ہو کر پڑھ سکے اور روزہ رکھنا اس پر آسان ہو جائے۔ اور کتاب منتقٰے میں ہے کہ اس قدر کھانا فرض ہے کہ جو ہلاکت کو دفع کرے اور اس کے سبب نماز کھڑا ہو کر پڑھ سکے۔ اور زیادتی قوت کے لئے پیٹ بھر کر کھانا پینا مباح ہے۔ اور اس

سے زیادہ کھانا حرام ہے۔ اور زیادہ وہ کہلائے گا کہ کھانے والے کو غالب گمان یہ ہو کہ اس سے میرا معدہ فاسد ہو جائے گا (یعنی سوء ہضم وغیرہ کی تکلیف ہو جائے گی) پس اتنا کھانا پینا حرام ہے۔ مگر دو صورتوں میں پُری شکم سے زیادہ کھانے کی اجازت ہے۔ ایک تو یہ کہ اس نیت سے کھاوے کہ اس کی وجہ سے کل کے روزہ میں قوت رہے گی۔ دوسرے یہ کہ اس لئے زیادہ کھارہا ہے تاکہ اس کا مہمان شرم کی وجہ سے بھوکا نہ اٹھ جائے۔ ان جیسے وجوہ سے زیادہ کھالینا بھی حرام نہیں ہے۔

(ادب) قلتِ طعام کی ایسی ریاضت کہ عبادت ہی سے ضعیف ہو جائے۔ جائز نہیں ہے۔ اسی طرح سے بھوک کی ایسی حالت میں جس میں جان کا اندیشہ ہو اگر کوئی شخص مردار نہ کھائے اور مر جائے تو گنہگار ہوگا (اس لئے کہ یہ تقویٰ نہیں ہے کیونکہ حالت اضطرار میں مردار اس کے حق میں حرام ہی نہیں رہ جاتا۔ پس اس کو کھا کر جان نہ بچانا خودکشی کے مرادف ہے) بخلاف اس شخص کے جو کہ بیمار ہے اور اس نے دوا نہ کی اور مر گیا تو یہ گنہگار نہ ہوگا۔ (اس لئے کہ دوا سے شفا یقینی نہیں اس لئے شرعًا دوا کرنا واجب بھی نہیں ہے۔ پس ترک علاج گناہ نہیں اور کھانا کھانے سے بھوک کا دفع ہو جانا یقینی ہے اور جان کا بچانا فرض ہے۔ لہٰذا ترک طعام حالت اضطرار میں بھی معصیت ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم) یہ سب مسائل کتاب درمختار سے لکھے گئے ہیں۔

اب ہم کھانے کے آداب کو پانچ فصلوں میں بیان کرتے ہیں۔

فصل اول

(ان آداب کے بیان میں جو ہر شخص کے لئے ضروری ہیں اگرچہ وہ تنہا ہی کھائے)

(ادب) جان لو کہ سب سے پہلی چیز جو ہر انسان پر ضروری ہے وہ یہ کہ حلال طیب روزی کھائے اور مراد اس سے یہ ہے کہ وہ طعام اپنی ذات کے اعتبار سے حرام نہ ہو بلکہ شریعت کے موافق اور تقویٰ کے ساتھ حاصل کیا گیا ہو۔

(ادب) کھانا شروع کرنے سے پہلے اور ختم کرنے کے بعد ہاتھ دھوئے کہ یہ سنت بھی ہے اور صفائی کا بھی یہی تقاضا ہے۔ اور کھانا اس نیت سے کھانا کہ اس کے ذریعہ طاعت کی قوت حاصل ہوگی۔ عبادت ہے۔ چنانچہ ہاتھ دھونا یہاں بمنزلہ وضو کے ہے شاید اسی لئے حدیث شریف میں اس موقع پر وضو ہی کا لفظ بھی اختیار فرمایا گیا ہے۔ فرمایا پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ اَلْوُضُوْ یَنْفِی الْفَقْرِ قَبْلَ طَعَامٍ وَبَعْدَہٗ (احیا) یعنی کھانے سے پہلے اور بعد میں وضو کرلینا (یعنی ہاتھ دھونا) فقروفاقہ کو دور کرتا ہے۔ (ایک اور روایت میں آتا ہے کہ برکۃ الطعام الوضوء قبلہ والوضوء بعدہ یعنی کھانے سے قبل اور بعد میں ہاتھ دھولینے سے کھانے میں برکت ہوتی ہے (مجمع) حدیث میں وضو سے مراد ہاتھ کا دھونا ہے اور اگر کوئی نماز والا ہی وضو کرے تو بہتر ہی ہے۔

(فائدہ) ایک بزرگ فرماتے تھے کہ میرے اوپر تین سو روپیہ کا قرض تھا اور بوجہ مفلسی کے کوئی صورت اس کے ادائیگی کی سمجھ میں نہ آتی تھی کہ اتفاقاً ایک دن میں نے (ایک عالم کے) درس میں یہ سنا کہ جو شخص کھانا کھانے سے پہلے اور بعد میں سنت سمجھ کر ہاتھ دھولیا کرے تو اس کا ادنیٰ فائدہ یہ ہوگا کہ چند ہی دنوں میں اس کا قرضہ ادا ہو جائے گا چنانچہ میں نے یہ عمل شروع کردیا ابھی چند ہی روز کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل وعنایت سے میرے ذمہ ایک کوڑی بھی کسی کی باقی نہیں رہ گئی اور میں الحمدللہ ایک سنت نبوی پر عمل کی برکت سے بار دین سے سبکدوش ہو گیا۔ باقی مدار اس امر کا خلوص نیت اور اعتقاد صحیح پر ہے اور جس کو یہی حاصل نہیں تو کسی چیز سے اس کو نفع نہیں ہوگا۔ حتیٰ کہ بدون خلوص کے کلمہ پڑھنا بھی مناف نہیں۔ (انسان منافق کہلائے گا)

(ادب) بہتر یہ ہے کہ کھانا دسترخوان پر رکھ کر کھائے کہ سفرہ (کالفظ ہی) سفر آخرت اور توشہ آخرت کی یاد دلاتا ہے اور اگر سینی وغیرہ میں رکھ کر کھائیں تو وہ بھی حرام مکروہ نہیں بلکہ جائز ہے۔ مگر دسترخوان پر کھانا سنت کے مطابق ہے۔

(فائدہ) بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دسترخوان چمڑہ کا تھا۔ چنانچہ سُفرہ اصل میں چمڑے ہی کے دسترخوان کو کہتے ہیں۔

(ادب) کھانے کے لئے دو زانو یا اکڑو بیٹھے یا بائیں پیر پر بیٹھے اور داہنا پاؤں کھڑا رکھے۔ بہرحال جس ہیئت پر بھی بیٹھے، بہتر یہ ہے کہ آخیر تک اسی وضع پر بیٹھا رہے (مطلب یہ کہ بار بار نشست نہ بدلے کہ یہ ادب کے خلاف ہے۔ ضرورت اس سے مستثنیٰ ہے۔

(ادب) ٹیک اور تکیہ لگا کر کھانا نہ کھاوے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقۂ مبارکہ کے خلاف ہے۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ میں ایک بندہ اور غلام ہوں اسی طرح سے کھانا پسند کرتا ہوں۔ جیسے کوئی غلام کھایا کرتا ہے اور اسی طرح سے بیٹھتا ہوں جیسے غلام بیٹھا کرتے ہیں۔ یہی حکم پانی پینے کا بھی ہے کہ تکیہ لگا کر مکروہ ہے۔

(فائدہ) صاحب کتاب السفرا لسعادۃ نے فرمایا کہ تکیہ لگانے کی تین صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ اپنا کوئی پہلو سرٹیک دے۔ دوسرے یہ کے چار زانو بیٹھے۔ تیسرے یہ کہ ایک ہاتھ زمین پر ٹیک کر بیٹھے اور دوسرے ہاتھ سے کھائے یہ تینوں قسمیں منع ہیں انتہیٰ۔

اور بعض علماء نے ایک چوتھی قسم اور بیان فرمائی ہے وہ یہ کہ تکیہ دیوار یا اسی کے مانند کسی اور چیز سے پیٹھ لگا کر بیٹھے۔ اور سنت یہ ہے کہ کھانے میں ذرا جھک کر (تواضع کے ساتھ) اور کھانے کی جانب متوجہ ہو کر بیٹھے اکثر علماء نے تکیہ لگانے کی تفسیر یہ بیان فرمائی ہے کہ ایک جانب کو جھک کر اس کے بل بیٹھے اور یہ اس لئے مکروہ ہے کہ اس طرح سے کھانا پانی سب رگوں میں سہولت کے ساتھ نہیں پہنچتا اور ہضم کے لئے بھی مضر ہے۔ اسی لئے علامہ سیوطیؒ نے اپنی کتاب عمل الیوم والليلة میں لکھا ہے کہ تکیہ لگا کر نہ کھاوے اور نہ منہ کے بل گر کر کھائے اور نہ کھڑے ہو کر کھائے بلکہ یا تو دو زانو بیٹھ کر کھائے یا بصورت اقعاء بیٹھے یعنی سرین (چوتڑ کے بل) بیٹھے۔ اور دونوں گھٹنے کھڑے کر لے۔ جس طرح کہ کتا بیٹھتا ہے۔ اور یا دونوں پاؤں پر بیٹھے جسے اکڑو بیٹھنا کہتے ہیں۔ یا بائیں پیر پر بیٹھے اور داہنا زانو کھڑا کر لے شیخ عبدالحق دہلویؒ نے مشکوٰۃ کی شرح میں یہی لکھا ہے (اور ایک ادب یہ ہے کہ) کھانا پیٹ بھر کر نہ کھاوے کہ ایسا کھانا عبادت سے روک دیتا ہے (اور کسل پیدا کر دیتا ہے یعنی اس کے بعد سونے کو جی چاہتا ہے) بلکہ معدے کے تین حصے کرے۔ ایک کھانے کے لئے ایک پانی کے لئے اور ایک حصہ سانس کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ مبارک میں شکم سیر ہو کر کوئی مسلمان کھانا نہیں کھاتا تھا۔

گلستان میں شیخ سعدی نے ایک حکایت بیان کی ہے کہ کسی عجمی بادشاہ نے ایک حاذق طبیب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا۔ چنانچہ وہ ایک سال کامل عرب میں رہا مگر کوئی

مریض اس کے پاس علاج کے لئے نہ آیا۔ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لوگوں کی بے توجہی کی شکایت کی کہ مجھے یہاں آپ حضرات کی خدمت کے لئے بھیجا گیا ہے لیکن اتنی مدت گذری کوئی شخص میری جانب رجوع ہی نہیں ہوا آپؐ نے اس سے فرمایا کہ لوگوں کے عدم التفات کا سبب کچھ تم سے نفرت نہیں ہے بلکہ اس جماعت کا دستور یہ ہے کہ جب تک اشتہاء کامل نہیں ہوتی کھانا نہیں کھاتے اور جب کھاتے ہیں تو قدرے اشتہا باقی رہنے ہی پر اٹھ جاتے ہیں۔ یہ سن کر اس حکیم نے کہا کہ اچھا ان لوگوں کی صحت کا یہ راز ہے۔ پھر تو میری یہاں ضرورت ہی نہیں ہے یہ کہا سلام کیا اور اپنے وطن واپس چلا گیا۔

(اور اب ہمارا وہی حال ہو گیا ہے جیسا کہ ایک مسخرہ کہتا تھا کہ ہم اپنے معدے کے تینوں حصوں کو کھانے ہی سے بھریں گے۔ ایک ثلث تو اس کا حق ہی ہے دوسرا حصہ پانی کا ہے اس کو بھی کھانے ہی سے بھریں گے' رہا پانی تو وہ اپنی جگہ خود بنالے گا۔ اب رہا تیسرا حصہ جو سانس کا ہے تو ہم اس کو بھی کھانے ہی سے پر کریں گے اور سانس کی ہم کو پروا نہیں وہ آئے یا نہ آئے)

(فائدہ) مومن کی شان یہ ہے کہ صبر و قناعت اور زہد و ریاضت اختیار کرے اور قدر حاجت پر اکتفا کرے اور اپنے معدہ کو قدرے خالی ہی رکھے کہ یہ باعث نورانیت اور سبب صفائی باطن بنتا ہے۔ نیز شب بیداری کے لئے بھی معین ہے۔ روایت میں ہے کہ ایک فقیر حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کے پاس آیا اور کھانا کچھ مقدار میں زیادہ کھایا آپ نے فرمایا کہ اچھا اس کو میرے پاس نہ لانا۔ علماء نے اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ اس صفت میں میں اس سے مشابہت کفار کی ظاہر ہوئی اور جو کافروں کی مشابہت اختیار کریں اس کی صحبت سے اجتناب کرنا چاہئے۔

(ادب) بھوک سے کم ہی کھانا ہر زمانہ میں عقلاء۔ اہل ہمت اور ارباب باطن کے نزدیک محمود رہا ہے اور زیادہ کھانے کو ہمیشہ ناپسند کیا گیا ہے لیکن آدمی اتنا بھوکا بھی نہ رہے کہ بدن میں ضعف اور قویٰ میں اختلال پیدا ہو جانے کے سبب سے کسی کام ہی کا نہ رہے کہ یہ منع ہے اور حکمت کے خلاف ہے۔ شرح مشکوٰۃ میں ملا علی قاریؒ نے ایسا ہی لکھا ہے۔

(ایک ادب یہ ہے کہ) جو کھانا میسر آئے اور وقت پر موجود ہو اس کو کھالے عمدہ اور لذیذ کھانوں کے لئے تکلف نہ کرے۔ اگر کسی وقت روکھی روٹی ہی نصیب ہوئی ہو تو صبر و شکر کے ساتھ کھالے' دال سالن کا انتظار نہ کرے۔ اگر عین نماز کے وقت کھانا تیار ہوا تو وقت میں اگر وسعت ہو تو پہلے کھانے سے فارغ ہو جائے جبکہ یہ اندیشہ ہو کہ کھانا مؤخر کرنے میں ٹھنڈا اور بے لطف ہو جائے گا یا تلف ہو جائے گا یا بھوک بہت زور کی لگی ہو۔ (سبحان اللہ شریعت میں کس قدر رعایت ہے) اور کوشش اس امر کی کرے کہ بہت سے آدمی ایک ساتھ کھانا کھائیں کہ اس طرح سے کھانے میں برکت ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی تنہا کھانا نہیں نوش فرماتے تھے۔

(ایک ادب یہ ہے کہ) کھانا شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ کہے اور دوسرے لقمہ میں بسم اللہ الرحمٰن کہے اور تیسرے لقمہ میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہے اور اگر ہر لقمہ پر بسم اللہ کہے تو بہتر ہے۔ اور کھانا داہنے ہاتھ سے کھائے، حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک شخص تھا جس کا داہنا ہاتھ شل ہو کر بغل میں چمٹ گیا تھا ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے وہ بائیں ہاتھ سے کھا رہا تھا آپ نے فرمایا داہنے ہاتھ سے کھاؤ اس نے امتثال حکم کا ارادہ ہی کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس کا داہنا ہاتھ بالکل صحیح وسالم ہو گیا۔ (ادب) کھانے کی ابتداء اور اس کی انتہا نمک سے کرے۔ امیر المومنین حضرت علیؓ سے ایسا ہی منقول ہے۔ نوالہ چھوٹا لے اور چبانے میں مبالغہ کرے اور جب تک منہ کا لقمہ نگل نہ لے دوسرے نوالہ کے لئے ہاتھ نہ بڑھائے۔ کھانے میں عیب نہ لگائے اگر پسند نہ ہو نہ کھائے اور اگر کسی کی خاطر منظور ہو تو (باوجود پسند نہ ہونے کے) تھوڑا سا کھالے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی طریقہ تھا۔

(ادب) کھانا اپنے سامنے سے کھائے۔ رکابی کے بیچ سے نہ کھائے ہاں اگر میوہ (اور پھل) ہو تو جس طرف سے جی چاہے کھائے۔ روٹی کو چھری سے نہ کاٹے۔ اور پکے ہوئے گوشت کو چھری سے کاٹنے کی ممانعت بھی آئی ہے اور اجازت بھی وارد ہے بہتر یہ ہے کہ ہاتھ ہی سے نوچ کر کھائے۔

(فائدہ) گوشت کو چھری سے کاٹنے کے متعلق اجازت اور ممانعت دونوں قسم کی روایتیں جو آئی ہیں تو علماء نے ان میں تطبیق یوں دی ہے کہ منع بصورت عدم حاجت کے ہے اور اجازت بوقت ضرورت کے ہے۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس موقع پر چھری استعمال فرمائی وہ گوشت سخت تھا، بدون چھری کے اس کے ٹکڑے کرنے دشوار تھے اور اگر گوشت گلا ہوا ہو اور ہاتھ سے کھلیا جا سکتا ہو اس وقت چھری سے کاٹ کر کھانے میں چونکہ بعض کفار کی مشابہت ہے اس لئے مکروہ ہے۔

(ادب) کھانے کو عظمت اور احترام کے ساتھ رکھے اور جلد ٹھنڈا کرنے کے لئے اس میں پھونک نہ مارے کہ اس سے بے صبری معلوم ہوتی ہے۔ بلکہ صبر کرے ـــــــ

۱؎ اگر ہر لقمہ پر بسم اللہ کہے الخ حافظ ضامن صاحب کا ایک مقولہ ہے جس کو حضرت گنگوہیؒ نے بے حد پسند کیا ہے وہ یہ کہ ذکر ہوا کہ بعض بزرگوں کا قول ہے کھانا کھانے میں ہر لقمہ پر بسم اللہ کہے۔ اس پر حافظ صاحب فرماتے ہیں کہ ہمیں تو طریقہ سنت زیادہ پسند ہے کہ اول میں ایک دفعہ بسم اللہ کہہ لی اور آخیر میں الحمد للہ اس سے زیادہ ثابت نہیں (حسن العزیز خورد ص ۵۴ ج ۳)

یہاں تک کہ ٹھنڈا ہو جائے تب کھائے۔

(ادب) میوہ میں سے طاق اٹھاوے یعنی تین یا پانچ یا کم و بیش یا جتنا بھی ایک دفعہ ہاتھ میں آجائے (غرض جیسا موقع ہو) اور کھجوروں کے ساتھ (اسی برتن میں) گٹھلیاں نہ جمع کرے اور نہ ہاتھ میں جمع کرے (اور نہ انگلیوں کے ذریعہ منہ سے نکالے) بلکہ منہ میں سے اپنی ہتھیلی پر لیکر زمین پر پھینک دے۔

(ادب) درمیان کھانے کے زیادہ پانی نہ پیئے۔ہاں اگر پیاس ہی زور کی لگی ہو یا لقمہ گلے میں اٹک جائے تو اس کے لئے بقدر ضرورت پانی پی لے کہ یہ معدہ کے لئے نافع ہے۔اور پانی پیتے وقت گلاس وغیرہ کو داہنے ہاتھ میں لے اور بسم اللہ کہہ کر ٹھہر ٹھہر کر پانی پیئے۔اور پانی لیٹ کر نہ پیئے۔ اور بہتر تو یہی ہے کہ کھڑے ہو کر بھی نہ پیئے لیکن اگر کبھی پی لیا تو خیر کچھ حرج بھی نہیں ہے۔روایت میں ایسا بھی آیا ہے۔

(فائدہ) کھڑے ہو کر پانی پینا خلفائے اربعہؓ سے ثابت ہے اور حدیثوں میں اس کی ممانعت جو آئی ہے وہ نہی تنزیہی ہے اور بعض طبیّ ضرر کے پیش نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شفقتہً اس سے منع فرمایا ہے زمزم کا پانی اور وضو کے بعد کا بچا ہوا پانی کھڑے ہو کر پیئے۔پانی پینے سے پہلے پانی کو دیکھ لے کچھ پڑا نہ ہو۔بسم اللہ کہہ کر پیئے اور ختم پر الحمد للہ کہے اور تین سانس میں پانی پیئے۔ (فائدہ) بہتر یہ ہے کہ پانی پینے میں ہر سانس کی ابتدا بسم اللہ سے کرے اور ختم پر الحمد للہ کہے۔ اور احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ پہلی سانس میں الحمد للہ کہے اور دوسری میں الحمد للہ رب العالمین اور تیسری میں الحمد للہ رب العالمین الرحمٰن کہے اور بعد فراغت کے اللہ تعالیٰ کا شکرا دا کرے کیونکہ پانی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخر میں یہ دعا پڑھتے تھے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ جَعَلَهٗ عَذْبًا فُرَاتًا بِرَحْمَتِهٖ وَلَمْ يَجْعَلْهُ مِلْحًا اُجَاجًا بِذُنُوْبِنَا

یعنی تمام تعریفیں اس اللہ تعالیٰ کے لئے نہیں کہ جس نے اس پانی کو اپنی رحمت سے شیریں اور مزیدار بنایا۔اور ہمارے گناہوں کے سبب اس کو نمکین اور شور نہیں کیا۔ ؎

(ادب) اگر مجلس میں پانی کا (یا کسی پینے کی چیز کا) دور چلے تو داہنی جانب سے اس کی ابتداء ہونی چاہیئے۔منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار دودھ نوش فرما رہے تھے۔حضرت

؎ انگلیوں میں اگر کھانا لگا ہے تو اس کو چاٹ لے محض برتن کے آلودہ ہونے کے خیال سے بائیں ہاتھ سے پانی پینے کا طریقہ صحیح نہیں ہے۔برتن تو دھل جائے گا مگر ترک سنت کے دھبہ کا کوئی صابن نہیں۔۱۲ مترجم

ابوبکر صدیقؓ بائیں جانب تھے اور داہنی جانب ایک اعرابی (بدّو) تھا اور اس کے بازو میں حضرت عمرؓ تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دودھ نوش فرمایا اور اس کے بعد اس اعرابی کو دیدیا اور فرمایا الایمن فالایمن یعنی پہلے داہنی جانب والے کا حق ہے اس کے بعد جو اس کے داہنے جانب ہو

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد انگلیوں کو چاٹ لے اور رکابی پلیٹ وغیرہ بھی خوب اچھی طرح سے صاف کرے۔ اور دستر خوان پر گرے ہوئے ریزوں کو بھی چن کر کھاجائے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ ان کے کھانے میں برکت ہے۔(ادب) بچے ہوئے ٹکڑوں کو سالن کی رکابی میں نہ ڈالے (کہ اس سے دوسرے کھانے والوں کو تکلف ہوگا) خلال کرے اور خلال کرنے سے جو ٹکڑے خلال کے ساتھ نکلیں ان کو پھینک دے اور جو ریزے زبان کے ذریعہ دانتوں سے نکلے ہوں ان کو نگل جائے۔ پھر خلال کے بعد خوب اچھی طرح سے کلّی کرے۔ اور اگر مٹی (یا صابن) وغیرہ سے بھی ہاتھ دھوئے تو جائز ہے (اگر ہو سکے تو) دانت زبان اور تالو وغیرہ کو منجن سے صاف کرے اور لب بھی دھوئے اور اگر ہاتھ منہ کو رومال سے پوچھے تو جائز ہے بشرطیکہ نیت تکبر نہ ہو بلکہ صرف صفائی مقصود ہو۔ اسی طرح سے وضو کے بعد بھی عضو کو کپڑے سے پوچھنے میں علماء سے اختلاف منقول ہے۔ بعض حضرات اپنے دامن سے پونچھتے تھے اور بعض رومال سے اور مدار نیت پر ہے (یعنی پونچھنے کی گنجائش ہے لیکن اس میں بہت زیادہ مبالغہ نہ کرے)

(ادب) اور سب کھانے سے فارغ ہو کر شکر ادا کرے اور یہ دعا پڑھے :
اَلْحَمْدُلِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ + یعنی سب تعریفیں اس اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے ہم کو کھلایا پلایا اور مومنین کے زمرہ میں سے ہم کو بنایا (اور بعض روایتوں میں یہ دعا یوں آئی ہے : اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَ سَقَانَا وَ جَعَلَنَا مُسْلِمِیْنَ + یعنی من کا لفظ نہیں ہے اور مومنین کی جگہ مسلمین کا لفظ ہے اور یہی مشہور ہے واللہ اعلم

اور سورۂ فاتحہ اور سورۂ لایلاف پڑھے اور وہ دعائیں مانگے جن میں شکر نعمت کا مضمون ہے۔
(کذا قال الغزالیؒ)



فصل دوم

(ان آداب کے بیان میں جو جماعت کے ساتھ کھانے میں بجالائے جائیں)

(ادب) اگر مجمع میں اہل فضل یا بڑی عمر کے لوگ ہوں تو ان سے پہلے کھانا شروع نہ کرے بلکہ

شروع کرنے کے وہی لوگ مستحق ہیں۔ ہاں اگر یہ شخص قوم کا سردار یا پیشوا ہو تو پہلے خود شروع کردے تاکہ دوسرے حاضرین منتظر نہ رہیں۔

(ادب) کھانا کھاتے وقت بالکل خاموش نہ رہے کہ یہ عجمیوں کا طریقہ ہے لیکن بہت زیادہ (بیکار اور لغو) باتیں بھی نہ کرے بلکہ اچھے لوگوں کی عمدہ باتیں کرتا رہے اور اپنے رفیق کے ساتھ نرمی اور مہربانی رکھے اور ایسے طریقہ سے زیادہ کھانے کا قصد نہ کرے جو کہ ساتھیوں کو ناپسند ہو کیونکہ مشترکہ کھانے میں ایسا کرنا حرام ہے اور دو کھجوریں ایک ساتھ نہ کھائے اور ہاتھ میں بھی دو کو اکٹھا نہ رکھے مگر یہ کہ سب لوگ اسی طرح سے کھا رہے ہوں یا صاحب خانہ (مالک کی) جانب سے اس کی اجازت ہو۔ تو خیر یہ بھی کر سکتا ہے۔

(ادب) اور اگر کسی مہمان کے ساتھ کھانے کا اتفاق ہو تو اس کو کھانے میں رغبت دلائے (مثلاً یہ کہ سالن لیجئے بہت لذیذ ہے یا یہ روٹی کھائیے دیکھئے گرم ہے) اور نہایت نرمی اور لجاجت سے کہے۔ باقی اگر اس کو رغبت نہ ہو تو تین بار سے زائد اصرار بھی نہ کرے کہ یہ حد سے تجاوز ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے مواقع پر تکرار تین ہی بار تک کا ثابت ہے اس لئے اس سے زیادہ اصرار کرنا خلاف ادب شمار ہوگا۔

(ادب) اور کسی کو کھانے کے لئے قسم نہ دے کہ یہ بھی خلاف ادب ہے۔ اور مہمانوں کو بھی چاہئے کہ تکلف سے کام نہ لیں یعنی صاحب خانہ کو اصرار کا موقع ہی نہ دیں بلکہ کھانوں میں سے جو اچھا لگے بلا تکلف استعمال کریں لوگوں کے دیکھنے کے خیال سے ترک نہ کریں کیونکہ اسی کا نام تکلف ہے۔

(ادب) اپنی عادت کے مطابق کھاوے محض دوسروں کی رعایت سے کم نہ کھاوے۔ یہ الگ بات ہے کہ یوں اپنی عادت ہی شروع سے کم کھانے کی ڈالے اور تمام آداب کی مشق رکھے تاکہ مجمع کے ساتھ کھانے میں تکلیف کی نوبت ہی نہ آئے۔ ہاں اگر ایثار کے خیال سے کم کھاوے تو کیا کہنا۔ اور ایثار کہتے ہیں دوسروں کی حاجت کو اپنی حاجت پر مقدم کرنے کو۔ (یہ ایک عمدہ خصلت ہے)

(ادب) اگر صاحب خانہ (مہمانوں کے) نشاط اور رغبت کے خیال سے اپنی عادت سے کچھ زیادہ کھالے تو کچھ مضائقہ نہیں ہے بلکہ ایسا کرنا مستحب ہے۔ مروی ہے کہ حضرت عبداللہ بن المبارکؒ جب مہمانوں کے آگے کھجوریں لا کر رکھتے (اور لوگ کھالیتے) تو آخر میں مزید رغبت دلانے کے لئے فرماتے کہ اچھا اب جو شخص اور کھائے گا تو میں ہر کھجور کے بدلہ میں ایک درہم پیش کرونگا۔ اور حضرت جعفر بن محمدؒ فرماتے تھے کہ میرے دوستوں میں سے سب سے زیادہ محبوب مجھے وہ دوست ہے جو زیادہ کھائے اور بڑے بڑے لقمے اٹھائے (کیونکہ اس سے بے تکلفی ٹپکتی ہے) اور

مجھ پر وہ دوست گراں بار ہے جو کھانے میں میرے کہنے کا انتظار کرے۔ حضرت کا مقصد اس سے بے تکلف بنانا اور بے تکلفی کو پسند کرنا تھا۔

(ادب) کھانے کے لئے ہاتھ طشت پر سلپچی میں دھونا مکروہ نہیں۔ ہاں دھلانے میں (بھی ترتیب کا لحاظ رکھیں یعنی) پہلے عالم کا ہاتھ دھلائیں۔ اور لوگ بھی اگر عالم کی تعظیم کریں تو اس کو قبول کرلینا چاہیئے اس کے خلاف پر اصرار اور اس سے انکار نہ کرے کہ یہ بھی تکلف ہے۔

مروی ہے کہ حضرت انس بن مالکؓ اور حضرت ثابت بنانیؒ کسی مجلس میں جمع تھے، حضرت انس نے (ہاتھ دھونے کے لئے) طشت پہلے حضرت ثابتؒ کے آگے بھیجا۔ انہوں نے انکار کیا اس پر حضرت انسؓ نے فرمایا کہ اگر کوئی بھائی مسلمان آپ کی تعظیم کر رہا ہے تو اس کو قبول کرنا چاہیئے اور اس کو خدا تعالیٰ کی جانب سے سمجھنا چاہیئے۔

(ادب) اور اگر سب کے سب لوگ ایک ساتھ ہی ہاتھ دھوئیں تو کچھ حرج نہیں بلکہ تواضع سے قریب اور انتظار سے بعید ہونے کے سبب محمود ہے۔ اگر طشت میں ہاتھ دھلانے کی نوبت آئے تو مجلس میں داہنی جانب سے شروع کریں اور ایک ایک آدمی کا غسالہ (دھوون) الگ الگ نہ پھینکیں کہ یہ عجمیوں کا طریقہ ہے بلکہ طشت ہی میں پانی جمع کرتے جائیں جب وہ بھر جائے تو اس کو گرادیں۔

(ادب) خادم جو کہ ہاتھ دھلا رہا ہے بعض علماً فرماتے ہیں کہ وہ بیٹھ کر ہاتھ دھلائے کہ تواضع کے مناسب یہی ہے لیکن مختار قول یہ ہے کہ کھڑے ہو کر ہاتھ دھلائے کیونکہ اس میں آسانی ہے پانی ڈالنے میں بھی اور ہاتھ دھونے میں بھی۔ اور کوئی شخص اپنی خوشی سے حسن نیت کے ساتھ خدمت کرنا چاہتا ہے (مثلاً ہاتھ ہی دھلانا چاہتا ہے) تو اس کو خدمت کا موقع دے خوامخواہ کے لئے تکلف نہ کرے اور یہ تکبر نہیں ہے سلپچی یا طشت میں تھوکتے اور کلی کرتے وقت لوگوں کا اور فرش کا خیال رکھے کہ اس پر نہ پڑ جائے۔ (تیز آواز وغیرہ بھی زیادہ نہ ہو) اور اگر اکیلا ہے تو تھوکنے کھنکھارنے میں جتنا چاہے مبالغہ کرے۔ بہتر ہے کہ خود صاحب خانہ ہی مہمانوں کے ہاتھ دھلائے کیونکہ اسی طرح سے کیا تھا امام مالکؒ نے امام شافعیؒ سے پہلی ملاقات میں۔ اور یہ فرمایا کہ مہمان کی خدمت فرض ہے۔ کھانا کھاتے وقت ساتھیوں کی جانب نہ دیکھے۔ اور ان کا نوالہ نہ گنے بلکہ انکی جانب سے چشم پوشی کرے اور اپنے کھانے میں مشغول رہے۔

(ادب) اور احباب کے فارغ ہونے سے پہلے کھانے سے ہاتھ نہ کھینچے جبکہ یہ خیال ہو کہ ہمارے رک جانے سے وہ بھی رک جائیں گے۔ بلکہ چاہیئے کہ فارغ ہو جانے کے باوجود (ان کی رعایت سے) تھوڑا تھوڑا کھاتا رہے۔ اور اگر کم خوراک ہے تو اس امر کا لحاظ شروع ہی سے رکھے (یعنی

آہستہ آہستہ کھائے) تاکہ سب کے ساتھ کھانا ختم ہو۔ اور اگر کسی عذر کے سبب کم کھانے کی نوبت آگئی ہو (مثلاً بھوک نہ ہو یا مرچ وغیرہ زیادہ ہو) تو اپنا عذر ظاہر کردے تاکہ دوسروں کو شرمندگی نہ ہو۔ اسی طرح سے کھاتے وقت کوئی ایسا کام نہ کرے یا ایسی بات نہ کہے کہ لوگوں کو ناگوار ہو اور وقت کے مناسب نہ ہو۔

(ادب) اپنے ہاتھ کو رکابی میں نہ جھاڑے۔ اور نوالہ منہ میں رکھتے وقت سر کو اونچا نہ کرے۔ اسی طرح سے منہ سے کوئی چیز نکال کر رکابی میں نہ ڈالے۔ اور اگر ایسی ضرورت ہی آپڑے (مثلاً بال یا کنکری آگئی) تو بائیں جانب منہ کرکے پھینک دے۔ (ادب) نوالہ کو شوربے میں بہت زیادہ نہ ڈبوئے اور اگر لقمہ میں سے کچھ دانتوں سے ٹوٹ کر رہ گیا ہو تو اب اس کو دوبارہ سالن میں نہ ڈالے۔ شوربا یا کوئی چکنی چیز کا نوالہ سرکہ میں نہ ڈالے اور سرکہ کا لقمہ شوربے اور اس چکنی چیز میں نہ ڈبوئے غرض کہ بھائی مسلمانوں کا لحاظ کرے اور ہر حال میں باادب رہنے کی کوشش کرے۔

فصل سوم

(ملاقات کے لئے جو احباب آویں ان کے سامنے اشیاءِ خوردنی پیش کرنے کے آداب میں)

جاننا چاہئے کہ جس طرح سے نماز باجماعت کی بہت فضیلت آئی ہے اسی طرح سے مسلمان بھائیوں کے باہم ملکر کھانا کھانے میں بہت اجر وثواب ہے۔ اسباب میں بہت سی احادیث میں ہے کہ اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ طعام کی مجلس میں جو وقت (عمر گذرے قیامت کے دن اس کا حساب نہیں لیا جاویگا۔ اسی لئے اسلاف ایسی مجلسوں میں دیر دیر تک بیٹھتے تھے۔ اس طرح سے کھانے کا بھی حساب نہیں ہوگا جو احباب کے ساتھ ملکر کھایا جانے چنانچہ بعض علماء کا یہ طریقہ ہی تھا کہ وہ لوگوں کے ساتھ ہی کھاتے تھے اور کھانا اپنے یہاں سے زیادہ لاتے تھے۔ اور اگر تنہا کھانے کا اتفاق ہوتا تھا تو کھانا کم منگاتے تھے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ تین کھانے ایسے ہیں جن کا حساب نہ ہوگا۔ ایک وہ جو افطار کے وقت کھایا جائے۔ ایک وہ جو سحر کے وقت کھاوے۔ ایک وہ جو مسلمان بھائیوں کے ساتھ بیٹھ کر کھاوے حضرات صحابہؓ جب کہیں جمع ہو جاتے تو بغیر ماحضر کے کھائے ہوئے وہاں سے اٹھتے نہ تھے اور اس طرح سے باہم کھانا کھلانے کو خُلق "حسن" شمار فرماتے تھے۔ بعض علماء نے فرمایا ہے کہ احباب کا انس ومحبت کے ساتھ باہم جمع ہونا دنیا ومافیہا سے بھی بڑھ کر ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ جنت میں ایسے بالاخانے ہیں کہ ان کی صفائی اور شفافی کی وجہ سے اندر کا رخ باہر سے اور باہر کا حصہ

اندر سے نظر آتا ہے اور یہ ان لوگوں کو ملیں گے جو بات نرمی سے کرتے تھے اور لوگوں کو کھانا کھلاتے تھے اور رات کو جس وقت کہ سب لوگ سوتے ہوتے تھے اٹھ کر نماز پڑھتے تھے۔

اور لوگوں کے یہاں محض کھانے ہی کے لئے جانا اور ان کے کھانے کا منتظر ہونا یا اچانک کسی کے دستر خوان پر پہنچ جانا یہ سب خلاف سنت ہے۔ قرآن شریف میں اس سے منع کیا گیا ہے۔

(فائدہ) یعنی قرآن شریف میں یہ جو آیت آئی ہے کہ یَآاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتَ النَّبِیِّ اِلَّآ اَنْ یُّؤْذَنَ لَکُمْ اِلٰی طَعَامٍ غَیْرَ نٰظِرِیْنَ اِنٰهُ وَلٰکِنْ اِذَا دُعِیْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَاْنِسِیْنَ لِحَدِیْثٍ۔ط اِنَّ ذٰلِکُمْ کَانَ یُؤْذِی النَّبِیَّ فَیَسْتَحْیٖ مِنْکُمْ وَاللّٰهُ لَا یَسْتَحْیٖ مِنَ الْحَقِّ یعنی اے ایمان والو نبی کے گھروں میں بغیر بلائے مت جایا کرو مگر جس وقت تم کو کھانے کے لئے اجازت دیدی جائے ایسے طور پر کہ اس کی تیاری کے منتظر نہ ہو لیکن جب تم کو بلایا جاوے کہ کھانا تیار ہے تب جایا کرو پھر جب کھانا کھا چکو تو اٹھ کر چلے جایا کرو اور باتوں میں جی لگا کر مت بیٹھے رہا کرو۔ اس بات سے نبی کو ناگواری ہوتی ہے سو وہ تمہارا لحاظ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ صاف صاف بات کرنے سے کسی کا لحاظ نہیں کرتا۔

اس آیت میں انہیں مذکورہ امور کی ممانعت ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ ام المومنین حضرت زینبؓ کے نکاح کے موقع پر لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں جمع ہوئے (جگہ تنگ تھی) حضرت زینبؓ دیوار کی جانب منہ کئے ہوئے بیٹھی تھیں اور کچھ لوگ طعام ولیمہ سے فارغ ہونے کے بعد بھی بیٹھے رہ گئے (باتیں کرنے لگے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بوجہ شرم ولحاظ کے ان سے یہ نہ فرمایا کہ بس اب جاؤ اس وقت (پردہ نیز آداب دعوت کے سلسلہ میں) یہ آیت نازل ہوئی۔ (کذافی بحر العلوم)

حدیث شریف میں اس شخص کو فاسق فرمایا ہے جو بلا بلائے ہوئے کھانے پر آجائے۔ اور یہ کھانا اس کے لئے حرام ہے۔ اور اگر بدون بلائے ہوئے اتفاق سے پہنچ جائے تب بھی جب تک صاحب خانہ اجازت نہ دے کھانا نہ کھاوے۔

(ادب) کھانے کے لئے اگر کوئی شخص بلائے تو یہ دیکھے کہ رغبت و محبت سے بلا رہا ہے یا محض شرما حضوری سے اور مجبور ہو کر۔ اول صورت ہو تو شریک ہو جائے اور دوسری ہو تو نہ جائے اور کوئی عذر کر دے۔ اور اگر بھوکا ہے اور اپنے کسی دوست کے یہاں بدون بلائے چلا جائے تو کچھ حرج نہیں ہے۔ ایسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ سے منقول ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات شیخین کا ابو الہیثمؓ کے گھر جانے کا قصہ مشہور ہی ہے۔

(فائدہ) وہ واقعہ یہ ہے کہ ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں ایک دن (یا ایک رات) رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم گھر سے باہر تشریف لائے۔ اچانک حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ سے ملاقات ہوگئی۔ فرمایا کہ خلاف معمول اس وقت اپنے گھروں سے تم دونوں کیسے نکلے؟ ان دونوں حضرات نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ بڑی زوروں کی بھوک لگی ہوئی ہے۔ فرمایا قسم ہے اس ذات کی کہ میری جان جس کے قبضہ میں ہے میرے نکلنے کا باعث بھی وہی امر ہے جو تم دونوں کے نکلنے کا ہے (یعنی بھوک ہی کی شدت) اس کے بعد وہ دونوں حضرات بھی آپ کے ہمراہ ہوگئے اور آپ ایک انصاری صحابی جن کا نام ابو الہیثم تھا ان کے مکان پر تشریف لائے اتفاقاً وہ اس وقت گھر میں موجود نہ تھے انکی اہلیہ نے آپ کو دیکھ کر مرحبا اہلاً و سہلاً کہا (عرب میں یہ کلمات کسی آنے والے کے لئے غایت مسرت میں بولے جاتے ہیں مطلب یہ ہوتا ہے کہ آیئے آپ گویا فراخ مکان میں اور اپنے ہی بال بچوں میں آئے اور نرم زمین آپ نے طے کی جس طرح ہمارے یہاں کہتے ہیں کہ آیئے آیئے تشریف لایئے یہ آپ ہی کا گھر ہے اور یہ سب آپ ہی کے بچے ہیں مقصد یہ ہوتا ہے کہ بلا تکلف رہیئے جس طرح اپنے گھر میں رہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ صاحب خانہ کہاں ہیں؟ انہوں نے کہا یا رسول اللہ وہ ہمارے لئے میٹھا پانی لینے گئے ہیں۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اتنے میں وہ انصاری صحابی آگئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے دونوں صحابی (حضرت صدیقؓ اور حضرت عمرؓ) کو اپنے یہاں دیکھ کر کہا الحمدللہ آج میرے برابر اور مجھ جیسا نصیبے والا کوئی شخص روئے زمین پر نہیں ہوگا کہ جس کے گھر ایسی بزرگ ہستیاں مہمان ہوئی ہیں۔

وہ آج آئے میرے گھر خدا کی رحمت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

راوی کہتے ہیں کہ اس کے بعد وہ انصاری گئے اور کھجوروں کا ایک خوشہ لے آئے جن میں نیم پختہ (گدری) کھجوریں بھی تھی اور بعض خشک ہوگئی تھیں بقیہ تروشاداب تھیں۔ اس کو پیش کر کے عرض کیا حضورؐ جب تک اس کو نوش فرمائیں اور خود چھری لیکر بکری ذبح کرنے کے لئے جانے لگے۔ آپ نے فرمایا کہ دیکھو بھائی دودھ والا جانور مت ذبح کرنا۔ چنانچہ وہ ایک بکری ذبح کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفقاء کے لئے لائے گوشت بھونا گیا اور سب حضرات نے اس کو نوش فرمایا کھجوریں بھی کھائیں۔ اور شیریں پانی پیا۔ جب کھا پی کر شکم سیر ہوگئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں حضرات کو مخاطب کر کے فرمایا کہ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ یعنی اس ذات پاک کی قسم ہے جس کے قبضہ میں مری جان ہے تم سے بلاشبہ ان نعمتوں کے (ادائے شکر کے) متعلق قیامت میں پوچھا جائیگا۔

اب دیکھو تم لوگ گھر سے کس حال میں نکلے تھے کہ بھوک سے پریشان تھے اور یہاں اللہ تعالیٰ نے کیسی کیسی نعمتوں سے نوازا۔ کیا اس کا شکر واجب نہیں ہے؟ رواہ مسلم

(فائدہ) اس حدیث سے کئی باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک تو یہ کہ حضرت صدیقؓ نے یہ جو فرمایا کہ یا رسول اللہ ہم کو بھوک نے گھر سے نکالا ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ اپنے رنج و غم اور شدت اور پریشانی کو اپنے مخلص دوست سے ظاہر کر دینا جائز ہے۔ بشرطیکہ بطریق شکوہ اور جزع اور عدم رضا کے نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ جب بھوک ایسی زور سے لگی ہو کہ نشاط عبادت اور اس کا کمال تلذذ ہی باقی نہ رہے اور باعث مشغولیٔ قلب ہو جائے تو باہر نکلنا اور اس کے دور کرنے کی تدبیر کرنا جس کسی اسباب مباحہ سے بھی ہو سکے اسکے لئے کوشش کرنا جائز ہی نہیں بلکہ لازم ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ ایسے وقتوں پر مخلص دوستوں کے یہاں جانا اور ان سے کھانا طلب کرنا مباح ہے بلکہ سبب ازدیادِ محبت ہے۔ بشرطیکہ یہ یقین ہو کہ وہ بے تکلف قبول کر لے گا اور فرمائش کو رد نہ کرے گا۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضرات صحابہؓ جب بھوکے ہوتے تو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ اور آپ کے رخ انور کے جمال با کمال کو دیکھتے ہی دیکھتے بھوک کی سب تکلیف ختم ہو جاتی تھی اور شہود کی نورانیت سے سیر ہو جاتے تھے۔ اور ان انصاری صحابی نے حضور کو دیکھ کر الحمدللہ جو کہا تو اس سے معلوم ہوا کہ نعمت کے ظہور کے وقت شکر کرنا مستحب ہے۔ نیز مہمان کے روبرو (اس کے آنیکی) خوشی کا اظہار بھی کر دینا مستحب ہے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کھانے سے پہلے میوہ (اور پھل وغیرہ) مہمان کے آگے رکھ دینا بہتر اور مستحسن ہے۔ نیز یہ کہ جو چیز جلد میسر ہو جائے (یعنی ماحضر) پہلے اس کو مہمان کے آگے پیش کر دے۔ پھر کھانے وغیرہ کا انتظام کرے (ہمارے یہاں اس کی قائم مقامی ایک گلاس شربت یا ایک پیالی چائے بھی کر سکتی ہے)

اور یہ جو کہا کہ کھانے پینے سے سیراب ہوئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں پیٹ بھر کر بھی کھانا جائز تھا اور یہ جائز ہے باقی اس کی کراہیت میں جو وارد ہے وہ اس پر محمول ہے کہ عادت اور مداومت کے طور پر ایسا کیا جائے کیونکہ ایسا کرنے سے غرباء اور فقراء کی تکلیف کا احساس نہ ہو گا اور یہ انسان کے لئے موجب قساوت بنے گا۔ اور یہ جو فرمایا کہ تم قیامت کے دن ان نعمتوں کے بارے میں پوچھے جاؤ گے؟ یہ سوال بعضوں کے حق میں تو بطور توبیخ اور سرزنش کے ہو گا۔ اور بعضوں سے برائے امتنان اور بغرض اظہار نعمت و کرامت کے ہو گا۔ بہرحال ہر نعمت کا سوال اور پرسش ہو گی اس کا شکر ادا کر کے اسکا حق ادا کیا یا نہیں۔ نسئال اللہ العافیہ (اللہ تعالیٰ ہمارا انجام بخیر فرمائے)۔

مسلمانوں کو چاہیئے کہ اس حدیث میں غور کریں اور دیکھیں کہ ہمارے پیشوا کا کیا حال تھا وہ حضرات کس طرح فقر اختیار فرمائے ہوئے تھے اور اس پر کیسے صابر تھے۔ اگر ہم لوگوں کا یہ حال ہو جائے تو کیسی ناشکری کریں۔ کھانا نہ ملنا تو بڑی بات ہے اگر کوئی معمولی سی ضرورت کی چیز وقت پر

جب نہیں ملتی تو کیسا گھبرا جاتے ہیں اور شکوہ وشکایت شروع کر دیتے ہیں۔ جو حال حضرات صحابہ کا تھا یہی پہلے کے سب بزرگوں کا تھا اور بعض بزرگوں کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے احباب کے گھر برابر آتے جاتے تھے اور یہی ان کا کسب وکفایت تھا۔ یعنی اسی پر اکتفاء کرتے تھے کوئی اور ذریعہ معاش نہیں اختیار کئے ہوئے تھے اور مقصد ان کا یہ تھا کہ (لوگوں کے پاس مال بھی ہے اور اخلاص بھی اس لئے بار اور ناگوار تو ہوگا نہیں بلکہ) ان کو اس کا ثواب ملے گا اور ہمارا وقت بچے گا۔ چنانچہ مسئلہ ہے کہ اگر کسی دوست کے گھر پر جائے اور وہاں کوئی کھانے کی چیز رکھی ہو اور وہ خود موجود نہ ہو اور یہ معلوم ہو کہ ہمارا کھانا اس کو ناگوار نہ ہوگا بلکہ وہ اور خوش ہوگا تو اس کا کھالینا جائز ہے اور اس کی رضا ہی بمنزلہ اجازت کے ہے۔ اسلاف کا یہی طریقہ تھا۔

واقعات میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ بہت سے لوگ حضرت سفیان ثوریؒ کے مکان پر پہنچے حضرت گھر پر نہیں تھے۔ انہوں نے دروازہ کھولا۔ دستر خوان بچھایا اور خود ہی کھانا نکال کر کھانا شروع کردیا۔ اتنے میں حضرت سفیان ثوری تشریف لے آئے اور ان سب کو اس حال میں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا۔ اے واہ سبحان اللہ! آپ حضرات کا یہ عمل دیکھ کر تو اسلاف کے اخلاق کی یاد تازہ ہوگئی۔

اسی طرح کا ایک واقعہ ایک اور تابعیؒ کا بھی ہے کہ ان کے یہاں اچانک بہت سارے مہمان آگئے۔ اتفاقا اس وقت گھر میں کچھ موجود نہ تھا فوراً ایک دوست کے گھر گئے (وہ بھی گھر پر موجود نہیں تھے) یہ ان کے باورچیخانہ میں چلے گئے اور جو کچھ مل سکا سب اٹھالائے اور مہمان کے سامنے رکھ دیا جب صاحب خانہ آئے اور گھر والوں سے یہ حال سنا تو کہا کہ خوب کیا۔ الحمدللہ اور جب ان تابعیؒ سے ملاقات ہوئی تو کہا کہ برادر من! دل خوش ہی تو ہوگیا لہٰذا ہمیشہ ایسا ہی کیا کرو تاکہ اس مسرت میں اضافہ ہوتا رہے۔

مہمان کے سامنے کھانا لانے کے آداب کے منجملہ ایک یہ ہے کہ تکلف نہ کرے۔ بے تکلفی کے ساتھ جو کچھ موجود ہو (یعنی ماحضر) پیش کردے۔ اور اگر ضرورت قرض کی پڑے اور آسانی سے نہ ملے تو قرض بھی نہ لے کہ یہ بھی تکلف ہی میں داخل ہے۔ اور بے تکلفی کو بہانہ بھی نہ بنائے یعنی اس کے پاس اچھی چیز موجود ہے اور اس کے ہوتے ہوئے بری اور خراب چیز لے آوے اور کہے کہ میں نے تکلفی کے طور پر ایسا کیا ہے کہ یہ بھی برا ہے۔ اگر موجود ہے تو اچھی ہی چیز نکالے اور لے آئے۔ اور اگر کھانا تھوڑا ہے جس کا خود یہ بھی محتاج ہے اس لئے اس کو لانے کو جی نہیں چاہتا تو نہ لائے۔ اسی طرح سے عادت سے زیادہ اہتمام کرنا بھی تکلف ہی میں شمار ہے۔ اور یہ بھی تکلف ہے کہ بال بچے تو بھوکے ہیں اور یہ سب چیزیں لاکر دوست احباب کو کھلاوے۔ یہ تکلف بھی ہے اور برا بھی ہے (یعنی اس میں اہل خانہ کی حق تلفی ہے)

مروی ہے کہ کسی شخص نے حضرت علیؓ کی دعوت کی۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں منظور تو ہے مگر تین شرطوں کے ساتھ۔ اول یہ کہ تم بازار نہ جانا۔ دوسرے یہ کہ جو کچھ گھر میں موجود ہو بس وہی لے آنا۔ تیسرے یہ کہ بال بچوں کا حصہ چھوڑ کر لانا۔ بعض اسلاف کا یہی طریقہ تھا کہ گھر میں کھانے پینے کی جنس کی جو جو چیزیں بھی موجود ہوتیں ان سب میں سے تھوڑا تھوڑا لے آتے۔ چنانچہ بعضوں نے تو خشک روٹی اور پانی کے لانے میں بھی تکلف نہیں کیا ہے۔ یعنی کوئی آگیا ہے تو وہی لا کر آگے رکھ دیا ہے۔

اور مہمان اور ملاقات کرنے والے کا ادب یہ ہے کہ میزبان سے کسی چیز کی فرمائش نہ کرے اور اگر صاحب خانہ ہی اس کو اختیار دیدے (مثلاً اس سے یہ کہہ کہ جو چیز تم کہو تمہارے لئے تیار کروائیں) تو فرمائش ایسی چیز کی کرے جس کی تیاری آسان ہو۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام چیزوں سے آسان کو پسند فرماتے تھے اور اسی کو اختیار فرماتے تھے۔

بعض علماء نے فرمایا ہے کہ لوگوں کے ساتھ کھانے کی تین قسمیں ہیں۔ فقرأ اور مساکین کے ساتھ کھانے میں تو ایثار کا خیال رکھے یعنی یہ کہ ان کے کھانے کو اپنے کھانے پر مقدم کرے۔ اور مسلمان بھائیوں کے ساتھ کھانے میں انبساط کا لحاظ رکھے ہنسی خوشی کے ساتھ کھائے۔ اور اہل دنیا کے ساتھ ادب اور حرمت کا اہتمام رکھے۔ اور میزبان کا ادب یہ ہے کہ کہ مہمان سے دریافت کرے کہ آپ کو کیا چیز مرغوب ہے اگر باآسانی مہیا کر سکے تو کردے کہ اس میں بہت زیادہ اجر ہے ورنہ بیکار باتیں زبان سے نہ نکالے۔ مثلاً یوں نہ کہے کہ اگر موجود ہو گا لاؤں گا۔ اسکی کیا ضرورت اگر موجود ہو (یا بسہولت انتظام کر سکتا ہو تو) لے آوے ورنہ سکوت اختیار کرے۔ اور جو کھانا مہمان کے سامنے موجود نہیں ہے اس کی تعریف بھی نہ کرے۔ (مثلاً کباب دسترخوان پر موجود نہیں ہے اور لگے تعریف کرنے کہ میری اہلیہ شامی کباب بہترین بناتی ہیں) یہی حکم بال بچوں کا بھی ہے کہ جو چیزیں ان کے لئے نہ لاسکے اس کی ان سے تعریف بھی نہ کرے کہ اس سے ان کو رنج ہو گا (سبحان اللہ! یہ ہے اسلامی معاشرت)

اور بعض خوش مزاج صوفیوں نے خوب بات کہی۔ فرمایا کہ تمہارے یہاں اگر کوئی فقیر شخص ملنے آوے تو کھانے سے اس کی خاطر کرو۔ اور اگر کوئی فقیہ اور عالم آجائے تو اس سے دین کا کوئی مسئلہ چھیڑ دو۔ اور اگر کوئی عابد آجائے تو اس کو مسجد کا راستہ بتلادو۔ (مطلب یہ کہ ہر ایک کے ساتھ اس کے مذاق کے مطابق معاملہ کرو۔)

جان لو کہ مہمان نوازی کی بڑی فضیلت آئی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ لَا خَیْرَ فِیْ مَنْ لَّا یُضِیْفُ جو شخص مہمان نواز نہ ہو اس میں کچھ بھی خیر نہیں۔ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر ایک ایسے شخص پر ہوا جس کے پاس اونٹ اور گائیں بہت

تھیں اس نے آپ کی خاطر کی (مگر معمولی طور سے) اس کے بعد آپ کا گزر ایک عورت پر ہوا جس کے پاس صرف چند بکریاں ہی تھیں لیکن اس نے آپ کے لئے ایک بکری ہی ذبح کر دی اور اس کا گوشت پکا کر کھلایا) آپ نے صحابہ سے فرمایا کہ اس مرد اور اس عورت کے اخلاق کا فرق دیکھو۔ یہ اخلاق بھی اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے جس کو چاہے نیک خصلت سے نواز دے اور جس کو چاہے نہ دے۔

(فائدہ) بظاہر اس مرد نے اپنی استطاعت کے موافق خاطر نہیں کی اور اس عورت نے باوجود کم استطاعت کے بہت خاطرداری کی کہ مسلم ایک بکری قربان کر دی اس کی یہ خصلت آپ کو پسند آگئی اور اس شخص کا طریقہ پسند نہ ہوا اور لوگوں کے بیان کرنے سے آپ کا مقصود یہ تھا کہ لوگ اس واقعہ سے ادب سیکھ لیں۔

حدیث میں آیا ہے ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں کچھ مہمان آگئے۔ گھر میں اس دن اتفاق سے کوئی چیز بھی موجود نہ تھی۔ آپ نے فرمایا کہ فلاں یہودی کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ آج کی رات ہمارے یہاں کچھ مہمان آگئے ہیں کچھ آٹا قرض دے دو۔ یہودی نے کہا واللہ میں بدون کسی چیز کے گروی رکھے ہوئے آٹا نہیں دوں گا۔ حضرتؐ نے اپنی زرہ رہن کے لئے بھیجی اور آٹا لیکر مہمان نوازی فرمائی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ پھر وہ زرہ اس یہودی کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وفات؎ تک رہن رکھی رہی۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام بغیر مہمانوں کے کھانا نہیں کھاتے تھے۔ چنانچہ کئی کئی میل جاکر مہمان کو تلاش فرماتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لوگوں نے پوچھا کہ ایمان کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ کھانا کھلانا اور باہم سلام کو رواج دینا۔ مطلب یہ کہ ایمان کے خصال میں سے یہ افضل خصلت ہے۔

کرامت جوانمردی وناں وہی است
مقالات بیہودہ طبل تہی است

یعنی جوانمردی دکھانا اور روٹی تقسیم کرنا یہ کرامت کی بات ہے۔ باقی کرنا کچھ نہیں اور صرف زبان سے بیکار اور بیہودہ باتیں بکنا ڈھول کے اندر پھول کا مصداق ہے۔

؎ یعنی ساری زندگی اتنی وسعت نہ ہو سکی کہ وہ چھڑالی جاتی۔ جو مال آتا اللہ تعالیٰ کے راستہ میں اور دیگر ضروریات میں صرف ہو جاتا تھا۔ اور آپ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ فقر اختیاری تھا۔

فصل چہارم

ضیافت (یعنی مہمان نوازی) کے آداب کا بیان اور یہ چھ عنوانات میں منحصر ہیں (۱) دعوت کرنے کے آداب (۲) اجابت دعوت کے آداب (۳) شرکت دعوت کے آداب (۴) طعام وماحضر پیش کرنے کے آداب (۵) عین کھاتے وقت کے آداب (٦) فراغت اور وقت رخصت کے آداب

(۱) آداب دعوت میں سے ایک یہ ہے کہ دعوت سے مقصد فخر ومباہات نہ ہو تاکہ ثواب سے محرومی نہ ہو۔ بلکہ نیت اتباع سنت اور مسلمانوں کی راحت اور ان کے قلوب میں خوشی اور مسرت کا ڈالنا ہو۔ دعوت میں متقی اور پرہیز گار لوگوں کو بلائے۔ اور کافر، فاسق اور بے نمازیوں کی دعوت نہ کرے۔

(فائدہ) دعوت کرنے سے مختلف اغراض ہوا کرتی ہیں۔ کبھی تو اس سے مقصد (حصول ثواب ہوتا ہے۔ اور کبھی ایک حاجتمند کی حاجت کا پورا کرنا مقصود ہوتا ہے۔ یعنی کوئی شخص بھوکا ہے اور حاجتمند ہے اس لئے اس کی دعوت کردی۔ پس مذکورہ بالا حکم یعنی یہ کہ دعوت متقیوں کی کرے فاسق وغیرہ کی نہیں۔ یہ اس دعوت کا ہے جہاں مقصد تحصیل ثواب ہو کہ وہ اسی صورت میں (زیادہ حاصل) ہوگا کیونکہ وہ نیک لوگ اس طعام سے جو قوت حاصل کریں گے وہ عبادت میں صرف ہوگی جس کا ثواب اس داعی کو بھی ملے گا۔ بخلاف فاسق وفاجر یا کافر کے کہ وہ کھا کر اور کفر وفسق ہی کریں گے۔ باقی اگر دعوت سے مقصد کسی بھوکے حاجت مند کا پیٹ بھرنا ہے تو سب کو کھلا سکتا ہے۔ کیونکہ دفع حاجت (ایک انسانی) ضرورت ہے جس میں مسلم اور کافر سب برابر ہیں۔ ہاں کسی ظالم کو کھانا نہ کھلاوے کہ اس کے ظلم میں اور مدد کرنا ہے۔ اسی طرح سے دعوت کرنے میں تخصیص امراء اور اغنیاء کی بھی نہ کرے۔ اور اپنے عزیز وقریب کا بہت لحاظ رکھے (یعنی ان کو ضرور بلائے) یوں جس شخص کے بارے میں یہ گمان ہو کہ نہیں آویگا اس کو نہ بلائے کہ یہ تکلف ہے۔ اور ایک شخص کو جبراً کھلانا ہے جو کہ مکروہ بھی ہے۔

(۲) دعوت قبول کرنے کے آداب میں سے ایک یہ ہے کہ دعوت کا قبول کرنا سنت مؤکدہ ہے اور کہیں واجب بھی ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعوت قبول فرمالیتے تھے اگرچہ کسی معمولی ہی چیز کی ہو۔ یہ عادت نہ اختیار کرے کہ امراء کی دعوت کو قبول کرلے اور غرباء اور فقیروں کی دعوت میں جانے سے عار کرے کہ یہ تکبر بھی ہے اور سنت کے بھی خلاف ہے۔

مروی ہے کہ حضرت حسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا گذر ایک دن ایک ایسی قوم پر ہوا کہ وہ لوگ (بوجہ غربت کے) زمین ہی پر (بلا فرش) کے بیٹھے ہوئے تھے۔ اور مانگنے کھانے والے لوگ تھے۔ حضرت حسنؓ نے ان کو سلام کیا۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت! غریبوں کا کھانا حاضر ہے اگر خاطر عاطر پر گراں نہ ہو اور حضور شرکت فرمالیں تو زہے نصیب۔ حضرت نے فرمایا بہت اچھا۔ بہت بہتر اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُتَکَبِّرِیْنَ (اللہ تعالیٰ متکبروں کو پسند نہیں کرتا۔ یہ کہا اور گھوڑے پر سے اتر آئے اور اسی طرح سے زمین ہی پر خود بھی بیٹھ کر ان کے ساتھ ماحضر تناول فرمایا۔ پھر فراغت کے بعد رخصت کا سلام کیا اور ان سے فرمایا کہ مجھے مسرت ہوگی اگر آپ لوگ بھی ایک دن میری دعوت قبول کرلیں چنانچہ دردولت پر ان کو بلایا اور نہایت عمدہ عمدہ کھانے ان کے سامنے رکھے اور خود بھی ان کے ساتھ بیٹھ کر کھایا۔ سبحان اللہ! حضرت کے اس کمال تواضع اور غایت الطاف کا کیا کہنا۔ (آخر تھے بھی تو کس خاندان کے صلی اللہ علیہ وسلم)۔

تواضع زگردن فرازاں نکوست ‏ گدا گر تواضع کند خوئے اوست

یعنی بڑے لوگوں سے تواضع کی کوئی بات پیش آئے تو ان کا کمال ہے باقی فقیر سے کیا کمال کیونکہ تواضع تو اس کی عادت ہی میں داخل ہوتی ہے۔

(ادب) جو لوگ بہت زیادہ تکلف کرنے والے ہیں۔ یا فخر و مباہات کرنے والے ہیں یا احسان جتلانے والے ہوں یا کم حوصلہ پست ہمت لوگ ہوں تو ایسوں کے یہاں دعوت میں نہ جائے اس قسم کی دعوتوں کا قبول کرنا سنت نہیں بلکہ ذلت ہے جیسے کسی سے سوال کرنا ذلت ہے اور منع ہے۔ باقی اس سلسلہ میں جھوٹ نہ بولے بلکہ اگر جانا منظور نہ ہو تو اول ہی سے قبول نہ کرے۔ اور اگر جگہ دور دراز ہے تو اگر وہاں جانا ممکن ہو تو محض دوری کی وجہ سے انکار نہ کرے۔ (بلکہ جائے اگرچہ کچھ تکلیف ہی سہی کیونکہ اتنے ہی اس داعی کا دل بھی تو خوش ہوگا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگ دور دور سے دعوت کے لئے بلاتے تھے اور آپ تشریف بھی لے جاتے تھے۔ اسی طرح سے اگر نفل روزہ رکھے ہوئے ہے تب بھی انکار نہ کرے۔ دعوت تو قبول ہی کرلے اور داعی کے مکان پر بھی جائے اور اب یہ دیکھے کہ اس نے اس کو دل سے بلایا ہے یعنی اگر یہ شریک دعوت نہ ہوگا تو اس کو دلی صدمہ ہوگا اور اس کلیہ اجتماع ہی کرا کر ہو جائے گا تو روزہ افطار کردے اور مومن کے قلب کو خوش کرنے کی نیت کرے کیونکہ اس کا ثواب نفل روزہ سے زیادہ ہے (لہٰذا اس اجر کو حاصل کرے اور روزہ کی قضا بعد کو کرے) اور اگر اسکے قلب میں یہ آئے کہ مجھے یونہی تکلف کے طور پر بلایا ہے تو کسی لطیف عذر سے کھانے کو ٹال جائے مثلاً یہ کہہ دے کہ میرا دل کھانے کو اس وقت مطلقاً نہیں چاہتا اور یہ جھوٹ بھی نہیں ہے کیونکہ روزہ دار کا دل روزہ توڑنے کو کب چاہتا ہے اور اس تکلف یا عدم تکلف کا پتہ چلانے کے لئے بعض ظاہری حالات کو دیکھ کر اگر تفتیش بھی کرنا پڑے تو کرے جائز ہے۔ مثلاً ظاہر حال سے

معلوم ہوتا ہے کہ وہ تکلف کرتا ہے تو اسکی تحقیق کر سکتا ہے۔ اور بصورت انظار نہ کرنے کے خوشبو تکیہ وغیرہ ہی خاطرداری کے لئے کافی ہے۔ اور اگر معلوم ہو کہ خود کھانے میں یا فرش فروش میں حرام یا شبہ حرام کی آمیزش ہے تو اس دعوت میں نہ جاوے۔ اور نہ اس کی تعریف کرے لیکن آمیزش حرام کی وجہ سے دعوت کی عدم شرکت کے مراتب مختلف ہیں جیسا جس کا تقویٰ ہو ویسی ہی قبیح اس کی شرکت ہے (مطلب یہ کہ مقتدا اور پیشوا کے لئے معمولی سا شبہ بھی مانع ہو جائے گا اور عوام کے لئے قدرے وسعت ہو جائے گی ۲) ظالم شخص کی دعوت میں نہ جائے اور اگر مجبور ہو کر کہیں پھنس ہی جائے تو بس تھوڑا سا کھا کر اٹھ جائے۔ اور جس مجلس میں کچھ امور خلاف شرع ہوں مثلاً ریشم کا کپڑا ہو یا سونے چاندی کے برتن ہوں یا جاندار کی تصویریں لگی ہوں۔ یا گانے بجانے کا سلسلہ ہو (مثلاً ڈھول' قوالی یا ریکارڈ ریڈیو پر گانا ہو رہا ہو) اسی کے مثل اور لہو ولعب ہو (مثلاً ناچ' گانا وغیرہ) تو وہاں دعوت میں نہ جائے۔ اسی طرح بدعتی' ظالم' شرپسند' متکبر اور فجور کرنے والے کے گھر بھی دعوت کھانے نہ جائے۔ اور دعوت کے قبول کرنے سے محض کھانے اور پیٹ بھرنے کی نیت نہ کرے بلکہ اچھی نیت کرے یعنی یہ کہ اتباع سنت۔ اکرام مسلم ایک مومن کا دل خوش کرنا اور احباب سے ملاقات کرنا یہ سب امور پیش نظر ہوں تاکہ آخرت میں اس کو ثواب بھی ملے کہ ان میں سے ہر چیز ثواب کی ہے۔ اسی طرح سے دعوت کے قبول کرنے میں شوق اور مسرت کا اظہار کرے۔ اور ایسے غلام سے احتراز کرے جس سے قبول نہ کرنے کا وہم ہوا ہو نیز بد خلقی نہ کرے اور کسی مسلمان کی حقارت نہ کرے۔ (یعنی کسی کا ظاہر شکستہ دیکھ کر اس کو حقیر نہ جانے) کہ مدار کار باطنی نیت پر ہے اور امور مباحہ میں بھی نیت کی وجہ سے ثواب ملتا ہے (مثلاً کھانا پینا ہی ہے کہ امر مباح ہے لیکن تقویٰ علی الطاعۃ کی نیت سے اس پر اجر ملے گا ۲) اور اب تو وہ امور مستحب کے حکم میں ہو جاتے ہیں اور جو امور کہ پہلے سے طاعت ہیں ان میں نیت کی وجہ سے زیادہ ثواب ہو جاتا ہے۔ اور حرام اور خلاف شرع دعوت نہ قبول کرے۔ یہاں نیت کا اعتبار نہیں ہو گا یعنی حرام بلت نیت کے اچھے ہونے سے جائز نہیں ہو جائے گی۔ مثلاً جس دعوت میں گانا' بجانا' ناچ رنگ وغیرہ ہو وہاں یہ نیت کرے کہ دعوت کا قبول کرنا سنت ہے۔ لہٰذا میں تو جاتا ہوں تو یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ یہاں نیت کچھ کام نہ کرے گی۔ اس لئے وہاں نہیں جانا چاہیئے۔

(۳) اور دعوت میں حاضر ہونے کے آداب میں سے یہ ہے کہ وقت مقررہ سے تاخیر نہ کرے تاکہ دوسروں کو انتظار کی زحمت نہ ہو۔ اور اتنے پہلے بھی نہ پہنچ جاوے کہ ابھی کھانا ہی تیار نہ ہوا ہو کہ یہ بھی برا ہے (اور حرص کی دلیل ہے) مگر یہ کہ داعی سے اس کو خصوصیت حاصل ہو اور پہلے اس لئے آگیا کہ اس کا کچھ ہاتھ ہی بٹا دے گا تو اس میں کچھ حرج نہیں بلکہ مناسب ہے۔

(ادب) اور اندر بدون اجازت لئے نہ چلا جائے (شاید زنانخانہ ہو) ہاں اگر اندر بہت سے لوگ جمع

ہوں تو اجازت کی ضرورت نہیں۔ جب مجلس میں آوے تو گھبرایا ہوا سا پریشانحال نہ آوے (بلکہ متانت اور وقار کے ساتھ آوے) اور آکر پہلے سلام کرے اور ایک نظر جملہ اہل مجلس کو دیکھے اس خیال سے کہ شاید کسی نے اس کو سلام کیا ہو یا اس کو اپنے پاس بلانا چاہتا ہو اور اس کو کچھ خبر نہ ہو اس لئے التفات نہ کرے اور اس خاص دوست کو رنج ہو جائے (جس نے سلام کیا تھا یا بلایا تھا) اور عام لوگ اسکو متکبر گردانیں (اس لئے مناسب ہے کہ بیٹھنے سے قبل مجلس پر ایک نظر ڈال لے) پھر جہاں جگہ ملے بیٹھ جاوے صدر نشینی اور بالا نشینی کے چکر میں نہ رہے کہ یہی سنت ہے اور اگر لوگ ہی صدر مقام پر اس کو بٹھانا چاہیں تو اولاً عذر کر دے اور اگر قلبی شوق اور از راہ تعظیم اصرار ہی کریں تو پھر اس اعلیٰ جگہ کو قبول کرے اور بیٹھ جاوے اب اس کا اصرار کرنا تکلف سے خالی نہیں بیٹھنے میں اس امر کا لحاظ رکھے کہ لوگوں پر اس کی وجہ سے جگہ تنگ نہ ہو جائے اور صاحب خانہ اگر کسی جگہ بٹھانا چاہے تب تو فوراً بیٹھ جائے اس کی مخالفت ہرگز نہ کرے۔ شاید کہ اس نے اپنے ذہن میں اہل مجلس کی کوئی خاص ترتیب مقرر کر رکھی ہو پس اس کی مخالفت اسکے لئے باعث پریشانی خاطر بھی ہوگی اور نظم کے بھی خلاف ہوگی۔ ایسی جگہ نہ بیٹھے جہاں سے زنانے مکان کا سامنا پڑتا ہو۔ مجلس میں بیٹھ کر بھی باوقار اور بردبار رہے یعنی ہر وقت ادھر ادھر نہ تکتا رہے۔ بالخصوص جس جانب سے کھانا لا رہے ہوں ادھر بار بار نہ دیکھے کہ یہ خست اور حرص کی دلیل ہے۔ اسی طرح سے بہت زیادہ بات بھی نہ کرتا رہے۔ اگر کچھ کہنا ہے تو ہوش کے ساتھ موقع و محل کی رعایت کر کے کلام کرے ورنہ خاموش ہی بیٹھا رہے۔ اور اگر اپنے سے بڑا اور بزرگ کوئی اس مجلس میں موجود ہے اس کا بہت زیادہ ادب اور لحاظ کرے اور جب تک اس سے کوئی بات دریافت نہ کی جائے اب تو اسکا بولنا خلاف ادب بھی ہے۔ اور اگر اہل مجلس اسکے کلام کے مشتاق ہیں تو خاموش بھی نہ رہے۔ ہاں اس امر کا خیال رکھے کہ ایسی کوئی بات نہ کہے جو حاضرین کے خلاف مزاج ہو یا اس کا کوئی اثر اور نفع نہ ہو البتہ اگر اس بات کا کہنا شرعاً ضروری ہے تو پھر کسی کے مزاج وغیرہ کی رعایت نہیں ہے (ضرور کہے) بیکار اور لغو باتیں نہ کرے کہ بہرحال ناپسندیدہ ہے۔ اور اگر مجلس میں کوئی بات خلاف شرع دیکھے تو منع کر دے۔ چنانچہ اگر اسکے موقوف کرانے پر قادر ہو تو اسکو بند کرا دے ورنہ خود وہاں سے چلا آوے اور اگر اس اندیشہ کی وجہ سے ایسی مجلس میں شریک ہی نہیں ہوا تو اور بہتر ہے۔ اور اگر ابتداء میں وہ امر خلاف شرع نہیں تھا بیٹھنے کے بعد شروع ہوا ہے تو دونوں اختیار ہیں یا تو چلا آوے یا بیٹھے اور صبر کرے۔ لیکن مقتدا اور پیشوا کے لئے وہاں سے چلا آنا ہی بہتر ہے۔

(فائدہ) در مختار میں اس مسئلہ کی تفصیل یوں آئی ہے کہ جو شخص کہیں دعوت میں جائے اور وہاں کوئی ناجائز چیز مثلاً گانا بجانا وغیرہ دیکھے تو اگر اس کو پہلے سے اس کا علم نہ تھا تو خیر کھانا کھالے بشرطیکہ یہ لہو و لعب اس مکان میں دوسری طرف ہو رہا ہو۔ دستر خوان پر نہ ہو۔ اور اگر عین کھانے ہی کی جگہ

پر ہے تو شرکت دعوت مناسب نہیں وہاں سے چلا آوے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ فَلَا تَقۡعُدۡ بَعۡدَ الذِّکۡرٰی مَعَ الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِیۡنَ یعنی یاد آجانے کے بعد اہل معصیت اور ظالموں کی صحبت میں نہ بیٹھے۔

پھر مکان میں بھی لہو ولعب ہونے میں یہ تفصیل ہے کہ اگر قدرت ہو تو اس کو وہاں سے بھی بند کردے ورنہ صبر کرے۔ اور یہ حکم بھی اس شخص کے لئے ہے جو عامی ہو مقتدا نہ ہو۔ اور اگر مقتدا اور پیشوا ہو اور منع کرنے پر قدرت نہ رکھتا ہو تو اس صورت میں بھی اٹھ کر چلا آوے۔ جبکہ لہو ولعب بھی اس تقریب میں ہو۔ اگرچہ دوسری جگہ ہو اور دسترخوان پر نہ ہو۔ کیونکہ اس کی کثرت سے دین کا احترام کم ہوگا (اور لوگ اس کو اس فعل پر راضی تصور کریں گے اور اس امر منکر کی برائی بھی ذہن سے نکال دیں گے) اور اگر پہلے سے معلوم ہو کہ اس تقریب میں فلاں برائی بھی ہے تب تو وہاں جاوے ہی نہیں خواہ عالم ہو یا عامی ہو اس لئے کہ دعوت کا حق حاضری کے بعد لازم ہوتا ہے۔ اس سے پہلے نہیں ہوتا۔

نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس قدر بھی آلات لہو ولعب ہیں یعنی باجے وغیرہ وہ سب حرام ہیں۔ اور جو لوگ ان میں مشغول ہوں ان کو اس سے روکنے کے لئے بغیر اجازت کے بھی ان کے پاس جایا جاسکتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ گانے اور باجے کی آواز قلب میں اس طرح سے نفاق کو اگاتی ہے جیسے پانی گھاس کو اگاتا ہے۔ اور بزازیہ میں ہے کہ باجوں کی آواز کا سننا حرام ہے اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مزامیر یعنی (باجوں کا سننا معصیت ہے اور اس مجلس میں بیٹھنا فسق ہے اور اس سے لذت حاصل کرنا کفر ہے۔ یعنی شکر کے خلاف اور کفران نعمت کی بات ہے اس لئے کہ (مومن کے لئے لذت کی چیز ذکر اللہ اور سماع قرآن ہے ۴) اور اللہ تعالیٰ نے اعضاء عبادت کے لئے دیئے ہیں۔ پس ان کو غیر عبادت میں صرف کرنا کفران نعمت نہیں تو اور کیا ہے۔ لہٰذا اسکے سننے سے پرہیز کرے۔

ممنوعات مجلس سے یہ چیزیں ہیں۔ گانا بجانا سننا۔ سونے چاندی کے برتن کا ہونا' بے پردہ عورتوں کا وہاں ہونا۔

اسی طرح سے منجملہ آداب ضیافت کے ایک یہ بھی ہے کہ مہمانوں کو سمت قبلہ اور مکان استنجاء (پاخانہ وغسل خانہ وغیرہ) بتلادے۔ اور کھانے کے لئے جب ہاتھ بلائے تو میزبان پہلے خود اپنے ہاتھ دھوئے۔ پھر دوسروں کے دھلائے اور کھانے کے بعد مہمانوں کے ہاتھ پہلے دھلائے اور اپنے بعد میں۔

(۴) کھانا لانے کے آداب یہ ہیں:۔ کھانا لانے میں جلدی کرے کہ یہ بھی مہمان کی تعظیم اور خاطر ہی میں شمار ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مَنۡ کَانَ یُؤۡمِنُ بِاللّٰہِ

وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْیُکْرِمْ ضَیْفَہٗ یعنی جو اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے مہمان کی خاطر اور اس کا اکرام کرے۔

(ادب) جب کہ اکثر لوگ آجائیں تو محض ایک دو شخص کے انتظار میں سب لوگوں کو مقید نہ رکھے اگر مقررہ وقت ہو گیا ہو تو اس لئے کہ اب حاضرین کا حق غالب ہو چکا ہے۔ ہاں اگر کوئی غریب شخص ایسا رہ گیا ہو کہ وہ تنہا رہ جانے کی وجہ سے شکستہ خاطر ہو جائے گا یا کوئی شخص ایسا محترم باقی ہو کہ اس کے انتظار میں حاضرین کو بجائے رنج و خوشی ہو گی اور کھانا بھی ٹھنڈا نہیں ہو گا تو قدرے اس کا انتظار کر لیا جائے۔ حضرت حاتم اصمؒ فرماتے ہیں کہ یوں تو تعجیل (یعنی جلدی کرنے کو) شیطان کی جانب سے کہا جاتا ہے مگر پانچ چیزوں میں جلدی ہی کرنا سنت ہے۔

مہمان کے لئے کھانا لانے میں۔ میت کی تجہیز و تکفین کرنے میں۔ کنواری لڑکی کا نکاح کرنے میں قرض کے ادا کرنے میں اور گناہوں سے توبہ کرنے میں۔ کنواری لڑکی کا نکاح کرنے میں قرض کے ادا کرنے میں اور گناہوں سے توبہ کرنے میں۔ اسی طرح سے مستحب ہے جلدی کرنا دعوت ولیمہ میں بھی۔ اور ولیمہ کہتے ہیں اس دعوت کو جو نکاح کے بعد زوج (یعنی لڑکے) کی جانب سے کی جاتی ہے۔

ترتیب چیزوں کے کھانے کی یہ ہے کہ پہلے میوہ (یا پھل) کھائے اگر دسترخوان پر موجود ہوں کیونکہ یہی ترتیب طب کے مطابق ہے اس لئے کہ میوہ اور پھل وغیرہ سریع الہضم چیزیں ہیں۔ لہٰذا ان کا اسفل معدہ میں ہونا مناسب ہے (تاکہ معدہ کا کام سہل چیز سے شروع ہو) اور قرآن شریف سے اہل جنت کے کھانے کی بھی یہی ترتیب مفہوم ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں وَفَاکِھَۃٍ مِّمَّا یَتَخَیَّرُوْنَ وَلَحْمِ طَیْرٍ مِّمَّا یَشْتَھُوْنَ یعنی غلمان جنت میں جنتیوں کے لئے پہلے ان کے انتخاب و پسند کے مطابق پھل و میوے لاویں گے اور اس کے بعد جن پرندوں کا گوشت انہیں مرغوب ہو گا وہ پیش کریں گے۔ (اس سے نکلا کہ پھل کو تقدیم حاصل ہے) باقی پھل اور میووں کے بعد پھر اور کھانوں سے مقدم گوشت ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ سید الطعام لَحْمٌ یعنی گوشت کھانوں کا سردار ہے۔ اسی طرح سے جو کھانا لطیف ہو پہلے اس کو کھاوے تاکہ حاجت اور بھوک کی بندش غذائے لطیف ہی سے ہو جائے اور پھر زیادہ کھانے کو جی نہ چاہے کیونکہ اچھی چیز کے بعد اس سے کم درجہ کی چیز کی جانب اشتہاء باقی بھی نہیں رہ جاتی۔ (یہی وجہ ہے کہ) اہل تنعم اور بندہ شکم جو لوگ ہوتے ہیں ان کی عادت اس کے برعکس ہوتی ہے یعنی وہ لوگ اچھا اور لطیف کھانا بعد میں کھاتے ہیں پہلے غیر لطیف کو کھا لیتے ہیں تاکہ لطیف کی رغبت ہنوز باقی رہے اور ہر قسم کا کھانا کھالیں۔ کسی صنف طعام سے محرومی نہ ہو۔ یہ صورت خلاف سنت ہے اس لئے کہ کثرت طعام کا ذریعہ ہے۔ اور اگر ترکاری (سالن) یا کسی بھی نمکین چیز سے ابتدا کرے تو مناسب ہے اس لئے کہ

اس میں کھانے کی رغبت بھی ہوتی ہے اور یہ زیب دستر خوان بھی ہے۔ کھانے کے وقت ٹھنڈا اور شیریں پانی کا بھی انتظام رکھیں کہ اس سے بہتر کوئی نعمت نہیں ہے۔ متقدمین کی یہ عادت تھی کہ کھانے میں جتنی قسم کی چیزیں ہوتی تھیں ان سب کو مہمانوں کے سامنے رکھ دیتے تھے (اس کی وجہ سے اسکو ہر چیز کا اندازہ ہو جاتا تھا) چنانچہ اگر ایک ہی قسم کا کھانا ہو تو اسکو ظاہر کر دینا مناسب ہے تاکہ لوگ اسی سے شکم سیر ہو جائیں۔ اور دوسری کسی چیز کے منتظر نہ رہیں۔ (مثلاً صرف گوشت روٹی ہے تو ابتدا ہی میں اسکو ظاہر کردیں تاکہ لوگوں کو چاول کا انتظار نہ رہے اور لوگ اسی سے شکم سیر ہو لیں۔ ۴)

(ادب) دستر خوان کے اٹھانے میں جلدی نہ کرے کہ شاید کوئی مہمان ایسا ہو کہ ابھی کچھ اور کھانا چاہتا ہو اور بسبب شرم کے اظہار نہ کر سکے اور بھوکا ہی اٹھ جائے بلکہ صاحبِ خانہ کو اس موقع پر یہ کرنا چاہیے کہ جب لوگ کھانے سے فراغت کے قریب ہو رہے ہوں تو خود بھی دستر خوان پر بیٹھ جاوے اور کھانا شروع کردے اور (روٹی یا سالن کی جانب اشارہ کرتے ہوئے) لوگوں سے کہے ہاں یارو بسم اللہ لو اس کو ختم کرانے میں ذرا میری مدد تو کرو۔ یہی طریقہ اسلاف کا پسندیدہ تھا۔

(ادب) میزبان کو چاہیئے کہ کھانا بقدر ضرورت ہی لادے یعنی نہ زیادہ ہو نہ کم۔ کیونکہ ضرورت سے کم لانا مروت کے خلاف ہے اور بلا ضرورت زیادہ لانا فخر و اسراف ہے اور یہ جب ہے کہ یہ جانتا ہو کہ اتنا سب استعمال نہیں ہو گا۔ اور اگر یہ نیت ہو کہ جو کھائے گا کھالے گا بقیہ گھر لیتا جائے گا تو جس قدر زیادہ لاوے مستحسن ہی ہے۔ حضرت ابراہیم ادہمؒ مہمانوں کے لئے بہت کھانا لاتے تھے حضرت سفیان ثوریؒ نے ٹوکا اور کہا کہ کیا یہ اسراف نہیں ہے؟ آپ نے فرمایا کہ کھانا کھلانے میں اسراف نہیں ہوا کرتا (یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک بزرگ خیر اور بھلائی کے کاموں میں بہت مال صرف کرتے تھے کسی نے ان سے کہا کہ لَا خَيْرَ فِي الْاَسْرَافِ یعنی اسراف اچھی چیز نہیں ہے۔ انہوں نے اس کو الٹ دیا اور فرمایا کہ لَا اِسْرَافَ فِي الْخَيْرِ یعنی خیر اور نیک کاموں میں جو خرچ ہو وہ اسراف ہی نہیں ہے ۴) اور اگر یہ نیت نہ ہو کہ مہمان بچا ہوا کھانا گھر لیتا جائے تو بیشک کھانا زیادہ لانا فخر و تکلف ہے اور دانہ برباد کرنا ہے۔ حضرات صحابہ فخر کرنے والے کی دعوت نہیں قبول کرتے تھے۔

(ادب) چاہیئے کہ گھر کے لوگوں کا حصہ پہلے ہی سے نکال لے تاکہ ان کا دل اور ان کی نظر مہمانوں کے کھانوں میں نہ لگی رہے اور اگر مہمانوں سے (مزید) نہ بچے تو وہ آزردہ خاطر نہ ہوں اور خود مہمانوں کے لئے بھی کھانا مکروہ نہ ہو (کیونکہ اہل خانہ کا حصہ دیا جاچکا ہے)

(ادب) کھانا کھلانے والے کی رضا و اجازت کے بغیر کھانا گھر لے جانے کے لئے نہ اٹھاوے کہ اس

میں ذلت ہے اور بدون رضا کے لے جانا حرام ہے۔ اور اجازت کے بعد وقار اور اعتدال کا لحاظ ضروری ہے یعنی اپنے ہی سامنے سے اٹھاوے دوسروں کے آگے کانہ سمیٹ لے۔ ہاں ان کی اجازت ہو تو دوسری بات ہے۔

(۵) کھانے کے وقت آداب کے سلسلے میں جو امور کہ ضروری ہیں وہ فصول سابقہ میں بیان ہو چکے ہیں اس لئے ان کے اعادہ کی حاجت نہیں۔ (بأدنیٰ تامل انکو معلوم کیا جا سکتا ہے)

(۶) اور مجلس دعوت سے رخصت ہونے کے آداب سے یہ ہے کہ داعی (یعنی اہل خانہ) خود مہمانوں کو باہر دروازہ تک پہونچانے کے لئے آوے کہ یہ بھی منجملہ انکی تعظیم کے ہے۔ اور سنت ہے۔ اور تمام وقت ان سب کے ساتھ نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ رہے کہ کامل تعظیم تو یہی ہے۔ باقی اول و آخر میں تو اس کا خاص اہتمام رکھے اور سمجھ لے کر مہمانوں کی یہ تعظیم و تکریم ان کو کھانا کھلانے سے کم نہیں ہے بلکہ اس سے کچھ بڑھ کر ہی ہے۔ اسی طرح سے مہمانوں کو بھی چاہیئے کہ یہاں سے سب خوش و خرم واپس جائیں اور اگر میزبان سے کچھ تقصیر ہو گئی ہو تو اس کو معاف کر دیں اور ہنسی خوشی وہاں سے رخصت ہوں کیونکہ خوش خلقی سب عملوں سے بڑھ کر عمل ہے اور بد خلقی بدترین عمل ہے۔ اور داعی کے لئے دعائے خیر (و برکت) کرے۔ اور بدون اس کی اجازت کے مجلس سے اٹھ کر گھر جانے کے لئے باہر نہ چلا جائے۔ اسی طرح سے جتنی مدت قیام رہے اس میں صاحب خانہ کی مصلحت اور اس کی خاطر کی رعایت ضروری ہے۔ چنانچہ تین دن سے زیادہ کسی کے یہاں مہمان نہ رہے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ طول قیام سبب ملال بن جائے اور مجبوراً وہ چلے جانے کے لئے اپنی زبان سے کہہ دے۔ ہاں اگر اہل خانہ خلوص دل سے قیام پر اصرار ہی کریں تو زیادہ بھی ٹھہر سکتا ہے۔ اور مناسب ہے کہ مہمان کے لئے ایک فرش (یعنی بستر) مہیا رکھیں۔ اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ انسان کے یہاں تین بستر ہونے کافی ہیں۔ ایک اپنے لئے۔ ایک بیوی کے لئے اور ایک مہمان کے لئے اور چوتھا شیطان کے لئے ہے (مطلب یہ کہ بے ضرورت ہے اور قلب مومن کے لئے ایک زائد علاقہ ہے)

(فائدہ) تفصیل اس کی یہ ہے کہ اگر ہو سکے تو آدمی اپنے یہاں کم از کم تین بستروں کا انتظام رکھے۔ ایک خود اپنے لئے اور دوسرا بیوی کے لئے کہ شاید کسی وقت بوجہ بیماری یا اور کسی عذر کے دونوں کو الگ الگ سونا پڑے۔ ورنہ تو بیوی کے لئے علیحدہ بستر کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ایک ہی بستر پر زوجین کا سونا اولیٰ اور اوفق بالسنۃ ہے کیونکہ احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ازواج مطہرات کے ساتھ ہی آرام فرماتے تھے۔ اور تیسرا بستر اس لئے موجود ہو کہ شاید وقت بے وقت کوئی مہمان آ جائے اور اس کے پاس بستر نہ ہو (تو اسکو تکلیف اور اسکو شرمندگی نہ ہو) پس یہ تین بستر شیطان کی جانب اس کی نسبت اس لئے فرمائی کہ قدر حاجت سے زائد ہے اور

محل مفاخرت ہونے کی وجہ سے مذموم ہے اور ہر مذموم شے شیطان ہی کی جانب منسوب کی جاتی ہے۔ یا یہ کہ چونکہ اس کی ضرورت سے زائد ہے اور خالی ہے اس لئے شیطان اسکو استعمال کرتا ہے اور اس پر فروکش ہوتا ہے (جیساکہ مشہور ہی ہے کہ جائے خالی را دیو می گیرد ۲)

حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ نے شرح مشکوٰۃ میں تحریر فرمایا ہے کہ یہ حکم اس بستر کا ہے جو از روئے تکبیر و مفاخرت کے رکھا جائے باقی اگر کوئی شخص کریم النفس اور مہمان نواز ہے اس لئے اس کے یہاں بہت مہمان آتے رہتے ہیں۔ پس وہ ان کی راحت کے لئے کثرت فرش بستر اور ضروری اسباب کا انتظام رکھتا ہے تو یہ مذموم نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

فصل پنجم

اس باب کے متفرق فوائد کے بیان میں

(ادب) بازار میں کھانا مکروہ ہے کیونکہ یہ خلاف مروت اور خسیس کام ہے۔ اس کی وجہ سے عدالت ساقط ہو جاتی ہے یعنی ایسا شخص شہادت کا اہل نہیں رہ جاتا۔ بعض علماء نے فرمایا ہے کہ یہ کھانا لوگوں کی عادات۔ حالات اور مقامات کے اعتبار سے مختلف بھی ہوتا ہے۔ یعنی بعض لوگ یہ طریقہ قلت مروت اور کثرت حرص کے سبب اختیار کرتے ہیں۔ اس سے تو بے شک عدالت ساقط ہو جاتی ہے اور آدمی میں شہادت کی اہلیت باقی نہیں رہ جاتی۔ لیکن بعض لوگ ایسا بسبب تواضع اور ترک تکلف کے کرتے ہیں چنانچہ بعضے صوفیا سے بھی ثابت ہے (تو یہ اس حکم میں نہیں ہے)

(ادب) سنت یہ ہے کہ کھانا تین انگلیوں سے کھایا جاوے۔ بیچ کی انگلی۔ کلمہ کی انگلی اور انگوٹھے سے اور ایک انگلی یا دو انگلیوں سے نہ کھائے۔ اسی طرح سے چار یا پانچ انگلیوں سے بھی نہ کھاوے کہ یہ حرص پر دلالت کرتا ہے۔

(حکمت) گوشت کھانے سے گوشت بڑھتا ہے۔ گائے کے گوشت میں (بہ سبب گرم ہونے کے قدرے طبی) مضرت بھی ہے۔ ہاں دودھ اس کا نافع ہے بلکہ دوا کا کام کرتا ہے۔ مچھلی کھانے سے بدن گھٹتا ہے قرآن شریف کی تلاوت کرنے نیز مسواک کرنے سے بلغم کا ازالہ ہوتا ہے۔ رگوں کے کاٹنے سے بیماری پیدا ہوتی ہے۔ رات کا کھانا نہ کھانے سے بڑھاپا جلد آتا ہے اور صبح کو نہ کھانا ضعف پیدا کرتا ہے۔ صحیح اور تندرست آدمی کو پرہیز سے ایسا ہی ضرر ہوتا ہے جیساکہ بیمار کو بدپرہیزی سے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ حجاج نے ایک طبیب سے پوچھا کہ مجھے ایسا طریقہ بتلاؤ کہ اس پر عمل کرنے کے بعد پھر مجھے کسی طبیب کی حاجت ہی نہ پڑے۔

اس نے کہا سنیئے۔ غیر جوان عورت سے نکاح نہ کیجئے گا۔ غیر جوان جانور کا گوشت نہ استعمال کیجئے گا۔ آپ کے مطبخ اور خوان پر جو چیز گلی ہوئی نہ ہو اس کو نوش نہ فرمایئے گا۔ اور بدون مرض (اور شدت حاجت کے) دوا نہ استعمال کیجئے گا۔ پھل اور میوے جو ابھی کچے ہوں پختہ نہ ہوں ان کو نہ کھایئے گا۔ لقمہ کے چبانے میں مبالغہ سے کام لیجئے گا (یعنی خوب دیر تک چبا کر تب اس کو نگلیے گا) اور جس چیز کی جانب رغبت نہ ہو اس کو نہ کھایئے گا۔ کھانے کے بعد فوراً پانی نہ پیجئے گا۔ البتہ تھوڑی دیر ٹھہر کر پی سکتے ہیں۔ اور کھانا شکم سیر ہو کر کبھی نہ کھایئے گا (بلکہ قدرے بھوک

باقی رہے تب ہی بند کردیجئے گا) پاخانہ اور پیشاب کا تقاضا ہونے پر اس کو نہ روکیئے گا۔ دن کا کھانا کھا کر تھوڑی دیر قیلولہ فرمالیا کیجئے گا اور شب کا کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر ٹہلنے کا معمول ضرور رکھیے گا۔

(**حکمت**) چار چیزیں بدن کو قوی کرتی ہیں۔ گوشت کا استعمال۔ خوشبو کا سونگھنا۔ بدون جماع کے کثرت غسل کی عادت رکھنا۔ کتان پہننا (کتان ایک قسم کا کپڑا ہوتا ہے)۔

چار چیزیں بدن کو سست کرتی ہیں۔ کثرت جماع۔ بہت زیادہ غمگین رہنا۔ بہت پانی پینا۔ خاص کر باسی منہ۔ ترش چیزوں کا کثرت سے استعمال۔

چار چیزوں سے بینائی کو قوت ہوتی ہے۔ قبلہ رو نشست رکھنے سے۔ سوتے وقت سرمہ استعمال کرنے سے۔ سبزہ (یعنی ہری بھری شاداب گھاس اور پودے) کی جانب نظر کرنے سے۔ عمدہ صاف وپاکیزہ (مثلاً سفید) لباس پہننے سے۔

چار چیزوں سے بینائی کو نقصان پہونچتا ہے۔ نجاست کا دیکھنا۔ جس کو سولی دی گئی اس کو دیکھنا۔ عورت کے ستر کو دیکھنا۔ قبلہ کی جانب پشت کرکے بیٹھنا۔

چار چیزیں قوت باہ (قوت جماع) کو زیادہ کرتی ہیں۔ پرند کا گوشت کھانا۔ اطریفل اکبر کھانا۔ پستہ کھانا۔ چرچر کھانا۔

چار چیزیں عقل کو بڑھاتی ہیں۔ ضرورت سے زائد کلام کا ترک کرنا۔ مسواک کرنا۔ علماء کی مصاحبت صلحاء کی ہم نشینی۔

سونے کی چار حالتیں ہیں۔ چت سونا یہ حضرات انبیاء علیہم السلام کا طریقہ تھا کہ وہ حضرات آسمان و زمین کی پیدائش میں اس ہیئت سے لیٹ کر تفکر فرماتے تھے۔ داہنی کروٹ پر سونا۔ یہ علماء کا طریقہ ہے اور عبادت (وسنت) ہے۔ بائیں کروٹ پر سونا۔ یہ طریقہ بادشاہوں (اور اہل تنعم) کا ہے کہ (ان لوگوں کو) کھانا ہضم کرنے کے لئے (تدابیر کی حاجت پڑتی ہے اور یہ اس کے لئے) معین ہے۔ منہ کے بل (یعنی اوندھے منہ سونا۔ یہ طریقہ شیطان کا ہے (اس لئے اس سے بچنا چاہیئے اور اپنے بچوں کو بھی منع کرنا چاہیئے)۔

دوسرا باب

نکاح کے آداب میں اور اس میں پانچ فصلیں ہیں

(فصل اول + نکاح کے منافع اور اس کی آفات کے بیان میں)
(فصل دوم + نکاح میں جن امور کی رعایت ضروری ہے ان کا بیان)
(فصل سوم + معاشرت بالنساء اور ولیمہ کے بیان میں)
(فصل چہارم + مباشرت و جماع۔ ولادت اور طلاق کا بیان)
(فصل پنجم + زوجین کے باہمی حقوق کا بیان)

فصل اول

نکاح کے فوائد اور اس کی آفات کا بیان

جانو کہ علماء کا اس امر میں اختلاف ہے کہ نکاح کرنا افضل ہے یا تجرد کی زندگی (یعنی نکاح نہ کرنا) بعض علماء کے نزدیک قول مختار اس مسئلہ میں یہ ہے کہ اب اس زمانہ میں بہتر نکاح نہ کرنا ہی ہے۔ کیونکہ نکاح کی اس افضلیت جو روایتوں سے معلوم ہوتی ہے وہ اگلے زمانہ کے اعتبار سے تھی جبکہ حلال روزی لوگوں کو میسر تھی اور عورتوں کے اخلاق بھی اچھے ہوتے تھے (اس لئے شادی درحقیقت اس وقت خانہ آبادی کے مرادف تھی اور اب تو ان خرابیوں کے باعث بالعموم اتفاق و سکون اور راحت بربادی کا ذریعہ ہی بنتی ہے ۱۲) احادیث اور اقوال صحابہ سے دونوں ہی باتوں کی تائید ہوتی ہے تاہم اکثر روایات نکاح کرنے ہی کی موئید ہیں۔ باقی حقیقت حال کا علم نکاح کے فوائد اور اس کے نقصانات کے بیان پر موقوف ہے۔ چنانچہ نکاح کے فوائد یہ ہیں۔

(۱) نکاح اولاد کے پیدا ہونے کا ذریعہ ہے اور نکاح سے اہم مقصود بھی یہی ہے کہ آدمؑ کی نسل باقی رہے۔ اور خود اولاد کے پیدا ہونے میں بڑی بڑی مصلحتیں اور فائدے ہیں۔ (ایک یہی کیا کم ہے کہ) آدمی اللہ تعالیٰ کی مراد کی تحصیل میں سعی کرتا ہے اس لئے کہ خود شہوت اور ستر کے پیدا کرنے میں حکمت خداوندی یہ بھی ہے کہ اولاد پیدا ہو تاکہ نسل انسانی باقی رہے۔ نیز رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کا منشا بھی اس کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ آپ کا حکم ہے کہ نکاح کرو اور اس کے ذریعہ اولاد حاصل کرو کیونکہ میں تمہاری (کثرت کی) وجہ سے (قیامت میں) اور دوسری امتوں پر فخر کروں گا۔

(ایک فائدہ یہ ہے کہ) چھوٹے بچے کے مرنے میں بہت ثواب آیا ہے یعنی قیامت میں جب بچوں کو جنت میں لیجانے لگیں گے تو وہ اپنے ماں باپ کا دامن پکڑ کر مچل جائیں گے (اور حق تعالیٰ سے عرض کریں گے) کہ جب تک یہ لوگ بھی جنت میں نہ جائیں گے ہم بھی اس میں داخل نہ ہوں گے۔ چنانچہ ان کی اس (سفارش پر) حکم ہوگا کہ (اچھی بات ہے اے جھگڑالو بچے) جا اپنے ماں باپ کا ہاتھ پکڑ کر ان کو بھی جنت میں لے جا۔

(ایک فائدہ یہ بھی ہے) فرزند صالح (جس کا ذریعہ نکاح ہی ہے) والدین کے مرنے کے بعد ان کے لئے جو دعا کرتا ہے تو اس سے ان کو بہت فائدہ پہونچتا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ مردہ کے پاس (اولاد وغیرہ کی) دعا نور کے طباقوں میں پیش کی جاتی ہے۔ اور فرزند اگر صالح نہیں بھی ہے جب بھی اس کی دعا کی مقبولیت کی امید ہے۔ اسی قسم کے اور بہت سے فوائد ہیں اولاد کے (اور چونکہ اولاد کا ذریعہ نکاح ہے اس لئے نکاح کرنا بہتر اور پسندیدہ امر ہوا)۔

چونکہ نکاح کے مقاصد میں سے ایک بڑا مقصد اولاد کا حاصل کرنا ہے۔ اسی لئے بانجھ عورت سے نکاح کرنا بُرا اور مکروہ ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ نکاح ایسی عورتوں سے کرو جو عمدہ ہوں یعنی زیادہ بچے جننے والیاں ہوں۔ اور یہ بھی آیا ہے کہ گھر کے کونے میں کوئی ٹاٹ کا ٹکڑا پڑا ہو یہ اس سے کہیں اچھا ہے کہ اس گھر میں ایسی عورت ہو جو بچہ نہ جنتی ہو۔ اور یہ بھی فرمایا ہے کہ بچے جننے والی اگرچہ وہ کالی ہو اس گوری عورت سے بہتر ہے جو بچہ نہ جنتی ہو۔ اور (ان روایات سے جہاں نکاح کی فضیلت معلوم ہوئی وہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ اولاد کے باب میں اللہ و رسول کے نزدیک کثرت ہی مطلوب ہے۔ لہٰذا اس کے خلاف ہر وہ طریقہ ناجائز اور منع ہوگا جس سے منشا خدا اور رسول پر ضرب پڑتی ہو۔ اہل دنیا کے نزدیک زمین کی قلت یا غذا کی دقت کا سوال ہو تو ہو لیکن مسلمان کے نزدیک یہ کوئی سوال نہیں۔ وہ مالک اور رازق حقیقی خدا کو سمجھتا ہے اس کو جس امر کی اجازت ہے وہ کرے اور جو انتظام خدا سے متعلق ہے اس کی فکر میں انسان کو نہیں پڑنا چاہئے۔ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی وَمَا مِنْ دَابَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا۔ وَقَالَ تَعَالٰی اِنَّا کُلَّ شَیْئٍ خَلَقْنٰہُ بِقَدَرٍ۔ یعنی روئے زمین پر جتنے بھی چلنے والے ہیں اللہ تعالیٰ کے ذمہ ان کی روزی ہے۔ نیز فرمایا کہ ہم نے تمام چیزیں اندازہ اور حساب سے پیدا کی ہیں۔

(۲) (منجملہ فوائد نکاح کے) ایک فائدہ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے شیطان اور اس کے اخوان کی آفات سے امن رہتا ہے کیونکہ ہرچند کہ انسان میں اگر تقویٰ ہوا تو وہ اپنے اعضا کو بری حرکتوں سے

بچائے گا اور اپنی نگاہ کی بھی حفاظت کرلے گا لیکن قلب بھی اس کا وساوس اور خطرات سے محفوظ رہ سکے۔ یہ بڑا دشوار امر ہے۔ چنانچہ قلبی وساوس سے اگر بچا جا سکتا ہے تو اسی نکاح کے ذریعے سے۔

اسی لئے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ "عبادات تام نہیں ہوتیں بدون نکاح کے۔" بعض علماء نے خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا کی تفسیر ہی اس سے فرمائی ہے کہ انسان ضعیف پیدا کیا گیا ہے یعنی وہ عورت سے صبر نہیں کر سکتا۔ علماء فرماتے ہیں کہ انسان پر جب شہوت کا غلبہ ہوتا ہے تو اس کے دین اور عقل نے دو حصے ختم ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے حدیث شریف میں بھی آیا ہے کہ جن عورتوں کے خاوند نہ ہوں (یعنی مر گئے ہوں یا اس وقت گھر پر موجود نہ ہوں) ان کے پاس مت جاؤ (یعنی ان سے خلوت میں نہ ملو) اس لئے کہ شیطان آدمی کے بدن میں اس طرح جاری ہوتا ہے جیسے خون اس کی رگوں میں دوڑتا ہے (مطلب یہ ہے کہ بہت قریب رہتا ہے اور فوراً تصرف کرتا ہے) صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا آپ کے اندر بھی اسی طرح سے اس کا دورہ رہتا ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں میرے اندر بھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے میری مدد فرمائی ہے اور وہ مسلمان ہو گیا ہے یعنی میرا مطیع ہو گیا ہے اس لئے وہ میرے خلاف نہیں کرتا۔

(۳) (ایک نفع یہ ہے کہ) اس کی وجہ سے بلا اور مصیبت میں واقع ہونے سے امن رہتا ہے۔ حضرت جابرؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر کسی عورت پر (اتفاقاً) پڑ گئی آپ اسی وقت اپنے مکان تشریف لائے اور ازواج مطہرات میں سے ایک سے قضاء شہوت فرمائی اور یہ ارشاد فرمایا کہ عورت جب سامنے آتی ہے تو بہ شکل شیطان آتی ہے لہٰذا جب تم میں سے کسی کی نظر کسی ایسی عورت پر پڑ جائے جو اس کو پسند آجائے تو اس کو چاہیئے کہ اپنی بیوی سے قضاء شہوت کرلے۔ (تاکہ قلب ادھر سے فارغ ہو جائے) چنانچہ عبداللہ بن عمرؓ جو کہ زہاد اور علماء صحابہ میں سے تھے وہ کبھی کبھی افطار ہی جماع سے فرماتے تھے تاکہ قلب عبادت کے لئے فارغ ہو جائے اسی لئے مستحب ہے کہ نماز سے پہلے آدمی اپنے قلب کو جملہ کاروبار سے فارغ کرلے۔ نیز ابن عمرؓ ہی سے منقول ہے کہ وہ ماہ رمضان میں (مغرب کے بعد) عشاء تک تین عورتوں کو خوش کرتے تھے۔ یعنی ان سے قضاء شہوت فرماتے تھے۔

چنانچہ اسی فائدہ کے پیش نظر ایک سے زائد عورتوں سے نکاح کرنا مستحب ہے جبکہ ایک سے فراغت قلبی نہ حاصل ہوتی ہو۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے امت کا بہترین شخص وہ ہے جس کی بیویاں کئی ہوں۔

اہل عرب میں شہوت بہت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ میں صلحاء بھی کئی کئی نکاح کرتے تھے چنانچہ صحابہ میں بہت حضرات ایسے ہوئے ہیں جو کہ تین تین اور چار چار بیویاں رکھتے

تھے اور ان لوگوں کی تعداد تو بہت کم تھی جن کے دو سے بھی کم بیویاں رہی ہوں۔

(ادب) اگر کسی بیوی سے محبت اور الفت نہ پیدا ہو تو بہتر ہے کہ اس کو علیحدہ کردے اور دوسری عورت سے نکاح کرے (کیونکہ قلت محبت و مناسبت قلت ولادت کا ذریعہ بنے گی جو خلاف منشاء خدا اور رسول ہے ۴)۔

بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت حسن بن علیؓ نے بکثرت نکاح کئے۔ مجموعی اعتبار سے تقریباً دو سو عورتیں (مختلف زمانوں میں) آپ کے نکاح میں رہیں۔ چنانچہ کبھی ایسا بھی ہوا کہ چار چار عورتوں سے ایک ہی عقد میں نکاح فرمایا اور ایسا بھی ہوا کہ چاروں عورتوں کو ایک ہی مرتبہ طلاق دیتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ حسن میرے مشابہ ہیں صورت شکل میں بھی اور سیرت (یعنی چال ڈھال اور خصائل) میں بھی۔ ایک روایت میں یہ فرمایا کہ حسن محمد سے مشابہ ہیں اور حسین، علی سے۔ اللہ تعالیٰ ان سب حضرات سے راضی ہو۔

(احقر مترجم عرض کرتا ہے کہ عجب نہیں کہ حضرت حسنؓ کی یہی صورۃ اور سیرۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشابہت۔ اس زمانہ کی عورتوں کے لئے آپ کی جانب کشش کا سبب بنی ہو۔ یہ جذب حسن محمدی ہے دلوں کو امت کے کھینچتی ہے۔ چنانچہ حضرت حسنؓ نے اپنے اخلاق کریمانہ سے بیش از بیش عورتوں کو اس کا موقع بھی دیا۔ باقی شریعت میں چونکہ چار سے زیادہ عورتیں بیک وقت نکاح میں رکھنا جائز نہیں ہے۔ اس لئے دفعتاً چار چار سے نکاح اور چار چار سے طلاق کی نوبت آئی ورنہ تو اس کا منشاء معاذ اللہ نہ شہوت تھی اور نہ بد خلقی۔

همه آهوان صحرا سر خود نهاده برکف
بامید آنکه روزے به شکار خواهی آمد

لواحی زلیخا لورائن جبینه
لاثرن بالقطع القلوب علی الید

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ حضرت یوسفؑ کو دیکھ کر زلیخا کی عورتوں نے تو صرف اپنی انگلیاں ہی کاٹ لی تھیں۔ اگر کہیں میرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے رخ انور کی انہیں زیارت ہو جاتی تب تو شاید وہ اپنے قلوب ہی کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتیں۔ اور قرین قیاس ہے کہ اسی غرض سے حضرت حسنؓ کے کثرت نکاح کے ذکر کے بعد ہی حضرت شیخ دہلویؒ نے ان کے شباہت بالنبیؐ کو بیان فرمایا ہو۔ واللہ تعالیٰ اعلم)

اسی طرح سے امیر المومنین حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ کی وفات کے سات ہی دن کے بعد نکاح فرمالیا تھا اور چار عورتیں آپ کے نکاح میں تھیں اور ستر باندیاں حضرت کی مملوکہ تھیں۔ (باندی سے جماع کرنے کے لئے نکاح کی حاجت نہیں ہے)

الغرض نکاح کی کمی اور زیادتی کا دارومدار انسان کی حاجت اور اس کی قوت شہوت پر ہے کیونکہ علاج بقدر مرض ہی کے ہوا کرتا ہے اور مقصد اس سے نفس کا سکون اور قلبی فراغت ہے۔ پس جس کا یہ مقصد ایک ہی نکاح سے حاصل ہو جائے وہ ایک کرے اور جس کا نہ ہو وہ زیادہ نکاح بھی (حدود شرع کے اندر اندر) کر سکتا ہے۔

(۴) نکاح کا ایک نفع یہ ہے کہ اس سے انسان کے نفس کو راحت اور طبیعت کو سکون حاصل ہوتا ہے شریک حیات کے پاس اٹھنے بیٹھنے سے نیز اس کو دیکھنے سے اور اس کے ہنسنے بولنے سے ہر ایک کو دوسرے سے تقویت پہونچتی ہے اور نفس عبادت پر خوب چاق و چوبند ہو جاتا ہے اس لئے کہ عبادت میں نفس کی مخالفت ہوتی ہے اور نفس کو ہمیشہ عبادت ہی میں خواہی نخواہی مشغول رکھنا اس کے کلال و ملال کا سبب بنتا ہے لہٰذا کسی کسی وقت نفس کو بھی خوش کر دینا اس کے فرحت و نشاط کا ذریعہ ہے۔ اور عجب نہیں کہ بعض اوقات میں نماز کو جو مکروہ فرما دیا گیا (مثلاً بعد العصر نفل منع ہے) یا تفریح (آرام) اور قیلولہ کو جو سنت قرار دیا گیا ہے یعنی دوپہر کے وقت قیلولہ سنت ہے اور نماز بھی مکروہ ہے تو راز اس میں یہی ہو گا کہ ان اوقات میں عبادت سے چھوٹ کر نفس کو کچھ راحت اور خوشی حاصل ہو تاکہ اس کے بعد وہ جدید نشاط اور مزید انبساط کے ساتھ عبادت کر سکے۔ بس یہی مقصد مشروعیت نکاح سے بھی ہے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ رَوِّحُوا الْقُلُوْبَ سَاعَةً فَاِنَّهَا اِذَا اُكْرِهَتْ عَمِيَتْ۔ یعنی قلب کو گھڑی بھر کے لئے آرام بھی پہونچاؤ اس لئے کہ اگر اس سے زبردستی کام لو گے تو وہ اندھا ہو جائے گا۔

حدیث شریف میں ہے کہ صحابہؓ کی ایک جماعت دولت کدۂ نبوی پر باہر قریب ہی تجارت آخرت میں حصول نفع کے متعلق باہم گفتگو کر رہی تھی۔ ایک نے کہا کہ بھائی میں تو تمام رات اب سے جاگا کروں گا۔ دوسرے نے کہا اب سے میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا۔ تیسرے نے کہا کہ میں بیوی کے پاس آج سے نہ جاؤں گا۔ یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے سن کر تشریف لائے اور دریافت فرمایا کہ تم لوگ کیا کہہ رہے تھے؟ خدا کی قسم میں تم سب لوگوں سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک متقی اور پرہیزگار ہوں (خدا کا ڈر بھی مجھے تم سے زیادہ ہے) بایں ہمہ میرا حال ہے کہ میں تو افطار بھی کرتا ہوں اور روزہ بھی رکھتا ہوں۔ شب میں نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں۔ اور عورتوں کے پاس بھی جاتا ہوں۔ غلو اور زیادتی ہر کام کی بری ہے۔ مطلب یہ کہ تم لوگ جو ایسی ایسی عبادتوں کا ارادہ رکھتے ہو (اور اس کے لئے اتنی مشقت برداشت کرنا چاہتے ہو یہ) مناسب نہیں ہے۔ اس کی وجہ سے نفس عبادات ضروریہ (فرائض و واجبات) میں بھی تکاسل کرے گا۔ (پس ایک جانب اگر نفع ہوا تو دوسری جانب نقصان کر لیا ایسی تجارت سود مند نہیں) نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ حُبِّبَ اِلَیَّ مِنْ دُنْیَاکُمْ ثَلٰثٌ الطِّیْبُ وَ النِّسَاءُ وَقُرَّۃُ

عَیۡنِیۡ فِیۡ الصَّلٰوۃِ۔ یعنی مجھے تمہاری دنیاوی چیزوں میں سے بس تین چیزیں پسند ہیں۔ خوشبو۔ عورتیں اور نماز تو میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہی ہے۔ یعنی نماز میں چونکہ رب العالمین کے دربار کی حاضری ہوتی ہے اس لئے وہ تو غایت فرحت کا سبب ہے۔

نکاح کا یہ فائدہ جو بیان کیا گیا (یعنی نفس کا خوش ہونا اور عبادت پر مزید قوت حاصل ہونا یہ) اولاً تو ہر شخص کے لئے عام نہیں ہے اس لئے کہ ایسے لوگ بہت کم ہیں جن کا مقصد نکاح سے مذکورہ بالا فائدے کی تحصیل ہو۔ عام طور سے لوگوں کا قصد نکاح سے اپنی شہوت ہی کا دفع کرنا ہوتا ہے۔ ثانیاً یہ فائدہ (یعنی انبساط نفس اور تقویٰ علی الطاعۃ یہ) کچھ نکاح ہی میں منحصر نہیں ہے۔ بہت سے ایسے لوگ ہیں کہ پانی (دریا سمندر) اور سبزہ (باغ و مناظر وغیرہ) ہی کو دیکھ کر اپنا دل خوش کر لیتے ہیں (اور طبیعت میں تازگی آجاتی ہے) بس یہ لوگ انشراح وانبساط نفس حاصل کرنے کے لئے مصاحبت بالنساء (عورتوں کی مصاحبت) کے محتاج نہیں۔ حاصل یہ کہ نفس کی خوشی کا ایک ہی ذریعہ نہیں ہے بلکہ اشخاص اور احوال کے اختلاف سے یہ مختلف ہو سکتا ہے کسی کو کسی سے راحت ہے کسی کو کسی سے مسرت ہے۔

(۵) ایک فائدہ نکاح کا یہ ہے کہ فراغت قلبی کا سبب ہے یعنی قلب گھر کے کاروبار۔ نیز کھانے پکانے کی فکر سے فارغ ہو جاتا ہے کیونکہ اگر اپنے کھانے پکانے کا بوجھ خود اپنے سر رہے تو انسان اکثر اوقات فکر مند ہی رہے اور تمام وقت اسی کے چکر میں گزر جائے۔ پس زوجہ صالحہ انسان کے لئے اس کے دین میں معین ہے نہ کہ مخل۔

اسی لئے ابو سلیمان دارانی ؒ نے فرمایا ہے کہ اَلزَّوۡجَۃُ الصَّالِحَۃُ لَیۡسَتۡ مِنَ الدُّنۡیَا فَاِنَّھَا تُفَرِّغُکَ لِلۡاٰخِرَۃِ۔ یعنی نیک بیوی دنیا نہیں ہے (بلکہ دین ہے) اس لئے کہ اس کی وجہ سے تمہیں امور آخرت کا انجام دینا آسان ہو جاتا ہے اور اس کا موقع ملتا ہے۔ اور مفسرین نے تو آیۃ رَبَّنَا اٰتِنَا فِیۡ الدُّنۡیَا حَسَنَۃً کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ حَسَنَۃً سے مراد زوجہ صالحہ ہے۔ حضرت عمرؓ فرماتے تھے کہ (اس دنیا میں) ایمان کے بعد زوجہ صالحہ سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں۔ نیز حدیث میں آیا ہے کہ (فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے) کہ میری فضیلت حضرت آدم علیہ السلام پر دو وجہ سے ہے۔ ایک یہ کہ ان کی بیوی ان کے لئے سبب لغزش بنی۔ اور میری بیویاں (الحمدللہ) میرے لئے طاعت پر معین ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کا شیطان کافر تھا اور میرا شیطان مسلمان ہو گیا ہے۔

نکاح کا یہ فائدہ بھی عام نہیں ہے بلکہ انہیں لوگوں کے ساتھ مخصوص ہے جن کی ضروریات اور امور کا کوئی انجام دینے والا نہ ہو تو بیشک بیوی سے اس کو نفع پہونچے گا لیکن جو لوگ ایسے نہ ہوں ان کو نکاح سے یہ فائدہ تو حاصل نہ ہوگا۔

(حکمت) اگر اس فائدہ کی تحصیل منظور ہو تو اس کے لئے دو یا دو سے زیادہ عورتوں سے نکاح کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ تعدد نکاح سے اکثر گھر بجائے بننے کے بگڑہی جاتا ہے اور کثرت ازواج بالعموم رنج و ملال کا سبب بنتا ہے اور کہیں اس کے خلاف نظر آئے تو وہ شاذ و نادر ہے۔

(۶) ایک فائدہ نکاح سے یہ ہے کہ اس کی وجہ سے نفس کا خوب ہی مشاہدہ اور پوری ریاضت ہو جاتی ہے۔ کیونکہ بال بچوں اور اہل خانہ کی کج فہمی۔ بدخلقی اور اذیتوں سے جو تکلیف پہونچتی ہے آدمی کو ان پر صبر کرنا ہی پڑتا ہے۔ اسی طرح سے ان سب کے احوال کی خبر گیری کا اہتمام کرنا ہوتا ہے (جس کے لئے کبھی حکیم ڈاکٹر کے یہاں بھی دوڑنا پڑتا ہے جو کہ مستقل مجاہدہ ہے) نیز ان کے کھانے پینے۔ پہننے اوڑھنے اور رہنے کے سلسلہ میں اسباب معاش کی فراہمی کا مسئلہ جیسا کچھ صبر آزما ہوتا ہے ظاہر ہے۔ اور ایذا ہو یا مصیبت ان کے برداشت کرنے میں بڑا اجر ہے اور بہت ہی ثواب ملتا ہے۔ اس کی بہت فضیلت آئی ہے اور صبر کا مرتبہ تو بہت بلند ہے جس کو یوں سمجھو کہ اولوالعزم پیغمبروں کے پسندیدہ اخلاق اور ان کی خصال حمیدہ میں سے یہ صبر ایک اعلیٰ خلق اور بہترین خصلت ہے۔

مروی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت سیدنا یوسف علیہ السلام کے یہاں بہت مہمان آگئے (آپ ان کی خاطر مدارات کے لئے بار بار گھر میں تشریف لے جاتے تھے) ان لوگوں نے محسوس کیا کہ جب بھی آپ اندر سے باہر تشریف لاتے ہیں تو چہرہ پر رنج کے آثار پائے جاتے ہیں اور آپ انتہائی صبر و ضبط اور سکوت و سکون اختیار فرمائے ہوتے ہیں۔ وہ حضرات اس پر متعجب ہوئے حضرت یوسفؑ نے فرمایا کہ تعجب نہ کرو۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی تھی کہ یا اللہ جو بلا یا عذاب مجھے آخرت میں کرنے والے ہوں وہ مجھے یہیں دنیا میں کرلیجئے کیونکہ آخرت کے عذاب کا تحمل مجھے نہیں ہے۔ پس حکم ہوا تمہارا عذاب بس یہی ہے کہ فلاں کی بیٹی سے نکاح کرلو چنانچہ میں نے اس سے نکاح کرلیا اور اب یہ اس کی ایذاؤں پر صبر کر رہا ہوں۔

نیز صبر کرنے کی وجہ سے نفس میں انکسار پیدا ہوتا ہے اور اخلاق میں تعدیل ہو جاتی ہے اس لئے کہ انسان تنہا رہے یا اچھے لوگوں کے ساتھ رہے تو اس میں اس کا باطنی خبث زائل نہیں ہوتا۔ اور نفس کے عیوب مخفی ہی رہتے ہیں (لیکن جن لوگوں سے ایذا پہونچے ان کی صحبت میں بیٹھنے اور ان کی ایذاؤں پر صبر کرنے سے نفس کی خباثت بھی دور ہوتی ہے اور اپنے رذائل کا اندازہ ہوتا ہے۔ رہے نیک لوگ تو ان کی صحبت سے گو دوسرے فائدے ہوں یہ فائدہ نہیں ہوتا) لہٰذا جو شخص طالب راہِ خدا ہے اس پر واجب ہے کہ اپنے نفس کو ایسی ریاضت اور مجاہدے میں ڈالے جس میں رہ کر اس کو صبر کی عادت پڑے۔ اخلاق اس کے معتدل ہوں اور نفس مرتاض ہو۔ لیکن نکاح کا یہ فائدہ بھی انہی لوگوں کے ساتھ مخصوص ہے جو مجاہدے کی راہ چلتے ہیں اور خلقی طور پر حسن خلق کے

متصف نہیں ہیں اور انہیں اس سے پہلے ریاضت کا بھی اتفاق نہیں پڑا۔ لیکن جو لوگ حسن خلق کے ساتھ فطرتاً متصف ہیں یا اور کسی ذریعہ سے ریاضت اور مجاہدہ کر کے انہوں نے اپنے نفس کو حسن خلق سے متصف بنالیا ہے۔ اب چونکہ نکاح سے ان کو یہ مقصد حاصل کرنا ہی نہیں ہے اس لئے ان کے لئے اس غرض سے نکاح مفید نہیں بلکہ ان کے حق میں تو علوم میں غور و فکر کرنا اور عبادات کے ذریعہ نفس سے مجاہدہ کرنا کافی ہے۔

(۷) اور نکاح کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس کی وجہ سے انسان اپنے اہل و عیال پر حاکم ہو جاتا ہے اور ماتحتوں کے حقوق کی ادائیگی کی فکر اس میں پیدا ہو جاتی ہے اور اس کا سلیقہ آجاتا ہے چنانچہ ان کے لئے رزق حلال کی تحصیل کے لئے کوشش کرتا ہے اور ان کی تعلیم و تربیت کرنے نیز دین کی راہ بتانے اور سمجھانے میں مشغول رہتا ہے اور اہل و اولاد چونکہ (بمنزلہ) اس کی رعیت (کے) ہوتی ہے اور یہ ان کا حاکم ہے لہٰذا یہ شخص ان کی جو رعایت کرے گا اور ان کے معاملہ میں جو عدل کرے گا اس میں اسے بڑا ثواب ملے گا اس لئے کہ عدل و انصاف کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ کسی حاکم عادل کا ایک ساعت کے لئے عدل کرنا ستر برس کی عبادت سے افضل ہے چنانچہ اسی (عدل کے فضل) کی وجہ سے حاکم عادل کی بہت بہت فضیلتیں احادیث میں آئی ہیں اور ظاہر ہے کہ جو شخص صرف اپنے ہی نفس کی درستگی میں مشغول ہو اور وہ شخص جو اپنی درستگی کے ساتھ ساتھ خدمت خلق بھی کرتا ہے یہ دونوں کیسے برابر ہو سکتے ہیں اور کیسے برابر ہو سکتے ہیں وہ دو شخص کہ ایک ان میں سے فارغ البال ہو اور دوسرے کو برابر لوگوں کی ایذاؤں سے سابقہ پڑتا ہو اور وہ اس پر صبر کرتا ہو۔

نیز اہل و عیال کی خبر گیری بمنزلہ جہاد کے ہے اور جہاد کی جیسی کچھ فضیلت آئی ہے معلوم ہی ہے اسی وجہ سے حق تعالیٰ سبحانہ' نے قرآن کریم میں صرف انہیں انبیاء علیہم السلام کا تذکرہ کیا ہے جن کی بیویاں تھیں (اور اگر کسی کو یہ شبہہ ہو کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے متعلق تو قرآن شریف میں حَصُوراً آیا ہے۔ جس کے معنی ہیں عورت سے یکسو رہنے والے کے اور اس کے باوجود ان کا ذکر قرآن پاک میں ہے تو جواب اس کا یہ ہے کہ) حضرت یحییٰ علیہ السلام نے بھی نکاح کیا تھا اور نیت ان کی اس سے محض ثواب آخرت اور نکاح کی فضیلت کا حاصل کرنا تھا چنانچہ انہوں نے صحبت نہیں کی (پس ان کو حصور کہنا بھی صحیح ہوا اور وہ قاعدہ بھی سالم رہا) باقی انبیاء مرسل میں جو مجرد تھے مثلاً سیدنا عیسیٰ علیہ السلام تو ان کے متعلق روایات میں آتا ہے کہ قیامت کے قریب جب وہ آسمان سے اتریں گے تو وہ نکاح بھی کریں گے اور ان کے اولاد بھی ہوگی۔

بشیر بن حارث کہتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل کو مجھ پر تین جہت سے فضیلت حاصل ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ مال حلال اپنے لئے بھی حاصل کرتے ہیں اور غیروں کے لئے بھی اور میں تنہا اپنے ہی

لئے کرتا ہوں۔ دوسرے یہ کہ وہ وسعت رکھتے ہیں نکاح میں اور میں تنگی کرتا ہوں۔ تیسرے یہ کہ وہ خلق کثیر کے امام ہیں اور میں اپنے نفس ہی کو ٹھیک کرنے میں لگا ہوا ہوں۔ مروی ہے کہ ایک عابد نے ایک عالم سے کہا کہ حق تعالیٰ نے ہر نیک عمل سے مجھے حصہ نصیب فرمایا ہے۔ چنانچہ حج۔ جہاد اور بہت سے نیک اعمال کو بیان کیا یعنی یہ کہا کہ یہ نیک عمل مجھے نصیب ہوئے ہیں اس عالم نے کہا کہ اور ابدال کے عمل سے تو تم اب تک غافل ہی ہو یعنی اس کو تم نے حاصل نہیں کیا اور نہ اس فہرست میں اس کا نام آیا (حالانکہ وہ بڑا عمل ہے) عابد نے کہا ابدال کا عمل کونسا؟ عالم نے کہا کہ اپنے اہل و عیال کے نفقہ کے لئے رزق حلال حاصل کرنا (اور ظاہر ہے کہ نفقہ وہ حاصل کرے گا جو اہل و عیال والا ہو یعنی جس نے نکاح بھی کیا ہو گا اور تم نے اپنی فہرست میں اس کا تو تذکرہ ہی نہیں کیا) علماء نے بیان فرمایا ہے کہ متاہل کی عبادت مجرد شخص کی عبادت سے ستر درجہ افضل ہے کسی نے حضرت ابراہیم بن ادہم سے کہا کیا ہی عمدہ تمہارا حال ہے کہ تم نے اہل و عیال کا جھگڑا نہ پال کر اپنے کو عبادت کے واسطے فارغ کر لیا۔ حضرت ابراہیم نے فرمایا کہ عیال کے سبب سے تمہیں ایک غم اور ایک فکر جو کبھی حاصل ہو وہ میری سب عبادتوں سے بہتر ہے (سبحان اللہ! دیکھئے یہ حضرات عمل کی وجہ سے کچھ کرتے تھے لیکن علم صحیح رکھتے تھے اور وقت پر اسے دوسروں کو پہونچا دیتے تھے۔ صحیح مسئلہ بتا دیا اور اپنے خلاف پڑنے کا کچھ بھی خیال نہیں فرمایا)۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جس شخص کی کوئی لڑکی ہو اور وہ اس کی خبر گیری رکھے اور اس پر خرچ کرے تو اس کے لئے بہشت واجب ہو جاتی ہے بشرطیکہ اس نے کوئی ایسا عمل نہ کیا ہو.. قابل بخشش نہ ہو۔ یعنی شرک۔

نیز حدیث شریف میں آتا ہے کہ غم اور مشقت جس کو انسان (دین کے لئے) برداشت کرے وہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہے۔ علماء سلف میں سے بعضوں سے منقول ہے کہ بہت سے گناہ ایسے ہیں کہ بجز عیال کے غم اور ان کے اسباب معیشت کی طلب اور فکر کے ان کا کچھ کفارہ ہی نہیں ہے۔

اور نکاح کا یہ فائدہ بھی ان اہل عبادت کے ساتھ مخصوص ہے جن کے لئے سوائے اعمال ظاہرہ کے یعنی (نماز روزہ مثلاً) اور کوئی شغل اور عبادت نہ ہو اس لئے کہ عیال کی یہ خبر گیری وغیرہ بھی عبادت ہے بلکہ یہ عبادت متعدی ہے اور متعدی عبادت کی فضیلت لازمی عبادت پر ظاہر ہے۔ باقی جس شخص کو سیر باطن۔ تفکر علوم اور مکاشفات وغیرہ حاصل ہوں اس کے حق میں یہ فائدہ متصور نہیں اس لئے کہ علم بھی عبادت ہے بلکہ افضل عبادات ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ علم دین کا سیکھنا اور سکھانا نفل عبادت سے بھی افضل ہے (نیز علم کا نفع متعدی بھی ہے) اس لئے کہ وہ تمام مخلوق کو عام ہے اور اہل و عیال کے نفقہ کی فراہمی سے افضل ہے۔

(۸) ایک فائدہ نکاح کا یہ بھی ہے کہ اس کی وجہ سے انسان کا کنبہ اور قبیلہ بڑھ جاتا ہے اور ان سے اس کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ عزت بڑھتی ہے اور ذلت دور ہوتی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ یہ امور دفع شر اور حصول سلامتی وعافیت کے اسباب میں سے ہیں۔ چنانچہ علماء نے فرمایا ہے کہ ذَلَّ مَنْ لَا انَا صِرَلَهٗ یعنی ذلیل ہوا وہ جس کا کوئی حامی مددگار نہ ہو۔ نیز یہ چیزیں فراغت قلب اور جمعیت خاطر کا بھی ذریعہ بنتی ہیں۔

جاننا چاہیئے کہ نکاح کے جتنے فوائد اوپر مذکور ہوئے ان میں سب لوگوں کے حق میں عام اور مفید جو فائدہ ہے وہ یہ کہ نکاح تحصیل اولاد کا ذریعہ ہے۔ اور حصول عفت کا سبب ہے باقی نکاح میں جہاں فوائد ہیں وہاں آفات بھی ہیں مثلاً۔

(۱) ایک آفت نکاح میں یہ ہے کہ آدمی (نان ونفقہ کے لئے) کسب حلال سے عاجز ہو جاتا ہے۔ کیونکہ حلال روزی کا حاصل کرنا بہت دشوار ہے بالخصوص اس زمانہ میں کہ اکثر احکام شرع ہی مفقود ہیں اور جو باقی بھی ہیں ان میں حدود کی حفاظت مشکل ہے۔ پس نکاح گویا حرام میں واقع ہو جانے کا سبب بن جاتا ہے اور اس امر کا اس کے لئے نیز اس کے اہل وعیال کے لئے مہلک ہونا ظاہر ہے اور جو شخص مجرد ہے وہ اس بلا سے محفوظ ہے۔ اور اس کا مصداق ہے کہ :

ما ہیچ نہ داریم غم ہیچ نداریم
دستار نداریم غم پیچ نداریم

حدیث شریف میں آیا ہے کہ قیامت میں سب سے پہلے جس چیز سے سابقہ پڑے گا وہ انسان کے اہل اور اولاد ہوں گے۔ ان کو حق تعالیٰ کے سامنے کھڑا کیا جائے گا اور وہ لوگ فریادی ہوں گے عرض کریں گے کہ یا خدایا ہمارا حق ان سے دلوا۔ اس نے ہم کو احکام دین کی تعلیم نہیں کی تھی۔ نیز ہم کو مال حرام سے کھلایا تھا اور ہم اس سے قطعی بے خبر تھے۔ نیز حدیث شریف میں یہ بھی آیا ہے کہ ایک شخص کے پاس پہاڑوں نیکیاں ہوں گی لیکن جب اس کے اہل وعیال کے حقوق کی ادائیگی کا سوال ہو گا اور کسب مال کی تحقیق کی جائے گی کہ حرام تھا یا حلال تو اسی مطالبے میں اس کی تمام نیکیاں ختم ہو جائیں گی اور فرشتے ندا کریں گے کہ لوگو دیکھو یہ وہ شخص ہے کہ اس کے اہل وعیال اس کی سب نیکیاں لے گئے۔ نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قیامت کے دن آدمی کے لئے کوئی گناہ اپنے اہل وعیال کو جاہل رکھنے سے بڑھ کر نہ ہو گا۔ یعنی اگر اپنے اہل وعیال کو دین کی تعلیم نہیں دی اور جاہل رہے تو یہ اس کے حق میں بہت بڑا گناہ شمار ہو گا۔

نکاح کی یہ آفت ایک آفت عظیم ہے۔ اس سے نجات پانے والے کم ہی لوگ ہوئے ہیں یعنی وہی نجات پا سکتا ہے جو حلال مال رکھتا ہو اور کھاتا ہو اور اس پر قناعت کرتا ہو یا کوئی پیشہ اختیار کئے ہوئے ہو مثلاً لکڑیاں کاٹنا یا شکار کرنا وغیرہ مگر ایسا کوئی حرفہ نہ ہو جس کا تعلق ظالموں اور

بادشاہوں کا ہو۔ مروی ہے کہ کسی درزی نے ایک بزرگ سے پوچھا کہ حضرت میں بادشاہ کا کپڑا سیتا ہوں آیا اس کی وجہ سے میرا شمار ظالموں کے مددگاروں میں سے تو نہیں ہو گا۔ انہوں نے فرمایا کہ ظالموں کا مددگار تو وہ ہے جو تیرے ہاتھ سوئی اور دھاگہ بیچے اور تو تو عین ظالم ہے۔

کہتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت سفیان ثوریؒ کو بادشاہ کے دروازے پر بیٹھے دیکھا۔ کہا کہ حضرت یہ کون سی جگہ بیٹھنے کی ہے۔ فرمایا کہ بھائی کسی شخص نے کبھی عیال میں فلاح نہیں دیکھی۔ مطلب یہ تھا کہ اہل و عیال کی خبر گیری اور ان کے نان نفقہ کی فکر نے مجھے اس بلا میں گرفتار کیا ہے چنانچہ اسی آفت کے خیال سے علماء نے فرمایا ہے کہ اب ہمارے زمانہ میں افضل مجرد ہی رہنا ہے۔

(فائدہ) عبداللہ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص جنگل میں رہتا ہے وہ سخت دل ہو جاتا ہے اور یہ اس لئے کہ لوگوں سے اختلاط نہ ہونے کی وجہ سے قلب کا انس اس سے ختم ہو جاتا ہے۔ اور جو شخص شکار کے در پے رہتا ہے وہ غافل ہو جاتا ہے یعنی طاعات کا اہتمام اس سے ختم ہو جاتا ہے اور اس کے قلب سے رقت اور رحم کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور جس شخص نے سلاطین کے پاس آمد و رفت رکھی وہ فتنہ میں پڑ گیا۔ کیونکہ اگر ہر معاملہ میں اس کی موافقت کرتا ہے تو یہ اس کے دین و ایمان کے لئے مضر ہے اور اگر کبھی مخالفت کرتا ہے تو جان کا خطرہ ہے۔ اس حدیث کو احمد۔ ترمذی اور نسائی نے روایت کیا ہے اور ابوداؤد میں ہے کہ جو شخص سلطان کا ہم نشین ہوا وہ مفتون ہوا اور جو شخص سلاطین سے جس قدر نزدیک ہوا۔ اللہ تعالیٰ سے اسی قدر دور رہا۔ (کذا فی المشکوٰۃ)

(۴) نکاح سے ایک نقصان یہ ہے کہ آدمی بیوی کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی کرتا ہے اور اس کے کج خلقی اور بد مزاجی پر صبر کرنے میں پورا نہیں اترتا۔ یہ بھی محل خطر ہے اس لئے کہ قیامت میں ہر شخص سے اس کی رعیت کے حقوق اور حالات کا سوال ہو گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ۔ یعنی تم میں سے ہر شخص راعی (یعنی نگراں) ہے اور تم سب سے اپنی اپنی رعیت کے متعلق (قیامت میں) سوال ہو گا۔

(فائدہ) پوری حدیث جس کو مشکوٰۃ میں بخاری و مسلم کے حوالہ سے نقل کیا ہے یوں ہے۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ خبردار ہو جاؤ کہ تم سب کے سب اپنی اپنی رعیت کے نگہبان ہو اور تم سب سے اس کے متعلق سوال ہو گا۔ امام (خلیفہ) لوگوں یعنی (رعایا) کا نگہبان ہے لہٰذا اس سے رعایا کی نگہبانی کے متعلق سوال ہو گا۔ مرد اپنے گھر والوں کا نگراں ہے پس اس سے اپنی رعیت کے حقوق کا سوال کیا جائے گا۔ عورت اپنے شوہر کے گھر کی اور اس کی اولاد کی نگراں ہے پس ان سب کے حقوق کی ادائیگی کا سوال ہو گا۔ غلام (خادم) اپنے مالک کے مال اور سامان کا محافظ ہے لہٰذا اس سے اس کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ غرض تم سب لوگ نگہبان ہو اور تم سب سے

اپنی اپنی رعیت کا سوال ہوا گا۔ انتہیٰ۔

راعی کہتے ہیں نگہبان اور امانت دار کو پس جو شخص جن شخصوں پر راعی مقرر کیا گیا ہے اس کو لازم ہے کہ ان کا پورا پورا حق ادا کرے اور یہ چیز بطور قدر مشترک سب صنفوں میں موجود ہے۔ اگرچہ حقوق کی نوعیت ان سب میں مختلف ہے۔ اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام لوگوں کو نصیحت فرمائی ہے جن کے ماتحت کچھ لوگ ہوں (یا جن کے تصرف میں کچھ چیزیں ہوں) کہ وہ اس کے حقوق کی رعایت رکھیں اور کوتاہی پر تنبیہہ فرمائی ہے کہ قیامت میں حق تعالیٰ کے سامنے اس کا جوابدہ ہونا پڑے گا۔ یہیں سے علماء نے فرمایا ہے کہ ہر شخص اپنے اعضاء (یعنی ہاتھ۔ پاؤں۔ کان۔ زبان۔ آنکھ۔ وغیرہ) اور اپنے حواس (سامعہ باصرہ لامسہ وغیرہ) پر بھی نگراں ہے اور اس سے قیامت میں ان کے متعلق یہی سوال ہو گا کہ کہاں استعمال کیا۔ اور کیونکر استعمال کیا۔ باقی چونکہ یہ بالکل ظاہر تھا اس لئے حدیث میں اس کو ذکر نہیں فرمایا (کذا قال الشیخ عبدالحق و سید جمال الدین فی شرح المشکوٰۃ)

اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ اہل و عیال سے بھاگنے والا یعنی اس کی کوئی عبادت (نماز۔ روزہ و حج وغیرہ) نہیں قبول ہوتی۔ یہاں تک کہ گھر واپس نہ آجائے چنانچہ اہل و عیال کے حقوق میں کوتاہی کرنے والا بھی اگرچہ موجود ہے لیکن حقیقت میں غائب ہونے والے ہی کے حکم میں ہے یعنی بمنزلہ بھاگے ہوئے غلام کے ہے اور یہ ظاہر ہے کہ کچھ نہ کچھ کوتاہی تو ناگزیر ہے کیونکہ انسان اپنے ہی نفس کا حق ادا کرنے سے عاجز ہے تو دوسروں کا حق وہ غریب پورا پورا کیا ادا کر سکے گا۔ چنانچہ بعضے مشائخ مثلاً ابراہیم ادہمؒ یا بشیر ابن حارثؒ نے جو تجرد اختیار کیا اور نکاح نہیں کیا ان کا یہی عذر تھا۔ (یعنی ڈرے کہ ہم حقوق ادا نہ کر سکیں گے اور مفت میں قیامت میں پکڑے جائیں گے)۔

اور یہ (دوسری) آفت اگرچہ فی نفسہ بڑی ہے لیکن پہلی آفت سے کم ہے اس لئے اپنے اہل و عیال کی بداخلاقیوں پر صبر کر لینا اور ان کے ساتھ گزر بسر کر لینا کسی نیک خلق کے لئے ممکن ہے۔ نیز قلبی ضیق کے باوجود انسان خدا کا خوف کرتے ہوئے ان کے حقوق میں کوتاہی سے بھی بچ سکتا ہے لیکن ہر وقت اور بقدر حاجت آدمی۔ رزق حلال ہی کر لے یہ اس کے اختیار میں نہیں اس لئے یہ آفت پہلی آفت سے بڑھ کر ہے۔

(۳) اور منجملہ آفات نکاح کے ایک یہ آفت ہے کہ اکثر و بیشتر حالات میں اہل و عیال آدمی کو اللہ تعالیٰ سے غافل ہی کر دیتے ہیں اور کسب مال و جمع دولت پر انسان کو مجبور کر کے اسے طالب دنیا بنا دیتے ہیں۔ نیز اسی کا ایک اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی کثرت اولاد پر فخر کرنے لگتا ہے اور ظاہر ہے جو چیز حق تعالیٰ سے غافل کرنے والی ہو اس کے آفت ہونے میں کیا شبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ اَلْمَالُ وَ الْبَنُوْنَ زِیْنَۃُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَ الْبٰقِیٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَیْرٌ

عِنْدَ رَبِّکَ۔ یعنی مال اور اولاد محض دنیوی زندگانی کی زینت ہیں اور نیک اعمال آپ کے پروردگار کے پاس باقی (جمع) رہنے والی چیزیں ہیں۔ اور اس آفت سے ہماری مراد نہیں کہ اہل و عیال ارتکاب حرام کا باعث بنتے ہیں کیونکہ اس کا ذکر تو پہلے ہو چکا ہے بلکہ یہاں ان کے آفت بننے سے مراد یہ ہے کہ جب انسان کے اہل و عیال ہوں گے تو ان کے لئے ہر قسم کے راحت و آرام کی چیزوں کی فراہمی اس کے ذمہ ہو جائے گی اور ان کے ساتھ رہ کر ضرور کچھ نہ کچھ حظوظ و لذائذ میں خود یہ انسان بھی واقع ہو جائے گا اگرچہ وہ مباح ہوں اور یہ مشغولی اس کو فراغت قلب اور دوام ذکر سے یقیناً باز رکھے گی کیونکہ دیکھا جاتا ہے کہ دین میں فتور و قصور جو واقع ہوتا ہے تو اکثر و بیشتر اس کا سبب اہل و عیال ہی بنتے ہیں اس لئے کہ شب و روز آدمی انہی کی فکر میں رہتا ہے جس کے سبب ادھر ادھر کی مشغولی میں اس کا وقت عزیز ضائع ہوتا ہے اور بالآخر یہ ندامت کا باعث بنتا ہے۔ اسی لئے حضرت ابراہیم ادہمؒ نے فرمایا ہے کہ جماعت فقراء (صوفیہ) میں سے جس شخص نے بیوی کے ساتھ سونے کی عادت اختیار کی اس سے (طریق کا) کچھ کام نہ ہو گا۔ اور ابو سلیمان دارانی فرماتے ہیں کہ مَنْ تَزَوَّجَ رَکَنَ اِلَی الدُّنْیَا جس نے نکاح کیا وہ دنیا کی جانب مائل ہوا اور یہ فرمایا کہ اپنے دوستوں میں سے میں نے کسی کو نہیں دیکھا کہ وہ شادی کے بعد اپنے پہلے حال پر باقی رہا ہو۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے جس بندے کو نیکی پہونچانا چاہتے ہیں تو اس کے اہل و عیال اور مال اس کو حق تعالیٰ سے غافل نہیں کر سکتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ آخر زمانہ میں ایک وقت ایسا آئے گا کہ آدمی کی ہلاکت اپنے والدین اور اہل و عیال کے ہاتھوں ہو گی۔ اس طور پر کہ یہ لوگ اس کو اس کی غربت اور محتاجگی پر ملامت کریں گے اور جس چیز کی وہ طاقت نہ رکھتا ہو گا اس سے اس کا مطالبہ کریں گے۔ پس وہ مجبور ہو کر ایسی جگہ جائے گا (یا ایسا کام کرے گا) جو اس کی بربادی دین کا سبب ہو گا۔ پس وہ ہلاک ہو جائے گا۔ نعوذ باللہ من ذٰلک (ہم اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں)

یہاں تک جو کچھ ذکر ہوا وہ نکاح کے فوائد اور اس کے آفات کا بیان تھا اس سے معلوم ہوا کہ ہر شخص کے لئے نکاح کرنے کو مطلقاً افضل کہہ دینا یا تجرد کو مطلقاً افضل کہنا صحیح نہیں ہے بلکہ حق یہ ہے کہ اس میں تفصیل ہے یعنی بعض کے لئے نکاح افضل ہے اور بعض کے لئے تجرد۔ لہٰذا انسان کو چاہیے کہ اس باب میں اولاً اپنی نیت کو خالص کر کے فوائد اور آفات دونوں پر نظر کرے اور اپنے حال کو دیکھ لے تاکہ اپنا نصیب دربارۂ آخرت حاصل کرے باقی توفیق اللہ تعالیٰ کے ہاتھ ہے۔ (مطلب یہ کہ ان مسائل کی روشنی میں اپنے متعلق دیانۃً خود کوئی فیصلہ کرے)۔

(فائدہ) حضرت شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلویؒ نے اس مقام کی نہایت ہی مختصر اور جامع تقریر تحریر فرمائی۔ مسلمان بھائیوں کے نفع کے لئے وہ یہاں لکھی جاتی ہیں۔

فرمایا کہ نکاح میں پانچ فوائد ہیں۔ (۱) شہوت کا کم ہونا (۲) گھر کے نظم کا درست ہونا۔ (۳) کنبہ

اور خاندان کا بڑھنا (۴) اہل و عیال کی خبر گیری کے سلسلہ میں نفس کا مجاہدہ (۵) اولاد صالح کی تحصیل۔

اور آفات نکاح کے چھ ہیں:۔ (۱) حلال روزی کی طلب سے عاجز ہونا (۲) حرام میں تکثیراور بہتات ہونا (۳) بیویوں کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی ہونا (۴) عورتوں کی بداخلاقی پر صبر کے تلخ گھونٹ پینا (۵) اہل خانہ کی جانب سے پیش آنے والی ایذاؤں پر صبر (۶) اہل و عیال کی وجہ سے حقوق اللہ کی ادائیگی سے باز رہنا۔

اہل خانہ کی جانب سے پیش آنے والی ایذاؤں کا برداشت کرنا (یعنی بیوی جب بد خلق ہوتی ہے تو بعض مرتبہ شوہر کے حق میں درپے ایذا بھی ہو جاتی ہے اور اپنے افعال و برتاؤ سے ایسی ایسی حرکتیں۔ بالقصد کرتی ہے جن سے شوہر کو ایذا پہونچے۔ ایذاؤں کے برداشت کرنے سے یہی مراد ہے اور بد خلقی پر صبر سے مراد یہ کہ صرف اخلاق اس کے خراب ہوں مگر ان کی وجہ سے اور کوئی کام نہ کرے کہ جو موجب تکلیف ہوں مثلاً بد مزاج ہے تو غصہ میں آکر کپڑے میں آگ لگادیا یا برتن توڑ دیا) اہل و عیال کی وجہ سے حقوق اللہ کی ادائیگی سے باز رہنا۔

لہٰذا اب اگر کہیں یہ سب فوائد نہ پائے جائیں اور آفات سب جمع ہوں تو وہاں مجرد رہنا افضل ہے اور اگر کسی جگہ دونوں باتیں پائی جائیں اور یکساں طور پر پائی جائیں تو یہ دیکھے کہ جس سے دین کی باتوں میں زیادتی ہو اس کو ترجیح دے۔ مثلاً نکاح کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اس سے شہوت کم ہوتی ہے اور نقصان یہ ہے کہ عورت بداخلاق ہے اور انسان یہ سمجھتا ہے کہ میں اس کی بداخلاقی پر صبر نہ کر سکوں گا تو اس صورت میں ترجیح نکاح ہی کو ہوگی، اس لئے کہ (جب شہوت کا غلبہ ہے تو) اگر نکاح نہ کرے گا تو زنا میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے (اور اس سے بچنا ضروری ہے جو کہ ایک دینی نفع ہے اس لئے نکاح کو ترجیح ہوگی) انتہیٰ تقریرہ

درمختار وغیرہ میں لکھا ہے کہ توقان (یعنی غلبہ شہوت) کے وقت نکاح کرنا واجب ہے اور اگر یہ یقین ہو کہ بغیر نکاح کے زنا میں مبتلا ہو جائے گا تو فرض ہو جاتا ہے اور یہ واجب یا فرض اس صورت میں ہے جبکہ بقدر مہر اور نفقہ کے مال رکھتا ہو۔ اور اگر فقیر ہے کہ مہر اور نفقہ کے لئے مال نہیں تو پھر ترک نکاح میں گناہ نہیں ہے اب اس صورت میں (مطابق علاج نبوی کثرت سے) روزہ رکھ کر شہوت کو ختم کرے۔ اور اگر اعتدال کا حال ہو یعنی انسان جماع پر بھی قادر ہو اور نفقہ کی بھی استعداد رکھتا ہو تو اس صورت میں نکاح کرنا سنت مؤکدہ ہے۔ اب اگر ترک کرے گا تو گنہ گار ہو گا۔ اور نکاح کرنے پر اجر ملے گا۔ اگر زنا سے حفاظت اور تحصیل اولاد کی نیت سے کیا جائے۔ نیز سوائے نکاح اور ایمان کے اور کوئی عبادت ایسی نہیں ہے جو حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے لیکر اب تک (دنیا میں) مشروع رہی ہو اور پھر جنت میں بھی باقی ہو۔ نیز اگر اپنی بد مزاجی اور بد خلقی کے پیش نظر یہ اندیشہ ہو کہ نکاح کروں گا تو ہو سکتا ہے کہ بیوی پر ظلم اور زیادتی ہو جائے تو نکاح نہ کرے۔ اس حال میں نکاح کرنا مکروہ ہے۔ اور ظلم ہو جانے کا یقین ہو تو پھر حرام ہے۔

فصل دوم

(ان آداب اور احوال کے بیان میں جن کی رعایت نکاح میں واجب ہے)

جاننا چاہیئے کہ نکاح کے ارکان اور شرائط جو کہ فقہ کی کتابوں میں بیان کئے گئے ہیں ان کی رعایت تو مقدم ہے ہی مگر اس کے بعد اور بھی کچھ آداب ایسے ہیں جن کی رعایت واجب ہے۔ چنانچہ ان آداب میں سے بعض تو نکاح کرنے والے (یعنی شوہر) سے متعلق ہیں اور بعض زوجہ (بیوی) سے جو اداب و احوال کہ زوج سے متعلق ہیں وہ یہ ہیں کہ نکاح سے قصد اتباع سنت اور اجزائے سنت حصول اولاد اور نامحرموں سے نظر کی حفاظت کا کرے۔ نیز ان تمام فوائد کی تحصیل کی بھی نیت رکھے جو اوپر ذکر کئے جا چکے ہیں تاکہ یہ نکاح منجملہ اعمال آخرت کے ایک عمل ہو جائے اور غرض اس سے محض خواہش نفسانی ہی کا پورا کرنا اور قضاء شہوت نہ رہے کہ یہ سب اغراض دنیوی ہیں اور صحیح نیت کے ضمن میں یہ سب چیزیں حاصل ہو ہی جاتی ہیں پھر اپنی خواہشات (یعنی دنیا) کو اصل کیوں بنادے اس کو حق کے ہی تابع رکھے۔

(ادب) نکاح سے قبل مناسب ہے کہ زوجین ایک دوسرے کے حالات کی تحقیق کر لیں کیونکہ اس کو باہمی شوق و الفت میں بہت دخل ہے۔ اسی لئے نکاح سے پہلے مرد کا عورت کو دیکھ لینا مستحب ہے۔

اور جو آداب و احوال کی زوجہ سے متعلق ہیں اور جن کا پایا جانا موجب عیش اور سبب حصول فوائد نکاح ہیں ان میں سے پہلی چیز یہ ہے کہ یہ دیکھے کہ اس کے ساتھ نکاح کرنے میں کوئی شرعی مانع تو نہیں ہے۔ (مثلاً یہ کہ زوجہ بد دین ہو یعنی اس میں کفر اور رفض تو نہیں ہے) اس کے بعد سب سے اہم یہ ہے کہ عورت عفیف اور پارسا ہو۔ نکاح سے پہلے اس کا لحاظ ضروری ہے بلکہ اس کو مقصود اصلی ہی سمجھنا چاہیئے اس لئے کہ عورت کا دین میں سست ہونا (یعنی غیر پارسا ہونا) یا اس کے چال چلن کا خراب ہونا (یعنی غیر عفیف) ہونا مرد کی روسیاہی اور اس کے عیش کے مکدر ہونے کے کا سبب بنتا ہے اس لئے کہ اس کی غیر عفیفانہ حرکت سے مرد کی بھی عزت و آبرو پر دھبہ آتا ہے اور دوسروں کی پارسا بیبیاں اس کے لئے ہمیشہ باعث رشک ہی رہتی ہیں (جس کے سبب سے ایک دائمی ضیق سے دوچار رہتا ہے) اور اگر بد چلنی کے ساتھ کہیں عورت حسن و جمال سے بھی متصف ہوئی تب تو اور مصیبت ہے کیونکہ اگر اس کو چھوڑتا ہے تو اس کی جدائی پر صبر دشوار ہوتا ہے اور اگر اسکو

اس کی حرکات نازیبا سے روکتا ہے تو دنیوی فتنوں کا شکار ہوتا ہے۔ اور اگر خاموشی اختیار کرتا ہے تو عذاب آخرت میں گرفتار ہوتا ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو شخص کسی عورت سے (محض) اس کے مال و جمال ہی کے سبب سے نکاح کرے گا تو نہ مال ہی پاوے گا اور نہ اس کے جمال ہی سے لطف اندوز ہو گا۔ اور جو شخص کسی عورت سے اس کے دین کی وجہ سے نکاح کرے گا تو وہ مال بھی پاویگا اور جمال بھی (یعنی نیک نیتی کا انجام بخیر ہوتا ہے اور بدنیتی کا انجام بد) اور جس عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہے اس کے اندر جس چیز کی رعایت واجب ہے وہ اس میں حسن خلق اور خصلت نیک کا ہونا ہے اس لئے کہ یہی چیز (شوہر کے لئے قلبی اطمینان اور باہم حسن معیشت کا سبب بنتی ہے۔ کیونکہ بدخلق عورت (دنیا میں) اللہ تعالیٰ کے عذابوں میں سے ایک عذاب ہی ہے۔ اور اس کی مصاحبت (ساتھ) عذاب دوزخ سے کم نہیں۔

زن بد در سرائے مرد نکو
ہم دریں عالم است دوزخ او

یعنی بری عورت جو کسی نیک مرد کے گھر آجائے تو اس دنیا میں وہ اس شخص کے لئے بمنزلہ دوزخ کے ہے۔

زینہار از قرین بد زنہار
وقنا ربنا عذاب النّار

یعنی دیکھو خبردار برے ساتھی سے دور رہنا اور اس سے پناہ مانگنا۔ (اللہ تعالیٰ نے یہ دعا بتائی ہے کہ) اے ہمارے رب ہم کو دوزخ کی آگ سے بچانا۔

ایسی عورت کا ضرر اس کے نفع سے کہیں زیادہ ہے۔ چنانچہ عرب کے لوگ کہتے ہیں لَا تُنْكِحُ اَنَّانَةً وَّلَا مَنَّانَةً وَّلَا حَنَّانَةً وَّلَا حَدَّاقَةً وَّلَا بَرَّاقَةً وَّلَا شَدَّاقَةً

یعنی ان چھ قسم کی عورتوں سے نکاح نہ کیا جائے نہ اس عورت سے جو ہمیشہ روتی چلاتی ہو۔ (کیونکہ یہ اس کی بے صبری کی دلیل ہے) اور نہ اس عورت سے جو اپنے مال کا شوہر پر احسان رکھتی ہو (کیونکہ اس سے معلوم ہوا کہ نہایت کم ظرف اور اوچھے طبیعت کی ہے) اور نہ اس عورت سے جو اپنے پہلے خاوند کی اولاد پر مہربان ہو (یعنی دوسرے خاوند کے مال کو ان پر بے تکلف یعنی بدون اذن شوہر کے خرچ کرے کیونکہ یہ غیر منصف عورت ہے) اور نہ اس عورت سے جو غیروں کو ریجھادے (یعنی اپنی جانب مائل کرکے اس کے ذریعہ) اپنے خاوند کو جلادے (کیونکہ یہ آوارگی کی بات ہے) اور نہ ایسی عورت سے جو ہر وقت بناؤ سنگھار ہی میں لگی رہے (کیونکہ تن آرائی دین سے دور کر دیتی ہے) اور نہ ایسی عورت سے جو زبان دراز اور بڑا بول بولنے والی ہو۔ (کیونکہ یہ اس کے کج خلقی کی دلیل ہے۔

روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت الیاس علیہ السلام کی ملاقات کسی سیاح سے ہوئی آپ نے اس کو نکاح کرنے کا حکم دیا لیکن چار قسم کی عورتوں سے نکاح کرنے سے منع فرمایا۔ ایک وہ جو ہر وقت نفیس و جدید کپڑے ہی طلب کرتی ہو۔ دوسری وہ جو ہروقت اپنے دنیوی سازو سامان پر فخر کرتی ہو۔ تیسری وہ جو آوارہ اور بدکار ہو۔ اور چوتھی وہ جو شوہر کی نافرمان ہو اور اس پر غالب ہو۔

امیر المومنین حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ مردوں کے لئے جو اوصاف برے ہیں وہ عورتوں کے حق میں محاسن شمار ہوتے ہیں۔ مثلاً بخل۔ تکبر اور بزدلی کی یہ سب صفات مردوں کے لئے عیب ہیں لیکن کسی عورت میں ان کا ہونا بہت اچھی بات ہے۔ (اس لئے کہ بخل کی وجہ سے وہ شوہر کی آمدنی نظم کے ساتھ خرچ کرے گی۔ کفایت شعار ہوگی چار پیسے ہروقت کے پاس موجود ہوں گے۔ اسی طرح تکبر کی وجہ سے کسی کو منہ نہ لگائے گی۔ بڑی ہوگی جس کے سبب بہت سے فتنوں سے امن رہے گا۔ بزدلی کی وجہ سے شوخی بے باکی اور جرات نہ ہوگی۔ شوہر کا خوف لگا رہے گا لہٰذا اس کی غیر موجودگی میں اپنی عفت کی حفاظت رکھے گی۔ واللہ تعالیٰ اعلم از مترجم ۱۲)

حضرت علیؓ کا یہ ارشاد ان تمام اخلاق کو جامع ہے جنکا عورتوں میں ہونا مطلوب ہے۔

اور جس عورت سے نکاح کا ارادہ ہو اس میں جن امور کی رعایت ضروری ہے منجملہ اُن کے ایک یہ بھی ہے کہ عورت خوبصورت اور حسین ہو اس لئے کہ اس وصف کو شہوت کی محافظت میں خاص دخل ہے نیز اس کی وجہ سے باہم زوجین میں الفت و محبت بھی خوب ہوتی ہے اور انتظام معاش بھی اس کی وجہ سے درست رہتا ہے۔ اور غالب حال تو یہی ہے کہ حسن سیرت کے لئے حسن صورت لازم ہی سی ہے (ع کہ معنی بود صورت خوب را) یعنی اکثر یہی دیکھا جاتا ہے کہ جو عورت خوبصورت ہوتی ہے تو خصلتیں بھی اس کے اندر اچھی ہی پائی جاتی ہیں۔ یعنی اخلاق اس کے اچھے ہوتے ہیں۔ اور وہ جو حدیث میں آیا ہے کہ عورت سے بسبب اس کے جمال کے نکاح نہیں کیا جائے گا تو اس کا مطلب یہ ہے محض جمال کی رعایت نہ کرے اس طرح پر کہ حسن خلق اور دینداری کو نظرانداز ہی کردے۔ باقی اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حسن و نیک خصال۔ دیندار ہوتی ہے وہ الفت اور محبت کا ذریعہ ہوتی ہے اور اس کی تحصیل نیکی اور دین کے اعمال میں شمار ہوتا ہے چونکہ یہ وصف سبب الفت و محبت بنتا ہے اس لئے اس کی رعایت بھی مستحب ہے۔ اسی لئے نکاح سے قبل عورت کو دیکھنا مستحب ہے اور (ظاہر ہے کہ یہ دیکھنا صورت و شکل ہی سے متعلق ہے۔ کیونکہ کسی کے حسن خلق اور خصلت و عادت کا اندازہ ایک سرسری ملاقات سے کیا جا سکتا ہے اس کے جاننے کے لئے تو) جانبین پر لازم ہے کہ ہر ایک دوسرے سے اپنا جملہ حسن و قبح ظاہر کردے (یا کوئی تیسرا بیان کردے) یہ اسی لئے ہے تاکہ نکاح کے بعد پھر بدمزگی نہ پیدا ہو (شریعت کا تو حکم یہ ہے) مگر رسم و عادت یہ جاری ہے کہ جانبین سے زوجین کے حالات کے بیان میں کمی و زیادتی کی جاتی ہے بلکہ اس

سلسلہ میں تو فریب و دھوکہ تک سے کام لیا جاتا ہے (جس کا انجام جو ہوتا ہے وہ مشاہد ہے) حضرت اعمش" فرماتے ہیں کہ جو نکاح بدون دیکھے (اور صحیح صحیح حالات معلوم کئے ہوئے) کیا جائے گا تو انجام اس کا رنج و فرقت اور پریشانی و مشقت ہی ہو گا۔

روایت میں آتا ہے کہ ایک شخص نے حضرت عمر فاروقؓ کے عہد مبارک میں ایسا ہی کیا تھا۔ یعنی بوڑھا (سن سفید) آدمی تھا اور خضاب لگا کر ایک جوان عورت سے نکاح کر لیا۔ جب عورت کی قوم کو اس امر کی اطلاع ہوئی تو اس نے حضرت عمرؓ سے اس کی شکایت کی کہ (اس کے خضاب کرنے کی وجہ سے) ہم لوگوں نے اس کو جوان سمجھا اور فی الواقع یہ بوڑھا شخص تھا۔ حضرت عمر نے اس کے اس دھوکہ دہی پر اس کو سرزنش فرمائی۔ اسی طرح سے مروی ہے کہ حضرت بلالؓ اور صہیبؓ جو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خدام میں سے تھے اہل عرب میں سے ایک شخص کے پاس گئے اور نکاح کی خواہش ظاہر کی۔ ان لوگوں نے پوچھا کہ تم لوگ کون ہو؟ بلال بولے کہ میرا نام بلال ہے اور میرے اس رفیق کا نام صہیبؓ ہے۔ ہم لوگ گمراہ تھے اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہدایت بخشی (یعنی ایمان اور اسلام سے نوازا) اور ہم غلام تھے اللہ تعالیٰ نے ہم لوگوں کو آزاد کرادیا۔ اور ہم فقیر اور غریب و نادار تھے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے ہم کو غنی بھی کر دیا۔ آپ لوگ اگر ہم کو قبول کرلیں تو اللہ تعالیٰ کا شکر و احسان ہے اور اگر نہ قبول کریں گے تو اس حال میں بھی اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔ ان لوگوں نے کہا کہ ہم نے تم کو قبول کیا۔ درمیان میں حضرت صہیبؓ نے بلالؓ سے چپکے سے کہا کہ اگر تم ان لوگوں سے اپنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خادم ہونا بھی بیان کر دیتے تو اور اچھا تھا۔ بلالؓ نے ان کو روکا اور کہا چپ رہو۔ ہم نے سچی سچی بات کہہ دی ہے (مطلب یہ تھا کہ ہم نے جو کچھ اپنے حالات کے سلسلے میں بیان کیا ہے بالکل صحیح اور درست ہے اگرچہ دنیوی لحاظ سے کوئی خاص شرف اس میں نہیں ہے مگر صدق میں برکت ہوتی ہے اس لئے انشاء اللہ تعالیٰ وہی ہمارا سفارشی ہونے کے لئے کافی ہے جیسا کہ ان لوگوں کی قبولیت سے ظاہر بھی ہو گیا۔ لہٰذا اب اس کے بعد کسی مزید شرف کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ان کو اس سے شبہ ہو جائے اور وہ اس کو فریب پر محمول کریں کہ حضور سے جو سلسلہ جوڑا ہے ہم کو مجبور کرنے کے لئے کیا ہے۔ اس لئے ہم کو صورت فریب سے بھی اجتناب کرنا چاہیئے۔ سبحان اللہ جو قوم کہ صورت فریب سے بھی بچتی ہو وہ فریب کے قریب کیا جائے گی۔ یہ تھے ہمارے اسلاف اللہ تعالیٰ ان کے نقش قدم پر ہمیں بھی چلائے (آمین)

اور اگر کوئی شخص نکاح کرنے سے نیت صرف اتباع سنت اور تحصیل اولاد نیز خانہ آبادی اور انتظام امور شریعت کی کرے یعنی حسن و جمال (اور اس کے ذریعہ حفظ شہوت وغیرہ کا) خیال اس کو نہ ہو تو اس میں شک نہیں کہ یہ غایت درجہ کی بندگی اور اعلیٰ درجہ کا زہد ہے (اور خواص کا مرتبہ

ہے)۔ ابو سلیمان دارانیؒ فرماتے ہیں کہ زہد ہر شے میں ہوتا ہے۔ چنانچہ بیوی کے بارے میں زہد یہ ہے کہ عورت بری بدشکل جیسی بھی ہو اس سے محض اتباع سنت کے خیال سے نکاح کرلے اور حسن و جمال وغیرہ کی کچھ پرواہ بھی نہ کرے اس لئے کہ یہ چیزیں اسباب دنیا میں سے ہیں۔ (پس ان سے صرف نظر زہد ہی تو ہوا)۔ لیکن اگر کوئی شخص ایسا ہو کہ بدون (بیوی کے حسن جمال اور صحت و شباب سے) لطف اندوز ہوئے جس کا پارسا رہنا (یعنی دوسری جانب سے نظر ہٹانا) اور حرام سے بچنا مشکل ہو تو اس کے لئے بیوی میں حسن و جمال کی رعایت کرنا واجب ہے اس لئے کہ مباح شے سے لذت اٹھانا دین کا قلعہ ہے۔ اس کی وجہ سے دین محفوظ رہتا ہے (یعنی آدمی حرام سے بچتا ہے)

رہا یہ کہ ایک عورت کے لئے کیا کیا چیزیں خوبی کی ہیں تو اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے جنتی عورتوں کے جو اوصاف بیان فرمائے ہیں ان میں کفایت ہے مثلاً یہ کہ فرمایا کہ وہ خوبصورت ہونگی۔ خوب سیرت ہونگی سیاہ چشم اور دراز بال ہوں گی۔ گوری رنگت اور خاوند دوست ہوں گی۔ اور حدیث شریف میں آتا ہے کہ عورتوں میں سے سب سے عمدہ وہ عورت ہے کہ جب اس کی جانب اس کا خاوند نظر کرے تو خوش ہو جائے اور جب کوئی حکم کرے تو اطاعت کرے اور جب شوہر اس سے جدا ہو (یعنی باہر ہو جائے) تو جان و مال (اور ان تمام چیزوں) میں (جو اس کی نگرانی میں ہیں) امانت داری سے کام لے۔

(۵) نیز منکوحہ میں جن امور کی رعایت ضروری ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس کا مہر کم ہو۔ چنانچہ مہر زیادہ مقرر کرنا جہالت کی بات ہے اور وبال ہے۔ حدیث شریف میں اس کی ممانعت آئی ہے۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ عورتوں میں سب سے زیادہ بہتر وہ ہے جو خوبصورت ہو اور مہر بھی اس کا کم ہو چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض بیویوں سے دس درہم مہر پر نکاح فرمایا اور حضرت عمرؓ بھی زیادہ مہر مقرر کرنے سے منع فرماتے تھے اور خود اپنی بیٹی کا مہر چار سو درہم سے زیادہ مقرر نہیں فرمایا۔

(فائدہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جملہ ازواج مطہرات کا مہر علاوہ حضرت ام حبیبہؓ کے اسی طرح سے حضورؐ کی صاحبزادی کا مہر بجز حضرت فاطمہؓ کے پانچ سو درہم تھا۔ جس کے تقریباً ایک سو اکتیس روپے دو آنہ ہوتے ہیں۔ (یہ مترجم کے زمانہ کا حساب ہے) اور مہر حضرت ام حبیبہؓ کا چار ہزار درہم یا ۴۰۰ دینار تھا جس کے تقریباً ڈیڑھ سو روپے ہوتے ہیں (یعنی جبکہ ایک روپیہ ایک تولہ چاندی کا ہوتا تھا) اور ہمارے زمانہ میں جبکہ چاندی چھ سات روپیہ فی تولہ ہے۔ ڈیڑھ سو تولہ چاندی کی سکہ رائج الوقت کے حساب سے جو قیمت ہوگی اتنی رقم مہر فاطمی کہلائے گی۔ حاصل یہ کہ مہر فاطمی میں ڈیڑھ سو تولہ چاندی کا ہونا تو متعین ہے مگر روپے متعین نہیں ہیں۔ چاندی کی قیمت کے گھٹنے بڑھنے کی وجہ سے مہر فاطمی بھی مروجہ سکہ میں ہر زمانہ میں مختلف ہو گا۔ وقت پر حساب لگا لیا جائے مترجمؒ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے صحابہ تھے جو کھجور کی گٹھلی کے بقدر سونا نکاح میں مہر مقرر کرتے تھے۔ اور حدیث میں آیا ہے کہ عورت کے لئے یہ برکت کی بات ہے کہ جلد اس کا نکاح ہو جائے اور جلد وہ صاحب اولاد ہو جائے اور مہر اس کا کم ہو۔

(۶) ایک وصف جس کی رعایت منکوحہ میں واجب ہے یہ ہے کہ وہ ولود (یعنی کثرت سے بچہ جننے والی) ہو چنانچہ بانجھ عورت سے نکاح کرنے کو جو ولود ہوں اور ودود (یعنی خاوند سے محبت کرنے والیاں) ہوں۔ اب جس عورت کا نکاح پہلے ہو چکا ہے وہاں اس وصف کی پہچان تو آسان ہے اور اگر وہ کنواری ہے تو یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ صحیح اور تندرست ہو اور روگ بیماری سے سالم ہو اور جوان ہو۔ جب کوئی عورت ان صفات کے ساتھ متصف ہو گی تو اغلب یہی ہے کہ وہ ولود بھی ہو گی۔

(۷) اسی طرح زوجہ کی صفات میں سے ایک اس کا باکرہ ہونا (یعنی کنوارہ پن) بھی ہے کیونکہ یہ سبب بنتا ہے محبت اور الفت کا۔ ہاں اگر کسی غیر باکرہ ہی عورت سے نکاح کرنا ضروری ہو یا اس میں کوئی مصلحت ہو تو پھر وہی مناسب ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب حضرت جابرؓ نے ایک ثیبہ (یعنی غیر کنواری) عورت سے نکاح کیا اور حضور کی خدمت میں آئے تو آپ نے فرمایا کہ اجی تم نے کنواری سے نکاح کیوں نہ کیا کہ تم بھی اس سے مل کر خوش ہوتے وہ بھی تم سے مل کر کھیلتی خوش ہوتی۔ (روایت میں آتا ہے کہ حضرت جابرؓ نے ثیبہ سے نکاح ایک ضرورت اور مصلحت خاص کی بنا پر کیا تھا جس کو انہوں نے حضورؐ کے ارشاد کے جواب میں بیان بھی کیا وہ یہ کہ عرض کیا کہ یا رسول اللہ میرے لڑکے اور لڑکیاں (پہلی بیوی سے) موجود ہیں۔ ایک تو ان کی نگرانی کی مصلحت سے (سن رسیدہ سے نکاح تجویز کیا) نیز اس خیال سے بھی میں نے ثیبہ سے نکاح کیا کہ مجھے غیرت معلوم ہوئی کہ میرے گھر میں میری اولاد ہی کی ہم عمر میری بیوی ہو)

(۸) ایک وصف زوجہ کے لئے یہ ضروری ہے کہ عورت کے شرافت نسب کو دیکھے کہ اس کا خاندان دیندار ہے یا نہیں۔ اس لئے کہ کم اصل اور اہل فسق میں فلاح نہیں ہوتی۔ چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اِیاکُم وَ خُضَراءُ الدِّمَنْ۔ یعنی دیکھو اپنے کو کوڑے خانے کی سبزی سے بچانا۔ علماء نے فرمایا ہے کہ مراد اس سے برے خاندان کی حسین عورت ہے (یعنی اصل بری اور ظاہر اچھا جس طرح سے کہ اوپر تو چاندی کا ورق اور نیچے پاخانہ)

(۹) منجملہ ان آداب کے جن کی رعایت زوجہ میں لازم ہے ایک یہ ہے کہ عورت مرد کے قریبی رشتہ دار میں سے نہ ہو یعنی جن لوگوں سے ہمیشہ (ہر وقت کا ملنا جلنا رہتا ہو کیونکہ یہ سبب ہوتا ہے قلت شہوت اور عدم ازدیاد محبت کا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

لاتنکحوا القرابة القریبة فان الولد یخلق ضاویًا۔ یعنی قریبی رشتہ والی عورت سے نکاح مت کرو کیونکہ لڑکا ضعیف اور کمزور پیدا ہوگا اور حکمت اس میں یہ ہے کہ شہوت کا ابھار قوت حاسہ کے ذریعہ ہوتا ہے جو کہ (عورت کو) دیکھنے اور چھونے سے پیدا ہوتی ہے۔ اور قوت حاسہ اجنبیہ میں قوی ہوتی ہے جیسا کہ کہا گیا ہے کہ لکل جدید لذة یعنی ہر نئی چیز مزیدار ہوتی ہے اور جو چیز کہ ہمیشہ نظر کے سامنے رہتی ہو۔ اس میں قوت حاسہ ضعیف ہو جاتی ہے۔ پس شہوت کا ابھار نہیں ہو پاتا اور نطفہ میں قوت نہیں آتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اولاد ضعیف پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑھاپے کی اولاد کمزور ہوتی ہے۔

(فائدہ) صراح میں بیان کیا ہے کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اِغْتَرِبُوا وَلَا تَضْوُوْا یعنی اپنی عورتوں سے نکاح کرو اور چچا تایوں میں (قریبی رشتہ داروں میں) نہ کرو اور یہ اس لئے کہ اہل عرب کا یہ خیال ہے کہ قرابت قریبہ سے حاصل شدہ اولاد نحیف و ناتواں ہوتی ہے۔ یعنی بچہ دبلا پتلا ہوتا ہے مگر ہوتا ہے کریم النفس یعنی بزرگ و نیک بخت یعنی اپنی قوم ہی کی طبیعت پر ہوتا ہے۔ انتہیٰ ۱۲)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اس سے منع فرمایا ہے وہ اہل عرب کے قاعدہ اور دستور کے مطابق منع فرمایا ہے کہ وہ لوگ ضعف کو پسند نہیں کرتے تھے۔ باقی اس میں شرعی کوئی قباحت نہیں ہے کہ بلکہ جیسا کہ کہا گیا علاوہ ضعف کے اس میں اور باتیں عمدہ بھی ہوتی ہیں۔ پس یہ منع فرمانا بربناء ایک خاص حکمت کے ہے۔ اس سے کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ خاندان اور قرابت داروں میں نکاح کرنا منع ہے۔ نیز یہ کہ جن روایات سے ممانعت معلوم ہوتی ہے وہ بھی ایسی کچھ قوی نہیں کہ ان سے تمسک لازم ہو جائے۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ آپ نے پہلے ممانعت فرمائی ہو لیکن بعد میں یہ حکم منسوخ ہو گیا ہو۔ چنانچہ بڑی سند میری اس تقریر کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ہے کہ آپ نے سیدۃ النساء حضرت زہرا کا نکاح حضرت علی سے کیا۔ اگر یہ منع ہوتا تو خود حضور ایسا کیوں کرتے۔ نیز اسی طرح سے صحابہ کرام اور صلحائے امت میں اس وقت سے لیکر اب تک اہل قرابت میں نکاح کا طریقہ چلا آرہا ہے۔ غرض یہ کہ اس قسم کی روایتوں کو دیکھ کر کوئی شخص ایسے رشتوں کو برا نہ جانے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

یہ تمام وہ چیزیں ہیں کہ جن کا لحاظ عورتوں میں ضروری ہے۔ اسی طرح سے عورت کے خاندان والوں پر بھی لازم ہے کہ وہ مرد کے اندر بھی ان تمام امور کو دیکھ لیں۔ یعنی یہ کہ وہ دیندار' نیک خلق' شریف النسب اور عالی ہمت ہے کہ نہیں۔ اس لئے کہ نکاح ہمیشہ کا تعلق ہوتا ہے۔ شوہر کی قید سے عورت کی خلاصی بدوں مرے ممکن نہیں۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اَلنِّکَاحُ رِقٌّ یعنی نکاح کرنا عورت کو لونڈی بنا دینا ہے۔ لہٰذا مرد کے حالات کا تتبع اور اس کی تحقیق

بھی ضروری ہے کہ ظالم۔ شرابی یا بے نمازی تو نہیں ہے۔ ایسے لوگوں کو لڑکی نہ دے۔ کیونکہ یہ قطع رحم کے مرادف ہے یعنی ایسوں کو لڑکی دینا گویا اس سے رشتہ ہی منقطع کرلینا ہے۔ نیز حق تعالیٰ کی ناراضی کا بھی سبب ہے۔ نعوذ باللہ من ذالک۔

فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ مَنْ زَوَّجَ کَرِیْمَتَہٗ فَاسِقًا فَقَدْ قَطَعَ رَحِمَہٗ یعنی جس شخص نے اپنی لخت جگر کا نکاح کسی فاسق سے کیا تو گویا اس نے اس کا رشتہ ہی منقطع کردیا سوملاحظہ فرمایا آپ نے صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی صداقت آج کس طرح روز روشن کی طرح ظاہر ہو رہی ہے کہ محض اس ایک ارشاد پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے آج دنیا کس قدر پریشان ہے کہ نکاح کے لئے لڑکے یا لڑکی میں دینداری کو نہیں دیکھا جاتا بلکہ محض خوبصورتی اور قابلیت اور مالداری و ملازمت کو سبب تعلق قرار دیدیا جاتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جانبین میں سے دونوں کے یا کسی ایک کے فسق (بددینی) کے سبب دونوں میں کیسی نااتفاقی اور ناچاقی ہو جاتی ہے اور فتوے، پنچایت اور عدالت تک کی نوبت آجاتی ہے اور نکاح جس کی وضع دو خاندانوں کے ملانے کے لئے تھی وہ آج اسی فرمان نبوی پر عمل نہ کرے کی وجہ سے دو جماعتوں میں نزاع کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ ط

فصل سوم

(معاشرت بالنساء اور آداب ولیمہ کا بیان)

جب مرد، بیوی کو اپنے گھر لاوے تو اس کو چاہیئے کہ اپنی حیثیت کے مطابق کھانا پکا کر اعزاء اور احباب کی دعوت کرے اس کا نام ولیمہ ہے اور یہ مستحب ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے بہتر یہ ہے کہ یہ دعوت رخصتی کے بعد اول ہی دن ہو، یوں دوسرے یا تیسرے دن بھی اگر ولیمہ کیا جائے تب بھی کچھ حرج نہیں ہے۔ اور یہ بھی مستحب ہے کہ لوگ مرد ناکح کو نکاح کی مبارکبادی دیں اور زوجین میں باہم الفت و محبت اور موافقت کی دعا کریں۔ (حدیث شریف میں اس موقع کے لئے یہ الفاظ آئے ہیں۔ یعنی ناکح سے کہے کہ (بارک اللہ لک و بارک اللہ علیک و جمع بینکما فی خیر)

اسی طرح سے مستحب ہے کہ نکاح کا اعلان و اظہار کیا جائے دف اور (جائز) گیت اور گانوں کے ذریعہ سے کیونکہ ولیمہ وغیرہ کے موقع پر اظہار مسرت کے لئے (حدود شرعی کے اندر رہ کر) گانے کی اجازت ہے۔ روایت میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک صحابی کے گھر تشریف لے گئے وہاں کوئی تقریب تھی اور لڑکیاں دف بجا بجا کر کچھ اشعار پڑھ رہی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر ایک لڑکی نے نعت پڑھنا شروع کر دیا۔ آپ نے اس کو منع فرمایا اور یہ فرمایا کہ جو اشعار تم پہلے پڑھ رہی تھیں وہی پڑھو۔ اور آپ نے اس سے اس لئے منع فرمایا کہ اس کا مضمون صحیح نہ تھا اس لئے آپ کو ناپسند ہوا۔ اس شعر کا مطلب یہ تھا۔ "ہم میں ایک نبی ہیں جو کل کی بات جانتے ہیں۔" چونکہ اس میں آپ کے لئے غیب کو ثابت کر رہی تھیں جو غلط تھا اس لئے آپ نے اس کو روک دیا۔ مصرع یہ تھا (وفینا نبی یعلم ما فی غد)

(فائدہ) جاننا چاہیئے کہ حضرت شیخ الحق" نے اوپر گانے کے مسئلہ میں یہ جو تحریر فرمایا کہ گانے کی اجازت ہے تو یہ محدثین" کی رائے پر فرمایا ہے۔ باقی فقہاء معتبرین" کے نزدیک گانا بجانا حرام ہے (اور ان حضرات نے بھی جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ احادیث ہی سے استنباط کر کے فرمایا ہے کچھ اپنی جانب سے نہیں فرمایا ہے) چنانچہ شامی میں یہ تفصیل ہے کہ منھم من اباح مطلقا و منھم من کرہ مطلقا و فی البحر و المذاہب حرمتہ مطلقاً فانقطع الاختلاف بل ظاھر الھدایۃ انہ کبیرۃٌ ولو لنفسہ (انتھی عبارۃ الدر)

یعنی بعض حضرات علماء نے گانے کو مطلقاً مباح فرمایا ہے اور بعض حضرات نے مطلقاً حرام

اور منع فرمایا ہے۔ اور بحرالرائق میں ہے کہ اصل مذہب (حنفیہ کا) اس کی حرمت ہی کا ہے۔ پس اختلاف ختم ہوگیا اور ہدایہ کے ظاہری الفاظ اسی کو مشعر ہیں کہ گانا گناہ کبیرہ ہی ہے اگرچہ اپنے طور پر (یعنی اپنے لئے) گنگنائے۔ (درمختار)

اور حضرت شیخ الاسلام نے جو کہ ایک بڑی محدث ہیں اور شیخ کی اولاد میں سے ہیں۔ بخاری کے ترجمہ میں لکھا ہے فقہاء جو کہ اہل فتویٰ اور اہل امانت اور مقتدائے دین ہیں وہ گانے کی کراہت اور حرمت کے باب میں بہت ہی متشدد ہیں۔ چنانچہ ائمہ اربعہ کا صحیح اور مشہور قول اس کی کراہت ہی کا ہے۔

اور اگر بنظر انصاف دیکھا جائے تو جس گانے کی اجازت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی وہ جھوٹ، افتراء اور عورتوں کے خدوخال کے مضامین پر مشتمل نہ تھا بلکہ صحابہ کی شجاعت کفار کی ہجو یا مبارکبادی وغیرہ کے مضامین ان میں ہوتے تھے اس لئے ہم آج اپنے زمانے کے گانوں کو ان پر قیاس نہیں کرسکتے۔ اللہذا صحیح یہی ہے کہ گانے بجانے سے قطعی احتراز کرنا چاہئے۔ ہاں دف

ے قولہ ہاں دف کا مضائقہ نہیں۔ احقر مترجم عرض کرتا ہے کہ بوادر النوادر میں حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی قدس اللہ سرہ کی تحقیق دف متعلقہ لور شادی نظر سے گذری اس موقع پر اس کا ذکر خالی از فائدہ نہیں۔ کسی نے حضرتؒ سے تقریب میں تاشوں کا حکم دریافت کیا فرمایا ـــــــ چونکہ مجھ کو بھی اہتمام کے ساتھ اس مسئلہ کی تحقیق کا اتفاق نہ ہوا تھا اس لئے بناء بر قول مشہور مذکور علی لسان الجمہور یہ سمجھا تھا کہ شادی میں دف بجانا جائز ہے۔ دوسرے باجے ناجائز۔ مگر تھوڑا زمانہ ہوا کہ ایک مضمون نظر سے گزرا تب سے متعارف ضرب دف کے جواز میں بھی شبہ ہوگیا اور احتیاطاً ترک اور منع کا عزم کرلیا۔ انتہیٰ۔ آگے حضرتؒ نے وہ مضمون ہی نقل فرمادیا ہے۔ طویل ہونے کے سبب سے ہم یہاں صرف اس کا خلاصہ بیان کرتے ہیں۔ وھو ھذا۔

۱۔ مذہب حنفیہ میں تمام باجے حرام ہیں۔ ہدایہ میں ہے ان الملاھی کلھا حرام یعنی کھیل تماشے سب حرام ہیں۔

۲۔ شامی میں ہے کہ استماع ضرب الدف والمزمار وغیر ذلک حرام یعنی دف اور جملہ مزامیر کا سننا حرام ہے۔

۳۔ مالابد منہ میں ہے کہ ملاہی۔ مزامیر۔ طنبور۔ دہل۔ نقارہ و دف وغیرہ بالاتفاق حرام ہیں۔

۴۔ البتہ دف بجانا مذہب شافعی میں بموقعہ شادی و ختنہ مباح ہیں ان کے ماسوا میں حرام ہیں۔ باایں ہمہ پیشوائے طریقہ سہروردیہ۔

عارف باللہ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی شافعیؒ عوارف میں فرماتے ہیں کہ اما الدف والشباھۃ وان کان فیھما فی مذھب الشافعی فسحۃ الاولی ترکھا والا خذ بالا حوط والخروج من الخلاف یعنی دف کو جانجھ کے ساتھ بجانا اگرچہ ہمارے امام شافعی کے مذہب میں مباح ہے اور اس باب میں ہمارے

کا مضائقہ نہیں۔ (اور دف وہ باجا ہے جو ایک جانب سے منڈھا ہوا اور ایک جانب سے کھلا ہوا اور اس کو ہاتھ میں لیکر بجایا جائے جسے ہمارے یہاں ڈفلی کہتے ہیں چنانچہ اس کو اگر زمین پر اس طرح مذہب میں بڑی وسعت ہے مگر (بندہ کے نزدیک) اس کا ترک ہی بہتر ہے کیونکہ اختلاف سے۔ دور ہی رہنے میں احتیاط ہے۔ آخر میں شیخ سہروردیؒ نے فرمایا کہ عن الحسن انه قال ليس الدف من سنة المسلمين۔ یعنی حضرت حسنؓ نے فرمایا ہے کہ دف بجانا مسلمانوں کا طریقہ نہیں۔

(۵) پھر یہ کہ مذہب شافعی میں بھی جو تقریب نکاح و ختنہ دف کا مباح ہونا لکھا ہے تو وہ مطلقاً مباح نہیں ہے بلکہ چند قیود و شرائط کے ساتھ ہے بدون ان کی رعایت کے ان کے یہاں بھی حرام ہے۔ علامہ ابن حجر مکی شافعی نے ان شرائط کو اپنے رسالہ کف الرعاع عن محرمات اللهو و السماع میں مفصلاً تحریر فرمایا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک شرط یہ ہے کہ دف کا جواز صرف عورتوں اور لڑکیوں کے لئے خاص ہے۔ مرد کے لئے نہیں۔ ان کی عبارت یہ ہے انا اذا ابحنا الدف فانما نبيحه للنساء خاصة

دوسری شرط یہ ہے کہ (اس میں) جھانجھ نہ ہو اور اس کے بجانے میں تکلف اور تصنع نہ کیا جائے جس سے خوش آوازی اور راگ پیدا ہو بلکہ سادگی کے ساتھ ہاتھوں سے پیٹا جائے۔ انگلیوں کے سرے سے نہ بجایا جائے کہ اس میں بھی طرب ہے جو منع ہے۔

تیسری شرط یہ ہے کہ عین نکاح کے وقت یا زفاف کے وقت بس تھوڑی دیر بجایا جائے۔

نیز علامہ ابن حجرؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ماوردیؒ فرماتے ہیں کہ اب ہمارے زمانہ میں دف کا استعمال مکروہ ہے۔ کیونکہ اس میں بیوقوفی اور سفاہت پائی جاتی ہے ان کی عبارت یہ ہے کہ واما في زماننا فيكره فيه لانه ادى الى السخف والسفاهة اس پر علامہ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ:۔

ہمارے اور ماوردی کے زمانہ میں پانچ سو برس کا فاصلہ ہے لہٰذا اب تو اس سے بھی زیادہ خرابی آگئی ہے۔ (حضرت حکیم الامتؒ فرماتے ہیں کہ) میں کہتا ہوں کہ علامہ ابن حجر کو بھی گزرے ہوئے تقریباً چار سو برس ہو گئے اب تو سوائے شر و فساد کے خیر و صلاح کا نام تک نہیں ہے۔ لہٰذا اب باوجود لحاظ و شرائط مذکورہ کے اس کو ترک ہی کر دینا چاہئے۔

(۶) اور بعض علماء احناف متاخرین سے اعلان نکاح کے لئے جو دف بجانا ثابت ہے یعنی وہ کہتے ہیں کہ اس میں کچھ مضائقہ نہیں ہے تو ان قیود کا تو لحاظ رکھنا بہرحال ضروری ہے کیونکہ ان شرائط کو علماء احناف نے بھی بیان فرمایا ہے۔

پس آج کل جو جائز سمجھا جاتا ہے کہ متعدد دف برات کے ساتھ لیکر چلتے ہیں اور بجانے والے بھی ماہر ہوتے ہیں جو بجانے کا فن باقاعدہ سیکھتے ہیں جس میں صاف تطریب ہوتی ہے یہ کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔

حاصل یہ کہ دف بلکہ سب ہی باجے شادی اور غیر شادی میں کسی وقت بھی جائز نہیں۔ ہاں مذہب شافعی میں صرف ختنہ و نکاح وغیرہ بعض مواقع سرور میں بپابندی' شرائط مباح ہیں مگر بہتر ان کے یہاں بھی ترک ہی ہے۔ باقی جو علماء احناف متاخرین (خلاف مذہب حنفیہ) اس کو جائز لکھتے ہیں تو وہ دف ہی کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ تمام باجوں کو وہ بقصد لہو حرام اور بقصد صحیح مباح کہتے ہیں۔ مگر جن صورتوں میں ان کے نزدیک بھی مباح ہے وہ اب موجود نہیں اور جو طریقہ موجود ہے

سے رکھ دیا جائے کہ دوسری جانب سے بھی بند ہو جائے تو وہ ڈھول کے مشابہ ہو جائے گا اور اب اس کا بھی بجانا حرام ہو گا۔ (بالاتفاق)

(ادب) ایک ادب خاوند کے لئے بسلسلہ حسن معاشرت یہ ہے کہ بیوی کے ساتھ خوش خلقی سے پیش آوے اور اس کے قصور عقل کی وجہ سے جو ایذا ہو اس پر صبر کرے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو مرد اپنی بیوی کی کج خلقی پر صبر کرتا ہے اس کو حضرت ایوب پیغمبر (علیہ السلام) کے برابر ثواب ملے گا۔ (کہ انہوں نے بھی بیماری اور مصیبت میں بڑا ہی صبر کیا تھا چنانچہ صبر ایوب ضرب المثل ہے) اسی طرح جو عورت کہ مرد کی کج خلقی پر صبر کرے گی اس کو فرعون کی بیوی (آسیہ) کے برابر ثواب ملے گا۔ (کہ وہ مسلمان تھیں اور صبر کی وجہ سے بڑا درجہ پایا)

(فائدہ) خواجہ عبداللہ انصاریؒ نے لکھا ہے کہ جو شخص ان دس خصلتوں کو اپنا شعار (یعنی پیشہ) بنالے گا وہ دنیا و آخرت دونوں جگہ کامیاب رہے گا۔ با حق بصدق' با خلق با انصاف' با نفس بقہر' با بزرگان بخدمت' با خوردان بہ شفقت' با درویشاں بسخاوت' با دوستاں بہ نصیحت' با دشمناں بحلم' با جاہلاں بخاموشی' با عالماں بتواضع' (یعنی حق تعالیٰ کے معاملہ میں سچا ہو' مخلوق کے ساتھ انصاف سے پیش آئے۔ نفس کو مقہور کرلے۔ بزرگوں کی خدمت کرے۔ چھوٹوں پر شفیق ہووے جو لوگ زاہد ہوں ان کے ساتھ سخاوت سے پیش آئے۔ دوستوں کی خیر خواہی کرتا ہو۔ دشمنوں کے ساتھ عفو و درگذر کا معاملہ کرے۔ جاہلوں کی جہالت پر خاموشی اختیار کرے۔ عالموں کے ساتھ تواضع سے پیش آئے۔)

عورتوں پر رحم کرنے میں نیز ان کی بے وقوفی کے عفو و درگزر کرنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی بھی ہے کہ آپ کا یہی طریقہ تھا۔ روایت میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات بھی کبھی آپ کے مقابلہ میں آپ کو جواب دیدیتی تھیں اور کبھی کوئی ان میں سے آپ سے خفا ہو کر تمام دن آپ سے کلام نہیں کرتی تھیں اور آپ کے پاس نہیں آتی تھیں۔ لیکن یہاں ان امور سے غرض خود نمائی نہ تھی بلکہ مقصد حضور ہی کے خوبیٔ خلق کا اظہار تھا۔

غرض تجلی حسن است خود نمائی نیست

دف بجانے کا وہ جائز نہیں۔ پس مقلدین امام ابو حنیفہؒ کے لئے خیریت اسی میں ہے کہ ہرگز اس کو اختیار نہ کریں ورنہ سخت خطرہ میں مبتلا ہوں گے۔ انتہیٰ

(ماشاء اللہ تعالیٰ نہایت عمدہ تحقیق ہے۔ یہاں چونکہ دف کا ذکر آگیا تھا اس لئے ناظرین کے افادہ کے لئے یہ تحقیق بھی نقل کردی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے منتفع ہونے کی توفیق بخشے آمین۔ راقم جامی غفرلہ')

روایت میں آتا ہے کہ ایک دن امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ کی صاحبزادی حضرت حفصہؓ نے جو کہ ازواج مطہرات میں سے تھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں کسی بات کا جواب دیدیا۔ ان کی ماں نے سنا تو اپنی بیٹی کے یہاں آئیں اور کہا کہ بیٹی! ابو بکر کی بیٹی کو دیکھ کر (کہ وہ بھی ناز کیا کرتی ہیں) تم دھوکے میں نہ پڑ جانا وہ تو رسول خداؐ کی منظور نظر ہیں۔ اس لئے ان کی دوسری بات ہے تم (ان کی ریس نہ کرنا) اسی طرح سے ایک مرتبہ ازواج مطہرات میں سے کسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ مبارک پر ہاتھ مارا اور اپنے آگے سے آپ کو ہٹادیا۔ ان کی ماں نے یہ دیکھ کر لڑکی کو مارا اور تنبیہ کی۔ آپؐ نے ان کو (مزید) مارنے سے روک دیا۔ (مطلب یہ تھا کہ یہ تو میاں بیوی کے آپس کے ناز کے معاملات ہیں اس میں تم دخل مت دو) ایک دن حضرت عائشہؓ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کوئی گفتگو ہو رہی تھی (اور باہم اختلاف ہو رہا تھا) اتنے میں حضرت ابو بکرؓ آگئے آپ نے ان کو حکم بنادیا اور حضرت عائشہ سے فرمایا کہ تم پہلے اپنی بات کہتی ہو یا میں کہوں؟ حضرت عائشہ بولیں کہ آپ ہی فرمایئے۔ مگر ٹھیک کہیئے گا۔ غلط نہ کہیئے گا۔ یہ کلمہ سنتے ہی حضرت ابو بکرؓ نے حضرت عائشہؓ کے منہ پر ایسی زور کا طمانچہ مارا کہ ان کے منہ سے خون نکلنے لگا۔ حضرت عائشہ مارے ڈر کے پناہ لینے کی غرض سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آپ کے پیچھے جا دبکیں۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صدیقؓ سے فرمایا کہ میں نے تم کو اس کام کے لئے تو نہیں بلایا تھا۔ علماء بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عائشہؓ سے جو محبت ہوئی وہ اسلام میں سب سے پہلی محبت تھی (مطلب یہ کہ حضرت خدیجہ کے بعد بقیہ بیویوں میں سب سے زیادہ محبت حضرتؐ کو حضرت عائشہ ہی سے تھی)

(ادب) منجملہ آداب عشرت کے ایک یہ ہے کہ اپنی بیوی کے ساتھ محبت' نرمی اور خوش طبعی کے ساتھ وقت گذارے۔ ترش روئی اور خفگی کے ساتھ نہ رہے۔ اور ان سے ان کی عقل اور فہم کے مطابق کلام اور معاملہ کرے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی عادت شریفہ تھی۔ یہاں تک کہ روایت میں آتا ہے کہ ایک دن آپ حضرت عائشہ کے ساتھ دوڑے کبھی آپ آگے ہو جاتے تھے اور کبھی وہ آگے بڑھ جاتی تھیں اور آپ کا ارشاد ہے کہ تم میں سے بہتر وہ شخص ہے جو اپنی بیویوں کے ساتھ بہتر ہو۔ اور میں تم سب سے بہتر ہوں اپنی بیویوں کے ساتھ۔

حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا ہے کہ مرد کو چاہیئے کہ اپنے گھر کے لوگوں کے ساتھ لڑکوں کی طرح رہے۔ اور حدیث شریف میں آتا ہے کہ خدا دوست نہیں رکھتا اس مرد کو جو اپنے اہل خانہ کے ساتھ سخت ہو۔

ایک ادب معاشرے کا یہ ہے کہ بیوی کے ساتھ خوش خلقی برتنے اور اس کی رعایت کرنے میں اتنی زیادتی بھی نہ کرے کہ اس کا تابع اور محکوم ہی ہو جائے کہ یہ بہت مضر چیز ہے۔ اور ایسی کمی

بھی نہ کرے کہ ظلم کی نوبت آجائے۔ بلکہ اعتدال کی راہ چلے کہ یہی پسندیدہ کام ہے۔ اور اگر گھر میں کوئی ناجائز چیز، خلاف شرع امر اور نامناسب بات دیکھے تو منع کر دے اور اس میں ان کا تابع و معین نہ ہو جائے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو شخص بیوی کی اطاعت کرے گا اس کی خواہش نفس (یعنی خلاف شرع امور) میں تو اس کو اللہ تعالیٰ دوزخ میں منہ کے بل ڈالیں گے (قلب وضع کی سزا قلب وجہ) اور روایت میں آتا ہے کہ عورتوں کی مخالفت کرو کہ ان کی مخالفت ہی میں برکت ہے۔ چنانچہ علماء نے فرمایا ہے کہ عورتوں سے ضرور مشورہ کرنا چاہیئے تاکہ جو کچھ وہ کہیں اس کے خلاف کام کرے (کہ وہی ثواب اور بابرکت ہوگا)

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے خاوند کو سیّد فرمایا ہے۔ زلیخا کے واقعہ میں ارشاد ہے کہ وَاَلْفَیَا سَیِّدَهَا لَدَا الْبَابِ یعنی یوسفؑ اور زلیخا نے زلیخا کے سید یعنی اس کے شوہر کو جو کہ عزیز مصر تھا دروازہ کے قریب پایا۔ (اور یہ ظاہر ہے کہ سید مطاع ہوتا ہے) پس مرد کو عورت کی اطاعت کرنی قلب موضوع ہے۔ یعنی مرد سید ہے عورت کا لہٰذا عورت کو اس کی اطاعت کرنی چاہیئے اور یہاں برعکس کام ہو رہا ہے کہ مرد مطیع ہے اور عورت مطاع ہے۔ (ایسے ہی موقع کے لئے کہا گیا ہے کہ۔

کان مملوکی فاضحٰی مالکی   انّ ہذامن اعاجیب الزمن

یعنی فلاں شخص جو کہ میرا مملوک تھا اب میرا مالک ہو گیا ہے۔ یہ بھی کیسا عجوبۂ روزگار ہے۔

چنانچہ مرد کا عورت کی اطاعت کرنا نعمت کو کفران سے بدل ڈالنا ہے۔ یعنی مرد کو اللہ تعالیٰ نے حاکم بنایا تھا (اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ) اس کو یہ نعمت ملی تھی اس نے ناشکری کر کے اس نعمت خداوندی کو ٹھکرا دیا اور اس کی ناقدری کی اور اپنے کو عورت کی غلامی میں دے دیا۔ اور عورت کی مثال بالکل انسان کے نفس کی سی ہے اگر اس کو چھوڑا اور ڈھیل دیا تو غالب آجائے گا اور ہلاک ہی کر دے گا۔ اور اگر اس کو زیر کئے رہا تو وہ مغلوب رہے گا اور ٹھیک ہی ہو جائے گا۔

اور عورتوں کے مزاج میں چونکہ بد خلقی اور نقصان غالب ہے اس لئے ان کو درست کرنے کی تدبیر یہ ہے کہ ان کو نہایت نرمی سے درست کرے اور یہی طریقہ حاکم کے لئے رعیت کے تحفظ میں مناسب ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ عورت صالحہ کی مثال منجملہ دیگر عورتوں کے ایسی ہے جیسے سیاہ کووں کے درمیان سفید سینہ والا کوا یعنی بہت کم (کہیں ہزاروں میں دو ایک) ہوتے ہیں۔ حضرت لقمانؑ کی وصیت میں آتا ہے کہ بری عورت سے پرہیز کرو (اور بری عورت وہ ہے) جو کہ بڑھاپا آنے سے پہلے ہی انسان کو بوڑھا کر دے۔ (یعنی اپنی سوء خلقی اور بد مزاجی کی وجہ سے شوہر کے لئے مستقل

کوفت بن جائے اور یہی فکر و غم اس کو بوڑھا کر دے)

اور عورتوں کی اصلاح کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو آہستہ آہستہ ادب سکھاوے۔ اول نصیحت کرے اور نرمی کے ساتھ منع کرے اگر اس سے کام نہ چلے تو تہدید اور تنبیہ (یعنی ڈانٹ ڈپٹ) سے پیش آوے۔ اگر اس پر بھی باز نہ آوے تو شب میں اس کی جانب پشت کر کے سوئے یا تنہا سوئے (تاکہ ناگواری کا اظہار ہو) اور ایسا ایک سے لیکر تین شب تک کرے۔ اگر یہ بھی مفید نہ ہو تو اس کو مارے مگر نہ اس طرح کہ ہڈی پسلی ہی توڑ دے کیونکہ مقصد تادیب ہے تعذیب نہیں۔ اسی طرح سے منہ پر بھی نہ مارے کہ حدیث شریف میں اس کی ممانعت آئی ہے۔ اور تین دن سے زیادہ اس سے رنج اور کینہ نہ رکھے کہ اس کی بھی ممانعت ہے۔ اور اگر عورت نافرمان اور ناموافق ہی ہے تو مناسب ہے کہ بعض رشتہ دار اس کے اور بعض اس کے باہم حکم بن کر طرفین کا بیان لیکر ان میں مصالحت کرادیں۔ قرآن شریف میں اس موقع کے لئے یہی حکم ہے۔ ہاں اگر عورت کسی دینی امر میں تقصیر کر رہی ہے تو تین کیا دس دن بلکہ ایک ماہ بھی اس سے جدا رہ سکتا ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینبؓ کے ساتھ ایسا ہی معاملہ فرمایا تھا۔

(فائدہ) اس کا واقعہ حدیث شریف میں یوں آیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت صفیہ (اُم المؤمنین) کا اونٹ بیمار ہو گیا۔ حضرت زینبؓ کے پاس (کہ وہ بھی ام المؤمنین میں سے تھیں) ایک اونٹ ان کی سواری سے زائد تھا اس نے حضرت زینب سے فرمایا کہ صفیہ کو یہ اونٹ دے دو انہوں نے کہا ہاں میں اپنا اونٹ ضرور اس یہودی بچی کو دونگی؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے اس کہنے سے خفا ہو گئے اور ماہ ذی الحجہ اور محرم کا پورا مہینہ اور صفر کے کچھ ایام تک ان کے پاس تشریف نہیں لے گئے (یہ حدیث مشکوٰۃ میں ہے) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے اس لئے خفا ہوئے کہ انہوں نے ایک مسلمان کو برا کہا اور اس کی غیبت کی۔ آپ کے اس عمل میں امت کو تعلیم ہے کہ بیویوں کو بھی گناہ کی باتوں میں تنبیہ کرتے رہیں۔

اور منجملہ آداب کے ایک یہ ہے کہ مرد بے غیرت نہ ہو۔ کیونکہ جو شخص بے غیرت ہو وہ حقیقۃً مرد ہی نہیں ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ قَبَّحَ اللّٰہُ من لا یغار یعنی خدا اس شخص کا برا کرے، جو بے غیرت ہو۔

اور یہ بھی فرمایا کہ میں غیرت والا ہوں اور جو غیرت نہ رکھتا ہو وہ الٹے دل کا انسان ہے۔ اور ایک روایت میں یہ آیا ہے کہ میں بھی غیرت والا ہوں اور خدا تعالیٰ مجھ سے زیادہ غیرت والے ہیں۔ چنانچہ حق تعالیٰ کی غیرت ہی کا یہ اثر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر گناہ اور ان بے حیائی کی باتوں کو حرام فرما دیا جو کہ موجب ضرر دنیا و آخرت ہیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ حضرت عائشہ کے ساتھ اِفک کے واقعہ میں مشہور ہے جب کہ ایک منافق نے حضرت عائشہؓ

پر زنا کی تہمت لگائی تھی (جس کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیسی کچھ غیرت اور ایذا پہنچی) بالآخر اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں ان کی براءت نازل فرمائی چنانچہ سورہ نور میں اس کا قصہ مذکور ہے۔ لیکن یہ چاہیئے کہ انسان غیرت میں بھی اعتدال کی راہ چلے جس کا طریقہ یہ ہے کہ جن امور کا انجام برا ہے ان میں تغافل نہ کرے اور بد بختی اور تجسس میں مبالغہ نہ کرے کہ یہ بھی منع ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ بعض غیرت ایسی ہوتی ہے جو کہ خدا کو ناپسند ہے اور وہ یہی ہے کہ مرد اپنی بیوی کے بارے میں ایسی غیرت رکھے جس کا کوئی صحیح منشا موجود نہ ہو یعنی بلا کسی سبب واقعی کے غیرت کرنے لگے یہ برا ہے۔ اس لئے کہ جو غیرت کہ بلا کسی سبب کے ہو وہ منجملہ وساوس شیطان کے ہے اور موجب فساد اور باعث ہلاکت طرفین ہوگی۔ اور اس سے تحفظ کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ نامحرم عورتوں کو اپنے گھر میں داخل نہ ہونے دے۔ اور اپنی بیوی کو گھر سے باہر جانے نہ دے (الا بضرورۃ شدیدہ) حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہؓ سے پوچھا کہ عورت کے لئے سب سے بہتر کیا چیز ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ نہ وہ کسی اجنبی مرد کا منہ دیکھے اور نہ کوئی اجنبی مرد اس کا منہ دیکھے۔ یہ جواب سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو گلے سے لگایا اور فرمایا کہ تم بھی ان ہی میں سے ہو جن کے بارے میں حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ یعنی تم بھی انہیں کی اولاد میں سے ہو جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے (بطور مدح اس آیت میں) فرمایا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا یہ طریقہ تھا کہ وہ اپنی دیواروں کے سوارخ تک بند کر دیتے تھے تاکہ عورت کی نظر باہر آنے جانے والوں پر نہ پڑے۔ روایت میں آتا ہے کہ حضرت معاذؓ کی بیوی ایک مرتبہ سیب کھا رہی تھیں۔ آدھا سیب کھایا ہوا اپنے ایک غلام کو دے دیا۔ حضرت معاذ کو ان کے اس فعل سے ایسی غیرت آئی کہ بیوی کو اس پر مارا اور سزا دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں عورتیں مسجدوں میں اور جمعہ وعیدین میں شریک ہوتی تھیں لیکن صحابہ کے زمانہ میں اس سے روک دی گئیں۔ صرف بوڑھیاں آتی تھیں۔ مگر مختار اب اس زمانہ میں مطلقاً منع ہے یعنی نہ بوڑھی عورتیں آئیں نہ جوان آئیں۔ کسی کے لئے اب (بوجہ فساد زمانہ) باہر نکلنا جائز نہیں ہاں اگر کوئی عورت کسب معاش کے لئے باہر نکلنا چاہتی ہے تو قاضی ومفتی کے لئے جائز ہے کہ ہر ضرورت کے پیش نظر خروج کی اجازت دیدیں کیونکہ پارسا عورت کے لئے شوہر کی اجازت سے گھر سے باہر (کسی ضرورت کے لئے) نکلنا جائز ہے۔ باقی محض تماشا بینی اور نظر بازی کے لئے اس کا نکلنا جائز نہیں ہے۔ اگر شوہر اجازت دے گا تو وہ بھی گنہگار ہوگا اور جب ضرورت سے بھی نکلے تو آنکھ اور منہ چھپالے کہ ان کا کھلا رہنا موجب فتنہ ہے۔

اسی طرح سے مرد کو یہ حق ہے کہ عورت کو اس کے ماں باپ کے یہاں نہ جانے دے اور اگر

وہ لوگ آویں تو ان سے نہ ملنے دے لیکن مناسب یہ ہے کہ کبھی کبھی مثلاً ایک ہفتہ یا ایک ماہ کے بعد ملاقات سے منع نہ کرے۔

(فائدہ) فقہ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ ایک ایک ہفتہ کے بعد اگر بیوی کے والدین اس سے ملنے کے لئے آنا چاہیں تو ان کو آنے سے منع نہ کرے۔ اسی طرح سے اگر بیوی اپنے ماں باپ کے یہاں ہفتہ میں ایک بار ملنے کے لئے جانا چاہے تو اس کو بھی نہ روکے۔ ہاں اگر بیوی علاوہ اپنے والدین کے اور دوسرے رشتہ داروں سے ملنے کے لئے جانا چاہے یا ان کو اپنے یہاں بلاوے تو ایک سال کے اندر اندر تو منع کر سکتا ہے مگر سال گزرنے پر ایک دفعہ ملنے سے نہ روکے۔ بعضوں نے ہر ماہ میں ایک بار ملنے کی اجازت دی ہے۔

منجملہ آداب معاشرت کے ایک یہ ہے کہ بیویوں کے نفقہ میں بھی اعتدال سے کام لے یعنی نہ تو اتنا زیادہ دیدے کہ حد سے بڑھ جاوے اور وہ اس کی وجہ سے راحت طلبی اور اسراف میں پڑ جائیں۔ اور نہ اتنا کم دے کہ ضروریات کو بھی کفایت نہ کرے اور وہ محتاج بنی رہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں كُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ یعنی کھاؤ پیو مگر حد سے تجاوز نہ کرو کہ اللہ تعالیٰ حد سے زیادہ بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ انسان کے اپنے گھر والوں پر خرچ کرنے کی بہت فضیلت آئی ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اپنے گھر والوں پر خرچ کرنا فقیروں اور مسکینوں پر صدقہ کرنے سے بہتر ہے۔ اس لئے مناسب ہے کہ اپنے اہل و عیال پر ان کی روزی کو تنگ نہ کرے۔ ابن سیرینؒ نے لکھا ہے کہ مرد کے لئے مستحب ہے کہ جمعہ جمعہ اپنے اہل خانہ کے لئے فالودہ تیار کیا کرے۔ مقصد اس سے وہی کھلانے پلانے میں وسعت کرنا ہے۔ اسی طرح سے مرد کو ایسا کوئی کھانا نہیں کھانا چاہیئے جو اپنے اہل و عیال کو نہ دے کیونکہ یہ عادت تن پروروں کی ہے۔ اور مروت اور انسانیت سے بھی بعید ہے اور اگر تنہا خوری ہی منظور ہے تو چاہیئے کہ پوشیدہ کھاوے اور ان کو نہ دکھاوے۔ اسی طرح جو کھانا ان کو دینا منظور نہیں ہے ان کی تعریف بھی ان سے نہ کرے کہ یہ نہ دینے سے بھی زیادہ برا ہے (اس لئے کہ ان کو للچانا ہے جس سے) ان کو رنج ہو گا۔ اور جب کھانا کھاوے تو سب عیال و اطفال کو ہمراہ لے کر کھاوے اور اگر سب ایک ہی دسترخوان پر کھاویں تو بہت ہی اچھا ہے۔ مقصد ایک ساتھ کھانا ہے کیونکہ الگ الگ کھانا مکروہ ہے۔ کسی صحابیؓ سے یہ منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے اس گھر والوں پر رحمت بھیجتے ہیں جو اکٹھا کھاتے ہیں اور اس کا بہت زیادہ اہتمام کرے کہ حلال روزی حاصل کرے۔ اہل و عیال کی وجہ سے بھی اس باب میں تساہل نہ کرے کیونکہ قیامت میں اس سے حساب لیا جائے گا اور ان کی وجہ سے یہ پکڑا جائے گا۔ (کسی کا ایسا بھی کیا لحاظ جس سے اپنی گردن نپے)

ایک ادب یہ ہے کہ گھر کے لوگوں کو شرعی احکام سکھلائے جو اس سے متعلق ہیں مثلاً

حیض و نفاس اور طلاق وغیرہ کے مسائل سمجھائے۔ اسی طرح سے اپنے اہل خانہ کو نماز روزہ کے احکام تعلیم کرے اور ان کے علاوہ اور بھی جو ضروریات دین ہیں ان کے سکھانے میں تساہلی نہ کرے کیونکہ قیامت میں ان سب کے متعلق اس سے سوال کیا جائے گا۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کُلُّکُمْ رَاعٍ وَ کُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ یعنی تم میں سے ہر ایک شخص نگہبان اور حاکم ہے اور قیامت میں تم سب سے اپنی رعیت کا سوال ہوگا۔ اور اگر مرد تعلیم میں کوتاہی کرے تو خود عورت کے لئے جائز ہے کہ علماء کے پاس جائے اور دین کے مسائل سیکھے۔ ہاں اگر بقدر ضرورت علم وغیرہ سیکھ چکی ہو تو اب علماء سے ملاقات کے لئے یا ان کے درس میں شرکت کے لئے جانا عورت کو جائز نہیں ہے۔ (مراد اس سے تنہا اس سے ملنا ہے باقی اگر مجمع ہے اور پردہ ہے تو پند و وعظ سننے کے لئے جا سکتی ہے۔

ایک ادب یہ ہے کہ اگر اس کی کئی بیویاں ہیں تو ان کے پاس سونے میں باری مقرر کرنے میں عدل و انصاف سے کام لے یعنی سب سے تعلق رکھے ایک ہی کا ہو کر نہ رہے۔ اس لئے کہ باری کا مقرر کرنا واجب ہے چنانچہ اگر کسی کی باری کی رات رہ جائے تو اس کی قضا کرے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جس شخص کی دو بیویاں ہوں اور وہ ایک کی جانب (ظاہری) میلان رکھے تو قیامت میں اس کی ایک آنکھ پھوڑ دی جائے گی۔ (لہٰذا تسویہ ضروری ہے) اور نئی اور پرانی میں بھی فرق نہ کرے ہاں باندی کا حصہ آزاد کا آدھا ہے یعنی اگر کسی دوسرے شخص کی باندی سے نکاح کیا تو حرہ (یعنی آزاد بیوی) کے مقابلہ میں اس کی باری اس سے نصف ہوگی۔ مثلاً دو روز آزاد کے پاس رہے تو ایک دن باندی کے پاس۔ اور سفر میں جس کو چاہے لے جائے۔ باقی اگر قرعہ اندازی کر لے تو بہتر ہے یعنی جس کا نام قرعہ میں نکلے اس کو ہمراہ لے جاوے۔ (دوسرے کی باندی اس لئے کہا کہ اپنی باندی سے تمتع حاصل کرنے کے لئے نکاح کی ضرورت نہیں مگر یہ حکم شرعی باندی کا ہے جس کا اب وجود نہیں ہے)۔

اور عدل کا جو حکم ہے وہ نفقہ اور شب کے قیام میں ہے محبت اور جماع میں نہیں ہے کہ یہ غیر اختیاری شے ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ بالقصد فرق نہ کرے اور بہانہ بازی سے کام نہ لے (مثلاً ایک بیوی کو جلانے اور ستانے کے لئے دوسری سے قصداً جماع کرتا ہے اور محبت کرتا ہے اور بہانہ کرتا ہے کہ میرا دل ہی چاہتا ہے حالاں کہ دل نہیں چاہتا۔ نفس کی شرارت ہے۔ یہ نہ چاہئے)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نان و نفقہ دینے میں اور شب کے قیام کرنے میں سب بیویوں میں برابری کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ۔ یا اللہ بس میرے اختیار میں اتنا ہی ہے (یعنی ظاہری برابری) باقی قلب کا معاملہ میرے اختیار سے باہر ہے۔ (یعنی قلبی میلان کے برابری پر میں قادر نہیں ہوں) چنانچہ حضرت عائشہؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بہت چاہتے تھے یعنی سب ازواج

مطہرات سے زیادہ ان سے محبت فرماتے تھے مگر شب کی تقسیم اور نان ونفقہ میں ان کو سب کے برابر ہی رکھتے تھے (یہ الگ بات ہے کہ) ایک اور بیوی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خوش کرنے کے لئے اپنی باری بھی حضرت عائشہ کو بخش دی تھی۔ روایت میں آتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہوئے تب بھی ہر روز ایک ایک بیوی کے یہاں لوگ آپ کو منتقل کرتے رہتے تھے یعنی اس حالت میں بھی آپ شب کی تقسیم کا لحاظ فرماتے رہے۔ ایک دن آپ نے دریافت فرمایا کہ کل کس کے یہاں کی باری ہے۔ ایک بیوی نے آپ کے اس جملہ کو سمجھ لیا کہ آپ حضرت عائشہؓ کی باری کو دریافت فرمانا چاہتے ہیں اور آپ کو اس کا انتظار ہے چنانچہ سب ازواج نے متفقہ طور سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ہم سب نے بخوشی منظور کیا آپ جب تک بیمار ہیں حضرت عائشہؓ ہی کے حجرہ میں قیام فرمائیں۔ بار بار یہاں سے وہاں اٹھا کر لے جانے میں آپ کو تکلیف بھی ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا دل سے راضی ہو یا محض خاطراً اجازت دے رہی ہو۔ سب نے عرض کیا کہ ہاں ہم دل سے راضی ہیں۔ چنانچہ آپ اس کے بعد حضرت عائشہؓ کے گھر تشریف لے گئے۔

کتاب سراج الہدایہ سے نقل کیا گیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ زہراؓ کا حضرت علیؓ سے نکاح کیا اور ان کو حضرت علیؓ کے گھر رخصت فرمانے لگے تو اس رات ان کو گیارہ نصیحتیں فرمائیں۔ امت کے لئے ان میں بہترین سبق ہے۔ فرمایا بیٹی! جب علیؓ کے گھر میں داخل ہونا تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنا۔ دوسرے یہ کہ مکان کے صحن میں جا کر کسی لکڑی پر بیٹھنا اور سر پر بھنے ہوئے دھان (یعنی دھان کا لاوا) بکھیر لینا۔ تیسرے یہ کہ علی سے کہنا کہ تمہارے دونوں پاؤں کو دھو کر اس کا غسالہ مکان کے چاروں کونوں میں چھڑک دیں۔ چوتھے یہ کہ ہمیشہ کپڑے نماز والے (یعنی پاک وصاف اور دھلے ہوئے) پہنے رہنا۔ پانچویں یہ کہ آنکھوں میں ہمیشہ سرمہ لگایا کرنا۔ چھٹے یہ کہ بغیر تیل لگائے سر اور بدن نہ دھونا اگرچہ ایک دن میں دو یا اس سے زائد بار غسل کرنا پڑے۔ اور جب علی تمہاری جانب دیکھیں تو تم اپنی نگاہ نیچی کر لینا۔ ساتویں یہ کہ غلام زرخرید کی طرح (شوہر کی) تابعدار اور فرمانبردار ہو کر رہنا۔ آٹھویں یہ کہ اپنے لئے عطر خوشبو کا استعمال برابر رکھنا۔ نویں یہ کہ جب علی کے ساتھ گفتگو کی نوبت آئے تو مسکرا دیا کرنا (مطلب یہ کہ خندہ پیشانی کے ساتھ بات چیت کرنا روکھے پھیکے چہرے سے نہ کلام کرنا)۔ دسویں یہ کہ ایک ہفتہ تک کوئی کڑوی چیز اور سرکہ و ترشی نہ کھانا۔ گیارہویں یہ کہ ایک ہی جگہ سات رات و دن رہنا۔ انتہیٰ۔

نوٹ :- کتاب تذکرۃ الموضوعات میں حدیث دولہن کا پیر دھو کر مکان میں پانی چھڑکنا۔ اور ہفتہ بھر اس کا سرکہ اور ترشی نہ کھانا الخ کے متعلق لکھا ہے کہ اس کے راوی غیر معتبر ہیں شاید اسی وجہ سے یہ روایت ہمارے اکابر سے نہ منقول ہے نہ ان کا معمول ہے واللہ تعالیٰ اعلم (از ناقل عفی عنہ)

جو عورت ان ہدایات پر عمل پیرا ہوگی (انشاء اللہ تعالیٰ) اپنے خاوند کے دل میں عزیز و محبوب ہو کر رہے گی اور جلد ہی اس کے اولاد پیدا ہوگی۔

ایک دن حضرت قطب العالمؒ فرمانے لگے کہ اسباب دنیویہ میں سے بھی حضرت فاطمہؓ کی راحت اور بھلائی کے لئے جتنا کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مرحمت فرمایا کوئی مخلوق کسی کو نہیں دے سکتا۔ ایک چیز جو آپ نے عطا فرمائی وہ کملی تھی تاکہ بیٹھنے کی جگہ اس کو بچھا سکیں۔ دوسری چیز (تخت یا) چارپائی تھی تاکہ اس پر سو سکیں۔ تیسری چیز ایک خادمہ عطا فرمائی تاکہ گھر کا کام کاج کرے۔ اور اس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ان کے علاوہ اور کوئی چیز تھی بھی نہیں۔

یہ آداب معاشرت بالنساء کے (یعنی عورتوں کے ساتھ گزران کرنے کے) ان کی رعایت ضروری ہے تاکہ عیش دنیا بھی حاصل ہو اور اتباع سنت کا بھی ثواب ملے۔ (اللہ تعالیٰ توفیق عمل عطا فرمادیں)

فصل چہارم

آداب جماع، تولّد اور طلاق کے بیان

جماع ؎ کے یہ آداب ہیں (ادب) اور زوجہ سے باتیں کرے اور چھیڑ چھاڑ شروع کرے کہ اس کو انس پیدا ہونے میں اور زیادتی لذت میں دخل ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اپنی بیوی پر مانند حیوانات کے فوراً گر نہ پڑے بلکہ اس کو چاہئے کہ پہلے پیامی بھیجے۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیامی کون؟ آپ نے فرمایا کہ یہی بوس وکنار اور اس سے بات چیت کرنا۔ اور حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ انسان سے تین باتیں چھوٹنی نہ چاہئیں۔ ایک یہ کہ جس شخص سے دوستی اور محبت رکھنی منظور ہو۔ (اور یہ پہلی ہی ملاقات ہو تو) بغیر اس کا نام ونسب (اور پتہ) پوچھے اس سے جدا نہ ہو (تاکہ دوبارہ اگر اس سے ملنا چاہے تو مل سکے) دوسرے یہ کہ کوئی شخص اگر اس کا اکرام کرے تو اس کو قبول کرے رد نہ کرے مثلاً یہ کہ کوئی آدمی خوشبو یا تکیہ وغیرہ پیش کرتا ہے تو اس کو رد نہ کرے اور تیسرے یہ کہ اپنی زوجہ پر اس کو بات سے مانوس کئے بغیر پڑ نہ جائے۔ (ادب) بوقت جماع مرد وعورت بالکل ننگے نہ ہوں کہ یہ طریقہ سنت کے خلاف ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب تم میں سے کوئی اپنی بیوی سے ہم بستری کرنا چاہے تو یہ نہ چاہئے کہ گدھوں کے مانند ننگے ہو جائیں۔ اسی طرح بیوی کی ستر مخصوص کا دیکھنا مکروہ ہے۔ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ (باوجود زن وشوہر کے تعلقات کے) میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ستر نہیں دیکھا اور نہ حضور نے میرا ستر دیکھا۔ اور طبیعت (سلیم) کے نزدیک یہ بھی مکروہ ہے۔ ہاں ستر مخصوص کے علاوہ اور حصہ بدن کا دیکھنا مکروہ نہیں بلکہ باعث ازدیاد شہوت ہے۔ چنانچہ منقول ہے صحابہ سے کہ بیوی کے بدن کا دیکھنا مستحب ہے کہ یہ باعث ہوتا ہے زیادتی لذت کا اور سبب بنتا ہے شکر کا۔ (ادب) چاہئے کہ جماع کرنے سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہہ لے اور دل میں خدا کو یاد رکھے کہ یہ وقت غفلت کا ہوتا ہے اور صحبت سے قبل قُلْ هُوَ

؎ تنبیہہ۔ چونکہ یہ مسائل شرمناک ہیں لہٰذا اس کو صرف بالغین پڑھیں بچے اس کو نہ پڑھیں۔ نیز مجمع میں بھی اس کو نہ پڑھا جائے۔ (مترجم)

اللّٰہ احد پڑھے اور یہ دعا پڑھے۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الۡعَلِیِّ الۡعَظِیۡمِ اَللّٰھُمَّ اجۡعَلۡ لَنَا ذُرِّیَّۃً طَیِّبَۃً یعنی شروع کرتا ہوں اللہ کے نام کے ساتھ جو بڑی عظمت والا ہے۔ اے اللہ تو عطا فرما ہمیں نیک و صالح اولاد۔ اور اس حالت میں قبلہ رو نہ ہو کہ یہ تعظیم قبلہ کے خلاف ہے۔ (ادب) مہینہ کی تین شب میں جماع کرنا مکروہ ہے۔ چاند رات یعنی ماہ کی اول شب میں وسط ماہ کی شب میں اور مہینہ کی آخری شب میں۔ کہتے ہیں کہ اکثر ان راتوں میں شیاطین چکر لگاتے رہتے ہیں چنانچہ یہ کراہت حضرت علیؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے۔ (ادب) جماع کے بعد اپنا ستر پاک صاف کرنے کے لئے مرد و عورت کپڑا الگ الگ لیں اور جماع کے بعد ایک دوسرے کی جانب پشت کر کے نہ سوئیں بلکہ سینہ سے سینہ لگا کر سوئیں۔ کتاب لُبِ ذخیرہ میں ایسا ہی لکھا ہے اور مرد کے ستر کو اگر خود عورت ہی کپڑے کے ساتھ صاف کر دے تو اس کا بہت ثواب آیا ہے۔ جماع کا سبب اور فائدہ بدن کی صحت ہے اور نیک و صالح اولاد کی امید جو کہ والدین کے لئے سرمایہ آخرت بنیں۔ (ادب) بعض علماء نے فرمایا ہے کہ جمعہ کے دن جماع کرنا مستحب ہے تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد پر عمل ہو جائے کہ مَنۡ غَسَّلَ وَاغۡتَسَلَ الخ۔

(فائدہ) یعنی حدیث شریف میں آیا ہے کہ مَنۡ غَسَّلَ یَوۡمَ الۡجُمُعَۃِ وَاغۡتَسَلَ وَبَکَّرَ وَابۡتَکَرَ وَ مَشٰی وَلَمۡ یَرۡکَبۡ وَدَنَا مِنَ الۡاِمَامِ وَ اسۡتَمَعَ وَلَمۡ یَلۡغُ کَانَ لَہٗ بِکُلِّ خَطۡرَۃٍ عَمَلُ سَنَۃٍ اَجۡرُ صِیَامِھَا وَ قِیَامِھَا۔ یعنی جو شخص جمعہ کے دن دھلوائے (بیویوں کے بدن کو یا ان کے کپڑے کو) مراد یہ کہ جماع کرے تاکہ وہ غسل کریں اور خود بھی نہائے اور نماز جمعہ کے لئے اول کے اول وقت جائے اور اول خطبہ پالے اور پیدل ہی جائے سواری سے نہ جائے اور امام کے قریب ہی بیٹھے (یعنی صف اول میں جگہ حاصل کرے) اور خاموشی کے ساتھ خطبہ سنے اور لغو حرکتیں نہ کرے تو اس کو ہر ہر قدم پر ایک سال کے عمل کا ثواب ملے گا اور سال بھی ایسا کہ جس کے تمام دنوں میں روزہ رکھا گیا ہو اور راتوں کو شب بیداری کی گئی ہو۔ (یہ حدیث مشکوٰۃ میں ہے)۔

بس یہاں لفظ غَسَّلَ جو آیا ہے علماء نے اس کے کئی معنی بیان فرمائے ہیں۔ ایک یہ کہ دھلائے اس کے کپڑوں کو یا سر کو خطمی وغیرہ سے یا بیوی کو نہلائے یعنی اس کے ساتھ صحبت کرے کہ اس کی وجہ سے اس پر بھی غسل واجب ہو جائے۔ اور یہ امر باعث فضل اس لئے ہوا کہ اس کی وجہ سے نفس فارغ ہو جاتا ہے اور خطرات سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ (جس کی وجہ سے عبادت میں یکسوئی رہتی ہے ورنہ تو نہا دھو کر کپڑے بدل کر اور خوشبو لگا کر بازار سے گزر کر مسجد تک جانے میں نفس و شیطان نہ جانے کیا کیا خیالات ڈال دے اور کہاں پھنسا دے۔ یہ رحمت اللعالمین کی رحمت و

حکمت کا ایک چھینٹا ہے (صلی اللہ علیہ وسلم) اسی قول کی رو سے حضرت شیخ نے فرمایا کہ جمعہ کے دن جماع کرنا مستحب ہے تاکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مَنْ غَسَّلَ وَاغْتَسَلَ پر عمل ہو جائے واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

اور یہی غسل (جنابت) غسل جمعہ کی جانب سے بھی کافی ہے اور اگر جمعہ کے لئے دوبارہ غسل کرلے تو بہتر ہے۔ اور بعض علماء نے فرمایا ہے کہ یہی غسل (فرض) کرتے وقت بعد میں تھوڑا سا پانی بہ نیت غسل جمعہ بھی ڈال لے تو یہ سنت بھی ادا ہو جائے گی۔ (ادب) چاہئے کہ کم از کم چار دن کے بعد جماع کرے اس لئے کہ اگر اس کی چار بیبیاں ہوتیں تو ہر بیوی کی باری آخر چوتھے ہی دن آتی۔ (ادب) حالت حیض میں اور بعد انقطاع حیض بھی عورت کے غسل کرنے سے پہلے اس سے جماع کرنا حرام ہے۔ ہاں اگر حیض پورے دس دن پر بند ہوا تب ختم حیض پر غسل کرنے سے قبل بھی جماع کر سکتا ہے۔

فائدہ اگر عورت پورے دس دن پر پاک ہو تو غسل کرنے سے پہلے یعنی خون بند ہونے کے بعد ہی اس سے صحبت کرنا جائز ہے۔ اور اگر اپنی عادت کے موافق پاک ہوئی ہو یعنی دس دن سے پہلے ہی مگر تین دن کے بعد تو جب تک غسل نہ کرے یا اس پر ادنیٰ وقت نماز کا نہ گزر جائے جماع جائز نہیں ہے اور ادنیٰ وقت سے یہ مراد ہے کہ بقدر دو رکعت نماز پڑھنے کے وقت گزر جائے کذافی ملتقی الابحر۔ (ادب) علاوہ جماع کے دیگر انتفاع حالت حیض میں جائز ہے۔ مثلاً ایک ساتھ کھانا کھانا۔ ایک بستر پر سونا لیکن ناف سے لے کر زانو تک کے حصہ کو ہاتھ نہ لگادے۔ (ادب) اگر دوبارہ جماع کرنا چاہے تو اپنے ستر کو دھوئے۔ اسی طرح سے اگر احتلام کے بعد جماع کیا جائے تو اول پیشاب کرے اور پانی سے استنجا کرلے تب کرے۔ (ادب) اول شب میں جمع کرنا مکروہ ہے تاکہ بلا طہارت کے سونا نہ پڑے اور اگر غسل کی حاجت میں ہی سونا یا کھانا چاہے تو وضو کرلے کہ یہ سنت ہے اور چاہئے کہ نہانے کی حاجت میں سینگی نہ لگوائے اسی طرح سے ناخن اور بال بھی دور نہ کرے کیونکہ قیامت کے دن یہ چیزیں آکر شکایت کریں گی۔ (ادب) عزل نہ کرے یعنی منی کو فرج کے باہر نہ گرادے جب تک کہ بیوی کی جانب سے اس کی اجازت نہ ہو۔ ہاں اگر باندی سے جماع کرے تو عزل جائز ہے خواہ وہ راضی ہو یا نہ ہو۔

تولّد کے آداب (ادب) یہ نہ کرے کہ لڑکا ہونے سے تو خوش ہو اور لڑکی ہونے سے غمگین۔ اس لئے کہ نہیں معلوم کہ کس کے اندر بھلائی ہے۔ (ہونہار اطاعت شعار لڑکی نالائق اور نا ہنجار لڑکے سے بدرجہا بہتر ہے) نیز لڑکیوں پر رحم کرنے اور ان کی غمخواری اور ان کے ساتھ صلہ

رحمی کرنے کی فضیلت اور ثواب بہت آیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کے یہاں لڑکی ہو اور وہ اس کی پرورش کرے اس کو اچھا ادب سکھادے اور اس کے ساتھ غمخواری کرتا رہے تو قیامت کے دن نار دوزخ سے بچانے میں اس کے حق میں وہ لڑکی مانند لشکر کے ثابت ہوگی یعنی دائیں اور بائیں ہر جانب سے آکر اس کو بچائے گی۔ نیز یہ بھی آیا ہے کہ جس شخص کی دو بیٹیاں ہوں اور وہ ان کے ساتھ سلوک کرے یعنی ان کو پالے پوسے تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلہ میں اس کو جنت میں داخل فرمادیں گے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ جس کسی کے دو بیٹیاں (یا یہ فرمایا کہ دو بہنیں) ہوں اور وہ ان کے ساتھ عمر بھر نیکی کرے تو میں اور وہ جنت میں ایک ہی ساتھ ہوں گے۔ (ادب) چاہئے کہ کھانا وغیرہ اور دوسری چیزوں کے دینے میں لڑکیوں کو لڑکوں پر مقدم کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص بازار سے کوئی چیز خرید کر گھر لائے اور صرف لڑکیوں کو وہ چیز دے لڑکوں کو نہ دے تو (قیامت میں) اللہ تعالیٰ اس کی جانب رحمت کی نظر فرمادیں گے اور جس کی جانب خدا تعالیٰ رحمت کی نظر فرمادیں اس کو عذاب نہ دیں گے۔ نیز حدیث شریف میں آتا ہے کہ لڑکیوں کو خوش رکھنے والا ایسا ہے جیسے خوف خدا سے رونے والا۔ اور جو شخص خدا کے خوف سے رویا تو اس پر دوزخ کی آگ حرام ہے۔

(ادب) ولادت کے بعد (اس کو غسل وغیرہ دیکر) بچہ کے کان میں اذان کہی جاوے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسنؓ کی پیدائش کے بعد ان کے داہنے کان میں اذان فرمائی تھی اور بائیں میں تکبیر (یعنی اقامت) حدیث میں آتا ہے کہ اس عمل کا فائدہ یہ ہے کہ بچہ کو ام الصبیان کی بیماری نہیں ہوتی۔ (ادب) جب بچہ بولنا شروع کرے تو سب سے پہلے اس کو لا الہ الا اللہ سکھا دے تاکہ پہلا بول جو اس کے منہ سے نکلے کلمہ اسلام ہو۔ (ادب) ساتویں دن یا چودھویں دن یا اکیس دن ختنہ کرانا اور سر کے بال منڈوا دینا مستحب ہے۔ (عقیقہ قربانی کا بیان آگے آتا ہے)۔

فائدہ اسی طرح ساتویں دن بچہ کا نام رکھنا بھی مستحب ہے۔ اور سر کے بال منڈوانے میں اصل اور بہتر ساتواں ہی دن ہے (بچہ ہی کمزور ہو تو خیر ورنہ بلاوجہ تاخیر نہ کرے عدم استطاعت کی وجہ سے قربانی نہ کر سکنا کوئی عذر نہیں)۔ (ادب) اولاد کے حقوق میں سے یہ بھی ہے کہ اس کا کوئی اچھا سا نام رکھے۔ (حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں ایک باپ نے اپنے لڑکے کی یہ شکایت کی یہ میرے حقوق نہیں ادا کرتا۔ حضرت عمر نے لڑکے سے دریافت کیا۔ اس نے کہا اے امیر المومنین کیا باپ ہی کے حقوق اولاد پر ہوتے ہیں یا اولاد کا بھی باپ پر کچھ حق ہے؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا ہاں اولاد کے بھی حقوق ہیں۔ کہا میں ذرا ان کو سننا چاہتا ہوں۔ فرمایا کہ اولاد کا ایک حق تو یہ ہے کہ اس کو شریف عورت سے حاصل کرے اور پیدا ہونے کے بعد اس کا نام اچھا سا رکھے۔ اور جب ہوش و حواس

درست ہو جائیں تو ان کو دین کی تعلیم دے۔ لڑکے نے کہا حضرت میرے باپ نے ان میں سے میرا ایک حق بھی نہیں ادا کیا۔ کیونکہ اولاً تو مجھ کو ایک آوارہ گرد باندی سے حاصل کیا اور ثانیاً میرا نام جعل رکھا جس کے معنی ہیں گوہ کا کیڑا۔ ثالثاً مجھے دین کا ایک حرف بھی نہیں سکھایا اور مجھے دینی تعلیم سے بالکل کورا رکھا۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے باپ کو بہت ڈانٹا اور یہ کہہ کر مقدمہ خارج فرمادیا کہ جاؤ تم پہلے اپنے ظلم کی مکافات کرو اس کے بعد لڑکے کے ظلم کی فریاد کرنا۔ (از مترجم) حدیث میں آیا ہے کہ تمہارے ناموں میں سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے پیارا نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہے۔ نیز حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر نام رکھنا جائز ہے مگر کنیت نہ رکھے یعنی مثلاً محمد نام رکھے تو ابوالقاسم نہ رکھے۔ حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں ایک شخص نے ایک شخص کو محمد کہہ کر پکارا (اس کا یہی نام تھا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خیال فرما کر کہ شاید مجھے پکار رہا ہے اس کی جانب توجہ فرمائی۔ اس نے عرض کیا کہ حضرت آپ کو نہیں بلکہ فلاں کو بلا رہا ہوں۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے نام اور کنیت کے رکھنے سے منع فرمادیا۔ بعض علماء نے فرمایا ہے کہ دونوں کا جمع کرنا منع ہے۔ یعنی ایک شخص کا نام محمد ہو اور اس کی کنیت بھی ابوالقاسم ہو یہ منع ہے۔ اور بعض علماء نے فرمایا ہے یہ ممانعت صرف آپ کے زمانہ مبارک کے ساتھ خاص تھی۔ اب نہیں ہے یعنی اب سب جائز ہے اور یہی مختار قول ہے۔ روایت میں آتا ہے کہ کسی شخص نے (جس کا نام عیسیٰ تھا اور اس کے لڑکے کا نام بھی عیسیٰ تھا) اپنی کنیت ابو عیسیٰ رکھا۔ آپؐ نے سنا تو فرمایا کہ کیا عیسیٰ کے باپ تھے؟ (مطلب یہ تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تو والد تھے نہیں اور تم نے اپنا نام ابو عیسیٰ رکھا ہے جس سے عیسیٰ کے لئے اب (یعنی والد ہونے) کا ایہام ہوتا ہے) پس آپ نے اس کو بھی مکروہ جانا اور پسند نہیں فرمایا۔ (ادب) نام اگر برا ہو تو اس کو بدل دینا مستحب ہے۔ ایک شخص کا نام عاصی تھا۔ اس کو عبداللہ سے بدل دیا گیا۔

فائدہ اس سے معلوم ہوا کہ یہ جو لوگ خطوط میں اپنے نام کے آگے عاصی یا آثم لکھتے ہیں یہ نہیں لکھنا چاہئے اس لئے کہ یہ اظہار گناہ ہے اور اپنے گناہ کا اظہار منع ہے اس سے گناہ پر معاذاللہ دلیری ثابت ہوتی ہے۔ یوں اللہ تعالیٰ کے سامنے بطور عاجزی کے اظہار اعتراف گناہ اور بات ہے کہ وہ اظہار عاجزی اور التجا ہے۔ (ادب) اسی طرح سے سالار بخش یا نبی بخش یا عبدالنبی وغیرہ کسی کا نام ہو تو بدل کر کوئی دوسرا نام رکھ دے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ حضرت زینب کا پہلا نام برہ تھا جس کے معنی ہیں نیکوکار کے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بدل کر ان کا نام زینب رکھ دیا۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ علیہ وسلم نے ان ناموں کے رکھنے سے بھی منع فرمایا ہے مثلاً برکت، رحمت، صلاح اور نافع وغیرہ اس لئے کہ (گھر میں اگر یہ لوگ موجود نہ ہوئے اور) کسی نے دریافت

کیا کہ برکت ہے تو اس کے جواب میں یہ کہنا کہ گھر میں برکت یا رحمت نہیں ہے اچھا نہیں ہے۔
(ادب) حمل گر کر جو بچہ پیدا ہو چاہئے کہ اس کا نام رکھیں اس لئے قیامت کے دن وہ بھی محشور ہو گا۔

فائدہ۔ شاید یہ حکم اس بچہ کا ہو جس میں علامت حیات پائی جائے مثلاً آواز کرنا یا حرکت کرنا۔

(ادب) چاہئے کہ لڑکا پیدا ہونے پر دو بکریاں (یا بکرے یا بھیڑ یا دنبہ ذبح کرے یا گائے اور اونٹ میں سے دو حصہ لے لے) اور لڑکی کے پیدا ہونے پر ایک بکری ذبح کرے اور اس کو عقیقہ کہتے ہیں اور یہ سنت ہے۔ اور اگر لڑکے میں بھی ایک ہی پر اکتفا کرے یعنی ایک بکرا ذبح کرے تب بھی جائز ہے۔ (اور اگر قربانی کی وسعت نہ ہو تو بچے کا بال تو منڈوا ہی دے)(ادب) عقیقہ کے جانوروں کی ہڈی کو توڑے نہیں کہ یہی مسنون ہے۔ اسی طرح سے یہ بھی سنت ہے کہ بچہ کے سر کے بال کے ہم وزن سونا یا چاندی صدقہ کرے۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک عقیقہ مسنون نہیں ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ پہلے تھا مگر بعد میں منسوخ ہو گیا۔ (واللہ تعالیٰ اعلم)

طلاق کے آداب طلاق دینا مباح یعنی جائز ہے مگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ ابغض المباحات ہے یعنی جائز اور مباح چیزوں میں سے سب سے زیادہ ناپسند طلاق ہے۔

(ادب) اس سے مقصد عورت کو ستانا اور اس کو ایذا دینا نہ ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ بدون سبب شرعی کے ایذاء مومن حرام ہے۔ لہٰذا طلاق بوقت ضرورت اور بدرجۂ مجبوری ہی دینی چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ حالت حیض میں مکروہ ہے کیونکہ شبہ ہو سکتا ہے کہ شاید بیوی کی اس خاص حالت سے کراہت کے سبب دی ہو۔ (ادب) اگر شوہر کے والدین کے نزدیک بیوی بری ہو یعنی شرعی برائی اس کی موجود ہو (اور ان کی خواہش طلاق کی ہو) تو اس کو طلاق دیدینا چاہئے۔ حضرت ابن عمر فرماتے ہیں کہ میری بیوی تھی جس سے مجھے محبت بھی تھی مگر میرے والد حضرت عمرؓ اس کو پسند نہ فرماتے تھے اور مجھ سے طلاق کے لئے کہتے تھے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ واقعہ عرض کیا۔ آپ نے فرمایا کہ اے ابن عمر اس کو طلاق دیدو۔ اس سے معلوم ہوا کہ بیوی کی خاطر کی رعایت سے زیادہ والدین کا حق ہے مگر یہ ضروری ہے کہ غرض فاسد درمیان میں نہ ہو یعنی وہ لوگ بلاوجہ شرعی اس سے بغض نہ رکھتے ہوں۔ (ادب) اس عورت کو طلاق دینا جائز ہے جو خاوند کو راضی اور خوش نہ رکھتی ہو یا کج خلق ہو یا جس کے دین میں فساد ہو یعنی بددین عورت ہو یا خاوند کو ایذاء پہونچاتی ہو۔ (ادب) جب طلاق دینی ہی ضرور ہو تو چاہئے کہ صرف ایک طلاق دے کہ بس یہی کافی ہے اور رجوع کرنا بھی اس میں آسان ہے۔ اور تین طلاقیں دینی نہایت برا ہے اور اس کی برائی

اس کے جزا سے بھی ظاہر ہے کہ اب بدون دوسرے خاوند کے درمیان میں آئے یہ اس سے نکاح نہیں کر سکتا اور اس کی جزا ایسی سخت ہونے میں حکمت یہ ہے کہ پھر کوئی دوسرا ایسی حرکت نہ کرے۔ (ادب) حالت نکاح اور زمانہ طلاق میں عورت کا عیب اور طلاق کی وجہ سے ظاہر نہ کرے کہ ایسا کرنے والے کے لئے وعید عذاب کی آئی ہے۔(ادب) اگر زیادتی شوہر کی جانب سے ہو تو عورت کے لئے جائز ہے کہ اس سے طلاق کی خواہش کرے۔ (ادب) مناسب ہے کہ بدل خلع اس مقدار سے زائد نہ ہو جو مرد نے عورت کو دیا ہے (یعنی مہر) کیونکہ پھر یہ تو شرمگاہ کی تجارت ہو جائے گی (مہر جو عوض قرار دیا گیا ہے ملک بضع کا چونکہ وہ احتراماً ہے اس لئے بس اس کو واپس لے لے اور عورت کی گلو خلاصی کرے زیادہ کس حق سے طلب کر رہا ہے)۔

فائدہ عورت اپنے خاوند سے بعوض مال کے طلاق چاہے اس کو خلع کہتے ہیں اور اس مال کو بدل خلع کہتے ہیں پس اگر مرد زیادتی کرتا تھا جس کے سبب عورت خلع پر مجبور ہوئی تو مرد کو مال لینا مکروہ ہے۔ اس کو چاہئے کہ اس صورت میں کچھ نہ دے۔ اور اگر عورت کی نافرمانی کی وجہ سے خلع کی نوبت آئی ہے تو بقدر مہر تو شوہر عوض لے سکتا ہے اس سے زیادہ لینا اس کے لئے مکروہ ہے۔ ملتقی الابحر میں ایسا ہی لکھا ہے۔ اس کی مزید تفصیلات فقہ میں دیکھنی چاہئے۔

فصل پنجم

شوہر کے حقوق کے بیان

جانو کہ نکاح بھی ایک قسم کی غلامی ہے یعنی شوہر اس کی وجہ سے عورت کا گویا مالک ہو جاتا ہے۔ لہٰذا بیوی کے ذمہ لازم ہے کہ بہر صورت اپنے شوہر کی اطاعت و فرمانبرداری کرے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اگر میں کسی کو خدا تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسرے کو سجدہ کرنے کے لئے کہتا تو بیوی کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کیا کرے۔ نیز یہ بھی ارشاد فرمایا کہ جو عورت دنیا سے اس حالت میں رخصت ہو کہ اس کا شوہر اس سے راضی ہو تو وہ جنتی ہے۔ روایت میں آیا ہے کہ ایک شخص سفر کو گیا ہوا تھا اور اپنی بیوی کو کوٹھے پر بند کر گیا تھا اور اس سے تاکید کر گیا تھا کہ خبردار اوپر سے نیچے نہ اترنا۔ اس درمیان میں عورت کا باپ بیمار ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس نے کہلایا کہ اب میرے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں (اس حال میں بھی) اتروں یا نہیں؟ آپ نے فرمایا کہ نہیں مت اترو جب خاوند منع کر گیا ہے تو اس کی اطاعت تم پر لازم ہے۔ چنانچہ اس کا باپ مر گیا اور دفن بھی کر دیا گیا۔ (مگر اس اطاعت شعار نے مکان سے باہر قدم نہ نکالا) رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے پاس کہلا بھیجا کہ بلاشبہ تو نے اپنے شوہر کی جو یہ اطاعت کی تو اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تیرے باپ کو بخش دیا۔ (سبحان اللہ اللہ تعالیٰ محسنین کے اجر کو ضائع نہیں فرماتے)۔

اسی طرح سے یہ بھی آتا ہے کہ جو عورت پانچ وقت کی نماز پڑھے، رمضان شریف کے روزے رکھے اور اپنی شرمگاہ کو بدکاری سے محفوظ رکھے اور اپنے خاوند کی اطاعت کرے تو وہ جنت میں داخل ہوگی۔ دیکھئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کے لئے اطاعت شوہر کو بھی منجملہ امور اسلام کے (جو کہ مدار نجات ہیں) شمار فرمایا ہے۔ حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں نے دوزخ میں جو نظر کی تو دیکھا کہ اس میں عورتیں ہی زیادہ ہیں۔ عورتوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ایسا کیوں ہے؟ آپ نے فرمایا کہ خاوند کو برا کہنے اور خدا تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کرنے کے سبب سے ہے۔ (عورتیں چونکہ اس میں زیادہ مبتلا ہیں اس لئے دوزخ میں ان کی تعداد زیادہ ہے)۔ نیز حضرت عائشہؓ سے منقول ہے کہ ایک عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں جوان عورت ہوں نکاح کرنا چاہتی ہوں لہٰذا ارشاد فرمادیجئے کہ بیوی پر خاوند کے کیا حقوق ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ خاوند کا بیوی پر یہ حق ہے کہ اگر عورت اور مرد دونوں ایک اونٹ پر سوار ہوں اور اسی حالت میں مرد چاہے کہ وہیں اس سے اپنی حاجت پوری کرے تو عورت انکار نہیں کر سکتی۔ اور مرد کا حق بیوی پر یہ ہے کہ خاوند کے گھر سے (کوئی چیز) کسی کو بدون اس کی اجازت کے نہ دے۔ اور ایک حق یہ ہے کہ بغیر اس کی رضا اور اجازت کے عورت نفل روزہ نہ رکھے۔ اگر رکھے گی تو وہ قبول نہ ہوگا۔ اور ایک حق یہ ہے کہ بدون اذن شوہر کے باہر نہ نکلے اور اگر نکلے گی تو واپسی تک برابر فرشتے اس پر لعنت کرتے رہیں گے۔

ان کے علاوہ اور بہت سی احادیث آئی ہیں جن میں خاوند کے حقوق کا بیان ہے۔ باقی جو حقوق خاوند کے نہایت ہی ضروری اور اہم ہیں وہ دو ہی ہیں۔ ایک تو یہ کہ پردہ کے اندر رہے دوسرے یہ کہ پارسائی کے ساتھ رہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ عورت کا اپنے گھر کے صحن میں نماز پڑھنا مسجد جا کر نماز پڑھنے سے افضل ہے اور گھر کے کونے (کوٹھری) میں (چھپ کر) نماز پڑھنا صحن میں نماز پڑھنے سے افضل ہے۔ ایک حق یہ ہے کہ بیوی حاجت سے زیادہ مال وغیرہ شوہر سے نہ طلب کرے۔ اور شوہر کی حرام کمائی سے پرہیز کرے کہ یہی طریقہ تھا پہلے زمانہ کی عورتوں کا (یہ نہیں کہ بالائی آمدنی کو مزہ لے کر استعمال کرے) کہا جاتا ہے کہ اگلے زمانہ کا یہ حال تھا کہ جب مرد گھر سے باہر (کسب معاش کے لئے) جاتا تھا تو اس کی بیوی اور بچے سب کہتے تھے کہ حرام کی آمدنی سے بچئے گا اور ناجائز مال سے احتراز کیجئے گا۔ حلال کمائی جتنی کچھ بھی ہوگی (گو کم سہی) ہم لوگ اس پر صبر و قناعت کرلیں گے اس لئے کہ ہم کو دوزخ کی آگ کی سہار نہیں ہے۔ (آج حرام کھائیں گے تو کل کو دوزخ

میں جلنا ہو گا)

(ادب) چاہئے کہ لڑکی کے والدین نکاح سے پہلے اس کو آداب خانہ داری اور حسن معاشرت کا طریقہ تعلیم کریں کہ یہ بھی ایک حق ہے لڑکی کا والدین پر۔

ایک مفید اور جامع نصیحت بیان کیا جاتا ہے کہ ایک عورت نے اپنی لڑکی سے رخصتی کے وقت یہ کہا کہ اے بیٹی! آج تو اپنے قدیم گھر کو چھوڑ کر ایک دوسرے گھرانے جا رہی ہے اور تیرا ساتھ اور سابقہ اب ایک اجنبی مرد سے پڑنے والا ہے۔ اور تیرے پاس کے اٹھنے بیٹھنے والے جہاں تو جا رہی ہے بہت غیر شناسا ہوں گے۔ لہٰذا اپنے اوپر شوہر کی اطاعت اور اس کی خوشی کو لازم پکڑنا۔ اور اس کے سامنے بچھے ہوئے فرش کی مانند بالکل پامال ہو جانا یعنی عاجز اور متواضع ہو کر رہنا تاکہ تو اس کے دل پر قابو پالے (کہ تواضع کی یہی خاصیت ہے) اور دیکھو خبردار اس سے بہت قریب نہ ہونا مبادا کہ یہ قرب اس سے دوری کا سبب بن جائے۔ (مطلب یہ کہ کسی سے بہت زیادہ چمٹنا بھی کبھی اس کی نظروں سے گرا دیا کرتا ہے۔ بڑھاؤ نہ آپس میں الفت زیادہ + مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ)۔ اسی طرح سے اس سے بہت دور بھی نہ رہا کرنا ایسا نہ ہو کہ وہ تجھ کو بالکل بھلا دے۔ اگر وہ تیرے قریب ہونا چاہے تو قریب ہو جانا اور اگر کسی وقت دوری پسند کرے تو دور رہنا۔ ایسی بات کبھی زبان سے نہ نکالنا جو اس کے کانوں کو بری لگے۔ اسی طرح سے ایسا کوئی کام نہ کرنا جو اس کی نظروں میں ناپسند ہو۔ اور اس کی مرضی کے مطابق کام کرنا اور جس طرح چاہے ویسے ہی رہنا۔ اگر تو نے ان نصیحتوں پر عمل کر لیا تو یہ سمجھ لے کہ فلاح و نجات تیرے قدم چومے گی ورنہ ہلاکت اور خرابی تیز بے سامنے رکھی ہے۔ یہ نصیحت جملہ آداب پر حاوی ہے اس لئے اس کے بعد کسی اور نصیحت کی حاجت نہیں۔ (بلاشبہ یہ نہایت مفید اور ضروری نصیحت ہے جو کہ قابل عمل اور لائق اشاعت ہے)

تیسرا باب

(اخوت اور دوستی وغیرہ کے آداب کے بیان میں۔ اس باب میں چار فصلیں ہیں)

فصل اول

حب فی اللہ اور بغض فی اللہ کے بیان

جانو کہ الفت اور محبت نتیجہ اور ثمرہ ہے حسن خلق کا اور اخلاق کا سنوارنا بہترین عمل (اور افضل ترین عبادت) ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ ایک صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو چیز عطا فرمائی ہیں ان میں سب سے عمدہ کیا چیز ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ خوش خلقی۔ اور حدیث میں آیا ہے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے حسن صورت کے ساتھ حسن سیرت بھی بخشی ہے اس کو دوزخ کی آگ نہیں کھائے گی (مطلب یہ کہ وہ دوزخ میں نہ جائے گا)۔ نیز حدیث میں ہے کہ میزان عمل میں نہایت ہی وزنی عمل خوش خلقی ہو گی۔ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو ہریرہؓ سے فرمایا کہ اپنے اوپر خوش خلقی کو لازم پکڑ لو۔ انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ خلق حسن کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا کہ تم سے جو کٹے تم اس سے جڑو۔ اور تم پر جو کوئی ظلم کرے تو تم اس کو معاف کر دو۔ اور جو کوئی تم کو محروم کرے تم اس کو دو۔

غرض جب خوش خلقی بہترین عمل ہے تو اس کا ثمرہ یعنی الفت اور محبت بھی سب چیزوں سے بہتر ہوئی۔ خاص کر وہ محبت اور الفت جس کا سبب دین اور تقویٰ ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے لئے محبت یعنی حب للہ کی فضیلت میں بہت احادیث آئی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جس بندے کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کو اچھا دوست عطا فرما دیتے ہیں ایسا کہ اگر یہ خدا کو فراموش کرنے لگتا ہے تو وہ اس کو یاد دلا دیتا ہے اور اگر یاد رکھتا ہے تو اس کے لئے وہ اس میں اور معین ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح سے حدیث شریف میں یہ بھی آتا ہے کہ جو شخص کسی سے محض خدا تعالیٰ کے لئے مواخاۃ (یعنی بھائی چارہ) کرتا ہے تو اس کو جنت میں ایسا درجہ ملے گا کہ (علاوہ اس کے) انسان کسی دوسرے عمل سے اس کو حاصل نہیں کر سکتا۔ نیز یہ بھی آیا ہے کہ قیامت کے دن عرش کے گرداگرد کرسیاں رکھی ہوں گی اور ان پر بہت سے لوگ بیٹھے ہوں گے جن کے چہرے چودھویں رات کے چاند کے مانند چمکتے ہوں گے اور لباس ان کے نورانی ہوں گے۔ اور

دوسرے لوگ تو خوف و ہراس میں ہوں گے اور ان کو کسی چیز کا ڈر نہ ہو گا۔ اور یہی وہ لوگ ہوں گے جن کے بارے میں فرمایا ہے کہ اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ یعنی سن لو کہ جو لوگ محبین خدا ہیں ان کو قیامت میں نہ تو کچھ خوف ہو گا نہ وہ لوگ غمگین ہوں گے۔ صحابہؓ نے دریافت کیا کہ وہ کون لوگ ہوں گے یا رسول اللہ (جن کے یہ درجات ہیں) آپ نے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہوں گے جو کہ باہم محبت اور دوستی جو رکھتے ہیں تو اللہ کے لئے۔ اور باہم اٹھتے بیٹھتے ہیں تو اللہ کے لئے اور باہم ایک دوسرے سے ملتے اور ملاقات کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے لئے۔

اور آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ سات قسم کے آدمی ہیں قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان کو خاص اپنے سایہ رحمت میں جگہ عنایت فرمائیں گے۔ جس دن کہ بجز اللہ تعالیٰ کے سایہ کے اور کوئی دوسرا سایہ نہ ہو گا۔ ایک امام عادل (یعنی منصف حاکم دوسرا جوان صالح جس نے اپنی جوانی صلاح میں گزاری ہو اور اسی صلاح میں وہ پروان چڑھا ہو۔ تیسرا وہ شخص جس کا قلب مسجد سے اٹکا ہوا ہو یعنی برابر یہ فکر لگی ہو کہ کب وقت آئے اور مسجد چلوں۔ اسی کو ہمارے حضرت خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ ۔

کب رات ہو کب ان سے ہوں خلوت میں ۔ پھر ہم
رہتی ہے دھن ہمیں یہی دن بھر لگی ہوئی

چوتھا وہ شخص کہ اللہ تعالیٰ ہی کے لئے دوستی رکھتا ہو (یہاں بیان سے یہی مقصود ہے) پانچواں وہ شخص جو خدا کو یاد کرکے رو پڑا ہو۔ چھٹا وہ انسان جس کو کسی عورت صاحب حسن و جمال نے (برائی کے ارادہ سے) بلایا ہو اور وہ خدا کے خوف سے ڈر گیا ہو اور پارسائی اختیار کی ہو۔ ساتویں وہ شخص جو (اخلاص کی وجہ سے اس طرح سے) اپنے صدقہ کو پوشیدہ کرتا ہو کہ دائیں ہاتھ سے دیتا ہے تو بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہیں ہوتی (آپ نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سچ فرمایا)۔

حضرت مولف فرماتے ہیں کہ صَدَقْتَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ (مطلب یہ ہے کہ صادق مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کی بتلائی ہوئی خبر ہے۔ جس کا واقع ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا مسلمان کو بلا چون و چرا اس پر ایمان لانا چاہئے اور دل سے اس کی تصدیق کرنی چاہئے ۲)

اسی طرح سے منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی نبیؑ کی طرف وحی بھیجی کہ تمہارا دنیا سے زہد اختیار کرنا تو یہ تو تمہاری اپنی ہی راحت کے لئے ہے۔ (کیونکہ دنیا کی چیزوں سے بے رغبتی سبب چین و آرام ہے اس لئے آدمی اس کے حاصل کرنے کی محنت اور مشقت سے بچتا ہے بخلاف طالب دنیا کے کہ اس کو ایک ایک لذت کی تحصیل میں خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے۔ اور تمہارا مخلوق سے منقطع ہو کر ہماری جانب توجہ کرنا اس میں بھی تمہارا فائدہ ہے کہ اس سے جاہ و عظمت ملتی ہے۔ لوگ اللہ والا سمجھ کر عظمت کرتے ہیں۔ ہاں خاص میرے لئے (تمہارا اگر کوئی عمل ہے تو) یہ ہے کہ

تم میرے دشمنوں سے دشمنی رکھو اور میرے دوستوں سے دوستی مطلب یہ کہ یہ چیز محض خدا تعالیٰ سے محبت کی وجہ سے ہوا کرتی ہے۔ اس میں اپنا کوئی حظِ نفس نہیں ہوتا (اس لئے اخلاص سے زیادہ قریب ہے اور پہلے دونوں عمل میں اپنی غرض کی آمیزش ہوسکتی ہے گو نبی اس سے محفوظ ہو۔)

نیز حدیث شریف میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی ہے کہ یا اللہ کسی فاسق کا مجھ پر کوئی احسان نہ رکھیو۔ اور (اس کی وجہ سے) اس کی محبت میرے دل میں نہ آنے پائے۔ نیز حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر وحی بھیجی کہ اگر تم میری اتنی عبادت کرو جتنی سب آسمان و زمین والے کرتے ہیں اور حب فی اللہ اور بغض اللہ نہ کرو تو وہ عبادت تمہارے کچھ بھی کام نہ آوے گی۔

فائدہ۔ مطلب یہ ہے کہ محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے نیک اور صالح لوگوں سے محبت رکھے اور جو برے اور فاسق ہیں ان سے بغض و دشمنی رکھے (کہ یہ بھی دین کا اہم شعبہ ہے) جس شخص میں یہ بات ہوگی اس سے دوسرا سب کام بھی ہو جائے گا اسی لئے اس کا حکم فرمایا اور اس عنوان سے بیان فرمایا۔ کیونکہ قاعدہ ہے کہ اِنَّ الْمُحِبَّ لِمَنْ یُحِبُّ یُطِیْعُ آدمی اپنے محبوب کی اطاعت کیا کرتا ہے تو جب صالحین سے محبت ہوگی تو ان کی پیروی کرے گا۔ اسی طرح سے جب بروں سے بغض اور نفرت ہوگی تو بری باتوں سے بھی بچے گا اور جہاد بھی کرے گا اور منافقین کی خصلت سے بری ہوگا۔ (یہی وجہ ہے کہ فاجر و کافر سے محبت دین کے نقصان کا سبب ہوتا ہے)۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ پیدا کیا ہے جس کا آدھا بدن تو آگ کا ہے اور آدھا برف کا۔ ان کی دعا بس یہی ہے کہ یا اللہ جس طرح سے کہ تو نے اپنی قدرت عظیمہ سے آگ و برف میں پیوند لگایا ہے اسی طرح سے پیوند لگا دیجئے اپنے صالحین بندوں کے قلوب میں اپنی رحمت کا۔ الحاصل احادیث اور آثار صحابہ حب اللہ کی فضیلت میں بیشمار وارد ہیں۔ (بطور نمونہ کے چند ذکر کر دی گئیں احاطہ کی نہ گنجائش نہ ضرورت) اور حب فی اللہ یہ ہے کہ تم کسی سے محبت محض اس کی دین داری اور تقویٰ کے سبب سے کرو اور اس سے اس لئے تعلق رکھو کہ وہ دین میں تمہارا معین ہوگا۔ اور اس کی دوستی صرف دنیا تک محدود نہ ہو بلکہ یہ سمجھو کہ اس کی محبت تمہارے لئے وسیلۂ آخرت بھی بنے گی۔ چنانچہ کسی شاگرد کو اگر استاد سے محض اس لئے محبت ہے کہ اس کے علم سے نفع دنیوی حاصل کروں گا تو یہ حب اللہ نہیں ہے لیکن تم اپنے کسی محسن سے جو محبت کرتے ہو کہ اس کے احسان سے تمہاری حاجت روائی ہوئی۔ تمہیں عبادت پر تقویت حاصل ہوئی۔ اور فراغت قلبی نصیب ہوئی تو یہ محب اللہ تعالیٰ کے واسطہ ہے بلکہ تمہارا اپنی بیوی سے اس لئے محبت کرنا کہ اس کی وجہ سے تم کو اطمینان قلبی۔ محافظت عمل اور حضوری عبادت حاصل ہوتی ہے یہ بھی خدا ہی کے واسطے ہے۔

اور ایک درجہ حب اللہ کا یہ ہے کہ کسی سے محض خالصاً للہ محبت ہو یعنی دنیا یا آخرت کی کسی چیز کے لئے اس کو واسطہ نہ بنایا جائے۔ یہ حب للہ کا اعلیٰ مرتبہ ہے (اور خواص کا مقام ہے) ہر شخص کو اس کا دعویٰ نہیں کرنا چاہیئے۔

اسی طرح سے بغض للہ یہ ہے کہ تم کسی سے دشمنی صرف اس لئے رکھو کہ اس نے کوئی معصیت کی ہے یا امر حق کے خلاف کام کیا ہے۔ اور گناہ کے تفاوت سے اس بغض کے بھی مراتب مختلف ہیں چنانچہ کافر اور مشرک سے بغض رکھنا اہل معاصی کے بغض سے اشد ہوگا۔ اسی طرح سے اس متبدع (یعنی بدعتی) سے زیادہ بغض رکھا جائے گا جو دوسروں کو بھی بدعت کی دعوت دیتا ہو اور لوگوں کو اس گناہ پر آمادہ کرتا ہو۔ پس منجملہ بغض ہی کے ہے کہ اس کو سلام نہ کرے اور اس کی تعظیم نہ کرے اور اگر وہ سلام کرے تو جواب نہ دے اور اس کا منکر اور مخالف رہے۔ اور اس کے ساتھ نرمی اور تساہل کا معاملہ روا نہ رکھے۔ برابر اس کو زجر و توبیخ کرتا رہے۔ **(ادب)** بدعتی جاہل (مراد یہاں بدعتی سے بدعتی عقیدہ والا ہے جیسے رافضی اور خارجی یا اسی طرح کے اور فرقے ان میں کے جو لوگ جاہل ہوں) یا ایسے ہوں کہ دوسروں کو گمراہ نہیں کرتے تو ان کا حکم دوسرا ہے وہ یہ کہ ان کے ساتھ اخلاق اور نرمی سے پیش آوے ممکن ہے کہ وہ نصیحت قبول کرلیں (کیونکہ جاہل اور ناواقف ہیں معاند اور منکر نہیں ہیں) اور ان لوگوں کو چھوڑ نہ دے بلکہ ان سے کبھی کبھی ملاقات کیا کرے۔ **(ادب)** جو گنہگار کہ کسی واجب کا تارک ہے یا کسی حرام فعل کا مرتکب ہے تو اس کو اگر عین حالت معصیت میں دیکھ لے تو منع کردے کیونکہ حسب تفاوت معصیت بہرحال برائی سے روکنا واجب ہے۔ (مثلاً شراب خور اور زانی کو منع کرنا اور دوسرے گناہوں سے منع کرنے سے اشد ہوگا) اور اگر وہ شخص گناہ کرچکا ہے تو اس کی چند صورتیں ہیں۔ (۱) اگر اس نے اس گناہ کی عادت نہیں اختیار کی ہے بلکہ اس سے توبہ کرلیا ہے تو خیر اچھا ہوا۔ (۲) اور اگر اس کی عادت پڑگئی ہے اور اس کے کرنے میں اصرار کرتا ہے تو اگر یہ سمجھتا ہے کہ میری نصیحت مفید ہوگی تو نصیحت کرے (۳) اور اگر یہ سمجھتا ہے کہ نصیحت کے بجائے اس موقع پر زجر و سرزنش نافع ہوگی تو وہی کرے بشرطیکہ اس پر قادر ہو۔ (۴) اور اگر یہ سب صورتیں نہ ہوں یعنی یہ سمجھتا ہے کہ اس کو نہ نصیحت کارگر ہوگی نہ فضیحت یا قدرت ہی نہیں ہے تو اس سے اعراض کرے یعنی اس سے کچھ نہ کہے البتہ جو چیزیں اسکی معصیت میں معین ہیں (اور اس کے اختیار میں ہیں) وہ اس کو نہ دے۔ مثلاً رقص و سرور کی محفل جمانے کے لئے فرش وغیرہ یا مجلس ماتم اور تعزیہ داری جمانے کے لئے اس قسم کی چیزیں دینا چونکہ ان کی معصیت میں اعانت کرنا ہے اس لئے نہیں دینا چاہیئے۔

(ادب) اور جو امور کہ اس کے اثم و عدوان کے لئے مدد و معاون نہیں ہیں مثلاً یہ کہ یہ شخص غریب محتاج بھی ہے تو اس کے لئے کپڑا بنوا دینا یا بھوکا ہے تو اس کو کھانا کھلا دینا تو اگر یہ چیزیں اخوت

اسلامی کے پیش نظر ہوں تو کچھ مضائقہ نہیں ہے۔ (ادب) اور اگر اس کی معصیت ایسی ہے جس سے صرف تمہارا حق فوت ہو رہا ہے تو اولیٰ یہ ہے کہ تم اس کو معاف کر دو کہ یہ مرتبہ صدیقوں کا ہے۔ اور یہ تمام احکام اس وقت کے لئے ہیں کہ کسی سے تعلقات ابتدائی ہوں۔ اور اگر اس سے تعلقات قدیمی ہیں اور یارانہ دیرینہ ہے اور اس درمیان میں اس سے کسی معصیت کا صدور ہوا تو اس وقت کے لئے دو طریق ہیں۔ بعض حضرات کے نزدیک تو اس کے لئے عفو اور درگزر اور ستر پوشی مناسب ہے۔ اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس سے قطع تعلق کر لے اور ملنا جلنا ترک کر دے اور مدار ان کا نیت پر ہے۔ یعنی فریق اول کی نیت یہ ہے کہ ملتے جلتے رہیں گے تو اصلاح کے مواقع بھی حاصل ہوتے رہیں گے تو ہو سکتا ہے کہ اس کو کسی وقت سمجھالیں۔ (کتنی اچھی نیت ہے) اور فریق ثانی کی نیت انقطاع تعلق سے یہ ہے کہ جب اس نے ہمارے محبوب (یعنی خدا اور رسولؐ) کی مخالفت کی تو اب ہماری اس سے کیا دوستی؟ محبوب کے مخالف سے دوستی آئین محبت کے خلاف ہے۔ (اس نیت کے بھی حسن کا کیا کہنا کہ لِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا چنانچہ امام احمد بن حنبلؒ نے یحییٰ بن معینؒ سے صرف اتنی سی بات پر قطع تعلق کر لیا کہ انہوں نے یہ کہہ دیا تھا کہ میں کسی سے سوال نہیں کروں گا ہاں اگر سلطان بطور تحفہ اور ہدیہ کے میرے پاس کچھ بھیج دے گا تو اس کو قبول کر لوں گا۔

اسی طرح امام احمدؒ ہی کا واقعہ ہے کہ انہوں نے حارث محاسیؒ سے محض اس لئے تعلقات ختم کر دیئے کہ انہوں نے ردّ معتزلہ میں کوئی کتاب لکھ دی تھی۔ امام احمدؒ نے یہ فرمایا کہ تم پہلے معتزلہ کے شبہات لکھتے ہو پھر اس کا رد کرتے ہو (امام احمد بن حنبلؒ کو ان کا یہ طرز پسند نہ ہوا اس لئے کہ ہو سکتا ہے کوئی خالی الذہن عامی اہل سنت اس کتاب کو دیکھے اور معتزلہ کے شبہ سے خود اس کو بھی شبہ ہو جائے اور حارث محاسی کا جواب اس کی سمجھ میں نہ آسکے تو اس کے حق میں تو یہ رد سبب ارتداد بن گیا (معاذ اللہ) اس لئے امام نے کتاب میں مخالفین کے اعتراضات کے ذکر کو پسند نہیں کیا اور اسی پر ان سے ناراض ہو گئے۔ (از مترجم)

اسی طرح سے امام احمدؒ نے اپنے ایک اور دوست سے ملاقات کرنا ترک کر دیا تھا محض اس وجہ سے کہ انہوں نے حدیث اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ آدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ کو مؤول کہہ کر اس میں تاویل کر دی تھی۔

فائدہ۔ ترجمہ حدیث شریف کے لفظوں کا تو یہ ہے کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے آدم (علیہ السلام) کو اپنی صورت پر پیدا فرمایا۔ مراد صورت سے یہاں صفت ہے یعنی اپنی صفت پر پیدا فرمایا۔ امام احمدؒ اس کو اپنے ظاہر ہی پر رکھتے تھے اور تاویل کو پسند نہ فرماتے تھے کہتے تھے کہ جو اس کا لفظی ترجمہ ہے وہی معنی بیان کرو یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اپنی صورت پر بنایا۔ باقی یہ کہ مراد اللہ تعالیٰ کی اس

سے کیا ہے تو ہم اس کے مکلف نہیں۔ اس کو اللہ تعالیٰ کے حوالہ کرنا چاہئے۔ اور جو بھی اللہ تعالیٰ کی مراد ہو ہم کو اس پر ایمان لانا چاہئے۔ (متقدمین کا متشابہات کے متعلق یہی معاملہ تھا کہ وہ اس کی مراد کو اللہ تعالیٰ کے حوالہ کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اللہ اعلم بمرادہ بذلک)

(اور یہ جو کہا گیا کہ مدار نیت پر ہے) تو یہ حقیقت ہے کہ نیت مختلف ہو سکتی ہے چنانچہ جو لوگ انکار اور شدت اختیار کرتے ہیں ان میں سے بعض کا مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ اس گناہ کی شناعت عوام کے قلوب میں باقی رہے تاکہ وہ جری اور بیباک ہو کر گمراہ نہ ہوں۔ اور بعض لوگوں کی شدت اور انکار کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان کو اس مرتکب سے غایت تعلق اور محبت ہوتی ہے اس لئے اسی کے بقدر انکار میں بھی شدت ہوتی ہے۔ (مشہور ہی ہے کہ نفرت بقدر الفت ہوا کرتی ہے) اور بعض اس لئے شدت کے ساتھ ترک تعلق کر لیتے ہیں کہ ان کو اسکی صحبت سے ضرر کا اندیشہ ہوتا ہے اس لئے وہ خود کو ضرر سے بچانے کے لئے کنارہ کش ہی ہو جاتے ہیں۔ اور بعضوں کے پیش نظر انسان کا مخلوق ہونا اور حق تعالیٰ کے سامنے بالکل عاجز اور بے بس ہونا ہوتا ہے۔ نیز خدا تعالیٰ کی جباریت اور قہاریت بھی ان کے سامنے ہوتی ہے انکو اس لئے غصہ آتا ہے کہ یہ شخص اپنی بساط کو بھی نہیں دیکھتا اس قدر عاجز و محکوم ہو کر بھی مالک جبار کی نافرمانی کرتا ہے۔ پس ان مجموعہ امور کے استحضار کے بعد اس سے بات کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ (ظاہر ہے کہ یہ بھی بغض للہ ہی کا فرد ہے)۔

لیکن یہ آخری وجہ شدت کبھی تساہل اور مداہنت کا بھی سبب بن جاتی ہے کہ بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ بیچارہ عاجز اور کمزور ہے اللہ غفور رحیم اور مہربان ہے اس پر رحم فرمادے گا۔ یہ سمجھ کر خود بھی سستی اور چشم پوشی کر جاتے ہیں اور اس منکر سے اس کو روکتے نہیں۔ یہ طریقہ اچھا نہیں ہے۔ اسی لئے (امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا معاملہ اہم ہے) جس شخص سے کوئی برائی دیکھے تو اسکے معاملہ میں غور و فکر کرنا اور تحقیق و تثبیت کے بعد ہی کوئی قدم اٹھانا چاہئے۔ نیز تکلف اور تقلید کو اس باب میں راہ نہ دے کہ یہ شرع سے خارج بات ہے۔ یعنی محض دیکھا دیکھی کہ فلاں شخص تو لوگوں پر ان کی اصلاح کے سلسلہ میں غصہ اور سختی سے کام لیتا ہے لہٰذا میں ایسا ہی کروں یہ نہیں کرنا چاہئے۔ (یہاں سے اس امر کی شناعت معلوم ہوئی کہ جو بعض مریدین اپنے شیخ کی ریس کرتے ہیں غصہ اور شدت میں اور فرق نہیں کرتے غصہ رحمانی میں اور نفسانی میں حضرت مرشدیؒ ایسے امور پر سخت نکیر فرماتے تھے۔ از مترجم) پس انسان کو چاہئے کہ ایسے مواقع پر (نرمی کے ساتھ) اس مرتکب معصیت کے قلب میں اس کے فعل کی مذمت ثابت کرے اور اپنی نیت کو خالص رکھے یعنی بے تکلف بدون تقلید کے اور بے لوث اس کو نصیحت کرے۔ اور معیار اس کا (کہ نصیحت میں نرمی اخلاص کی وجہ سے ہے یا اس کا منشاء مداہنت ہے) یہ ہے کہ یہ دیکھو کہ اگر کسی

شخص نے خاص اس کے حق میں تقصیر کی ہو تو اس کا اس کے ساتھ کیا برتاؤ ہوتا ہے۔ یہ اگر اس کو بھی معذور کہے اور اس سے بدلہ نہ لے تو اس کی نرمی مستحسن اور مقبول ہے اور اگر ایسا ہے کہ اپنے حق کی تقصیر میں تو انتقام لینے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتا اور شریعت کے معاملہ میں یا کسی دوسرے کی حق تلفی کے موقع پر حقیقت حال پر پردہ ڈالنے کے لئے کسی بزرگ کی تقلید کو بہانہ بناتا ہے۔ یعنی شرع کے اور دوسروں کے حقوق کو شرارت کی وجہ سے تلف کرتا ہے اور بہانہ اس میں تقلید غیر کا کرتا ہے کہ میں نے فلاں کی دیکھا دیکھی ایسا کیا ہے۔ اگر کوئی شخص ایسا کرتا ہے تو قسم کھا کر کہتا ہوں کہ واللہ یہ شخص تلبیس ابلیس میں مبتلا ہے۔ (نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سیّات اعمالنا۔ وَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ وَشِرْکِہٖ)

اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے باب میں اس قسم کی مداہنت اور تساہلی کا باعث اکثر و بیشتر دوسروں کی رعایت اور وحشت سے اس کو بچانا ہوا کرتا ہے۔ آدمی خیال کرتا ہے کہ اس کو اگر ٹوک دوں گا تو اسکے قلب کو ٹھیس لگے گی مجھ سے اس کو توحش ہو گا لہٰذا ہٹاؤ جانے دو۔ کیوں کسی کی دل آزاری کا سبب بنو اور کیوں کسی سے برے بنو تو سمجھ لو کہ یہ بھی شیطانی فریب ہے (اور فریب اس لئے ہے کہ اگر بالفرض مداہنت برت کر اس کی نظروں میں خوش اخلاق بن گئے مگر خدا اور رسول اور صالحین کی نظروں سے گر گئے تو یہ سودا تو خسارے ہی کا ہوا گو تم اس کو سودمند سمجھ رہے ہو) بہرحال اگر اس برائی کی تغییر پر اور اس عاصی کی سزا اور تعزیر پر قدرت نہ ہو تو کم از کم اتنا تو کرے ہی کہ اس معصیت کو دل سے برا جانے اور اس کے مرتکب سے اعراض کرے (یعنی اس سے کٹا کٹا سا رہے اس طرح سے کہ اس کو اس کا احساس ہو جائے کہ میری فلاں حرکت کی وجہ سے مجھ سے ناراض ہیں۔ کیونکہ ایمان کا آخری درجہ یہی ہے کہ کسی برائی کو قلب سے برا جانے)۔

بغض للہ اور انکار علی المنکر کے جو آداب یہاں اجمالاً مذکور ہوئے ان سے ثابت ہوا کہ اظہار بغض کا اعلیٰ درجہ تو ترک تعلق، اعراض کلی اور نرمی نہ کرنا نیز اعانت علی الاثم سے رک جانا ہی ہے لیکن جاننا چاہئے کہ یہ ایسا حکم نہیں ہے کہ ہر ظاہری عمل پر لاگو ہی ہو جائے اور ہر شخص کو اسکا مکلف قرار دیکر سب ہی پر اس کو واجب کر دیا جائے جس طرح سے دیگر واجبات شرعیہ ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ شراب پینے والے اور بدکاری کے ساتھ متصف ہونے والے آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور حضرات صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں بھی تو ہوئے ہیں لیکن ان کے ساتھ معاملات مختلف تھے۔ یہ بھی نہیں تھا کہ ان سب کو بالکل ہی چھوڑ دیا جاتا تھا بلکہ بعضوں پر تشدد اور سختی کی جاتی تھی۔ اور بعضوں سے صرف اظہار بغض و عداوت پر اکتفا کیا جاتا تھا۔ اور ایسا بھی ہوا کہ بعضوں سے اصلاً تعارض نہیں کیا گیا اور بعضوں پر بجائے تشدد کے رحمت اور شفقت کا معاملہ کیا جاتا تھا اور ان سے اعراض بھی نہیں کیا جاتا تھا یہ اس واقعہ کے بعد بھی پہلے کی طرح گھلے ملے رہتے

تھے۔
یہی وہ دینی حقائق ہیں کہ جن میں سالکین طریقت کے احوال مختلف ہوتے ہیں اور ہر ایک کا عمل حال اور وقت کے مناسب ہوا کرتا ہے یعنی جن اہل معاصی پر قدرت ہوتی تھی ان پر تشدد کرتے تھے اور جہاں قدرت نہ ہوتی صرف بغض و عداوت کا اظہار فرمادیتے اور جن سے ضرر کا خوف ہوتا ان کی جانب توجہ بھی نہ فرماتے اور جو لوگ کہ غریب و مسکین ہوتے اور توقع ان کے اسلام کی ہوتی ان پر رحم و شفقت کی جاتی تھی۔

اور اس باب میں معاملہ صرف کراہت اور استحباب ہی کا ہے۔ حرمت اور وجوب کا تو مسئلہ نہیں ہے۔ جس طرح سے کہ دیگر فضائل اعمال کا حال ہے کہ وہاں بھی سوال کراہت اور استحباب ہی کا ہوتا ہے۔ پس بروں سے بغض وغیرہ نہ رکھنا یہ مکروہ ہے یعنی حرام نہیں ہے۔ اسی طرح سے ان سے بغض رکھنا یہ مستحب ہی ہے واجب نہیں۔ چنانچہ انہی جیسے امور کے لئے آتا ہے کہ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ یعنی اعمال کا بدلہ اور ثمرہ نیت پر موقوف ہے۔ پس اگر کوئی شخص اس موقع پر نرمی اور رحم کر رہا ہے تو ہو سکتا ہے کہ اس نے طریقہ تواضع اور خلق کا اختیار کیا ہو اور یہ چاہا ہو کہ تنبیہہ اور اعراض میں چونکہ شیوہ تکبر اور بڑائی کا پایا جاتا ہے اس لئے اس کے شائبہ سے بھی بچو۔ باقی ان امور میں حاکم اور مفتی چونکہ اپنا قلب ہے۔ (اس لئے اسی کے فتوے کا اعتبار ہے اور اس کو انسان خوب جانتا ہے لہٰذا کسی کو کسی کی نیت پر حملہ کرنے کی اجازت نہیں ہے) پس طالب صادق یعنی مخلص کو بھی چاہئے کہ اپنے نفس کی جانب سے خوب ہوشیار رہے۔ اور اپنی طبیعت اور خواہش نفس کے خلاف ہی معاملہ کرے کیونکہ جس طرح سے کہ شدت انکار اور اعراض سے مقصود کبھی اپنی صلاح کا اظہار اور تسکین نفس وغیرہ (امور غیر مشروعہ) ہو سکتے ہیں اسی طرح سے نرمی اور رحم میں بھی (خلاف اغراض مثلاً مداہنت' بیجا دلجوئی یا اور دوسری اغراض دنیویہ مثلاً مال' جاہ یا حلم و تواضع کے ساتھ خود کا مشہور ہونا یا لوگوں کی خوشی اور تعریف کا حاصل کرنا وغیرہ بھی تو متصور ہو سکتا ہے۔ چنانچہ جو شخص اپنے احوال میں غور کرے گا امید ہے کہ اس پر یہ چیزیں مخفی نہ ہوں گی اور مشائخ کی حکایات اور ان کے واقعات اہل معاصی کو زجر کرنے اور ان سے اعراض کرنے کے یا ان کے ساتھ نرمی اور عفو کا معاملہ کرنے کے باب میں بیشمار ہیں اور ان کے معاملے کا اختلاف ان لوگوں کے حالات کے اختلاف کے سبب سے تھا۔ یعنی جس بزرگ نے زجر و توبیخ کی تو اس شخص کے حالات کا تقاضا تھا اور جن حضرات نے نرمی سے کام لیا تو وہ موقع اسی کا تھا جیسا کہ ہم نے اس کو مفصل بیان کر دیا ہے۔

فصل دوم

شرائط یارانہ اور اہل صحبت کی صفات کے بیان میں

جاننا چاہئے کہ عام طور سے تو دوستی کسی غرض اور فائدہ ہی کی خاطر کی جاتی ہے۔ اگرچہ ممکن یہ بھی ہے کہ دو شخصوں میں اتفاقاً یا طبیعت اور جنسیت کے توافق کی وجہ سے تعلقات قائم ہو جائیں مگر ایسا شاذ و نادر ہوتا ہے اور اس میں اختیار کو بھی دخل نہیں ہے اس لئے یہ محل ثواب و عذاب بھی نہیں ہے۔

پس اکثر حال تو یہی ہے کہ دوستی کسی نہ کسی فائدہ ہی کے پیش نظر ہوا کرتی ہے اور فائدہ کی دو قسمیں ہیں دینی اور دنیاوی۔ دنیوی سے مراد یہ ہے کہ وہ نفع صرف دار دنیا تک محدود رہے اخروی فوائد کی تحصیل کے لئے مدد و معاون نہ بنے مثلاً پاس مال کا ہو جانا یا جاہ حاصل کرنا یا کسی سے ملاقات کر کے انس حاصل کرنا یا اس کے جوار اور پڑوس میں رہنے سے سکون حاصل ہونا۔ اور عقل کے مناسب حال تو یہی ہے کہ دوستی سے مقصود یہ سب اغراض (دنیویہ دنیہ) نہ ہو بلکہ مصاحبت سے مقصود کسی دینی نفع کی تحصیل ہو مثلاً علم دین یا عمل حاصل کرنا یا اس قدر مال ہی حاصل کرنا مقصود ہو جو کہ اس کی معیشت (گزران) کے لئے کافی ہو تاکہ اس کی وجہ سے قلبی تشویش رفع ہو کر اس کو فراغ خاطر حاصل ہو جائے۔ یا دوستی سے مقصود یہ ہو کہ جن مصائب اور حالات میں گھرا ہوا ہے اور جن کی وجہ سے فتور اوقات اور قصور عبادات کا شکار ہو رہا ہے ان کے ازالہ میں اس سے مدد حاصل کرے (کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ دوست و احباب کی وجہ سے انسان کا بڑے سے بڑا غم غلط ہو جاتا ہے) یا یہ مقصود ہو کہ (اس کی صحبت کی برکت کی وجہ سے حب مال یا حب جاہ سے خلاصی نصیب ہو جائے گی جو کہ قلب کے لئے زنجیر بن کر سبب تشویش خاطر بنے ہوئے ہیں۔ یا مقصد کسی کی محبت اور تعلق سے یہ ہو کہ اس کی دعا و توجہ کو اپنی جانب مبذول کرائے تاکہ اس کی نظر عنایت سبب حصول مطالب بنے (کیونکہ حدیث میں دعا کے متعلق آتا ہے کہ لَا یَرُدُّ الْقَضَاءَ اِلَّا الدُّعَاءُ یعنی دعاء مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں) اور اگر بالغرض دنیا میں مقاصد نہ بھی ملے تو کم از کم اس تعلق کا نفع آخرت میں بشکل شفاعت تو ظاہر ہی ہو گا (کیونکہ ولی اور بزرگ تو بجائے خود رہے قیامت کے دن عام مومنین میں سے بھی بعض بعض کی شفاعت کریں گے) اسلاف میں سے بعض سے منقول ہے کہ مسلمانوں میں سے جس قدر زیادہ سے زیادہ ہو سکے اپنے بھائی (یعنی مخلص دوست) پیدا کرو۔ اس لئے کہ ہر مومن کو اپنے بھائی سے شفاعت کی امید ہو گی یعنی یہ کہ جب وہ خود بخش دیا جائے گا تو

اپنے بھائی مسلمان کو بخشوانے کی بھی فکر میں رہے گا۔ چنانچہ امیر المومنین حضرت علیؓ نے فرمایا ہی ہے کہ تم اپنے اوپر زیادہ دوست بنانے کو لازم پکڑو اس لیے کہ اپنا بھائی دنیا اور آخرت ہر جگہ کام آتا ہے (اور دلیل اس کی یہ ہے کہ) کیا تم نے اہل دوزخ کا حال نہیں سنا کہ وہ وہاں کہیں گے کہ فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ یعنی ہائے افسوس آج ہمارا نہ کوئی سفارشی ہے اور نہ کوئی یار و مددگار اور غمخوار۔ (مطلب یہ کہ وہ لوگ سفارشی اور دوست کو ترسیں گے اس سے اکلا کہ مومن کو اپنے سفارشیوں اور دوستوں سے تقویت رہے گی)۔

غرض جب دوستی کا نفع معلوم ہو گیا تو اس سے یہ بات بھی سمجھ میں آگئی کہ یقیناً یارانہ کے لائق (یعنی قابل دوست بنانے کے) وہی شخص ہے جس کی صحبت سے یہ منافع حاصل بھی ہوں۔ اب رہی یہ بات کہ کون شخص مصاحبت کا اہل ہے اور کون نہیں اس کی پوری شناخت تو کسی کے ظاہری حالات دیکھنے اور اسکا پورا تجربہ کرنے کے بعد ہی ہو سکتی ہے تاہم شرائط مصاحبت (یعنی یارانہ) کے متعلق اجمالاً اتنا ضرور لحاظ رکھنا چاہئے کہ جس شخص کی صحبت میں رہنا چاہے تو پہلے یہ دیکھ لے کہ وہ عاقل بھی ہے یا نہیں کیونکہ احمق شخص کی صحبت میں کچھ بھی خیر نہیں ہے۔ انجام کار اس کا انقطاع تعلق بلکہ عداوت ہے۔ اسی لئے بزرگوں نے کہا ہے کہ نادان دوست سے دانا دشمن بہتر ہے۔

دشمن دانا کہ پئے جاں بود
بہتر ازاں دوست کہ ناداں بود

یعنی وہ عقلمند دشمن جو کہ خون کا پیاسا ہو احمق دوست سے بہرحال اچھا ہی ہے۔

حضرت سفیان ثوریؒ نے فرمایا ہے کہ کسی احمق کے چہرہ کی جانب دیکھنا ان گناہوں میں سے ایک بڑا گناہ ہے جو (کسی انسان) کے نامۂ اعمال میں لکھے جاتے ہیں اور بعض حضرات کا ارشاد ہے کہ احمق سے انقطاع اور انفصال ہی بعینہ حق تعالیٰ سے اتصال ہے۔ اور عاقل سے مراد وہ شخص ہے جو ہر شے کے مقصود کو سمجھتا ہو (مثلاً نصیحت میں نرمی و سختی ہی کا مسئلہ ہے تو) وہ سمجھتا ہو کہ اس سے کیا مقصود ہے اور اس سے کیا مقصود ہے۔ اسی طرح سے طاعات کے حقائق اور معاصی کے دقائق سے واقف ہو چنانچہ عقل کی شرع میں جہاں کہیں بھی مدح آئی ہے اس سے یہی مراد ہے اور حدیث میں بھی آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی مخلوق عقل سے زیادہ شریف نہیں ہے۔ ایک دفعہ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کسی کی تعریف کی اور اس میں کچھ مبالغہ کیا، آپؐ نے فرمایا کہ اس شخص کی عقل کیسی ہے؟ ان لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم لوگ تو اس کے اجتہاد فی العبادۃ (یعنی عبادت اور خیرات میں کوشش کرنے) کی تعریف کر رہے ہیں اور آپ اس کی عقل کی بابت دریافت فرما رہے ہیں، آپؐ نے فرمایا (کہ بھائی عقل ہی تو بڑی چیز ہے) احمق اپنے

حمق کے سبب ایسے ایسے گناہ کرلیتا ہے کہ فاسق وفاجر کے گناہ سے بھی بڑھ جاتا ہے نیز قیامت میں عبادات کے درجوں میں جو تفاوت ہو گا وہ عقل ہی کے مراتب کی بنا پر ہو گا۔

امیر المومنین حضرت عمرؓ سے منقول ہے آپ نے فرمایا کہ انسان کے لئے کوئی چیز عقل سے بڑھ کر نہیں ہے کیونکہ یہی آدمی کو سیدھی راہ بتاتی ہے اور اس کو تمام گمراہیوں سے بچاتی ہے۔ بلاشبہ انسان کا ایمان کامل نہیں ہوتا اور اس کا دین مستقیم نہیں ہوتا بدون کمال عقل کے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ دنیا میں انسان کے لئے فضل اور بزرگی کس چیز سے ہے؟ آپ نے فرمایا کہ عقل سے۔ پھر عرض کیا اور آخرت میں کس چیز سے فضیلت حاصل ہوتی ہے؟ آپ نے فرمایا عقل سے۔ یہ سن کر حضرت عائشہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا اعمال کے سبب سے فضیلت نہیں ہوا کرتی؟ آپ نے فرمایا اے عائشہ ہر عمل بقدر عقل ہی کے ہوا کرتا ہے یعنی جو شخص زیادہ عقل والا ہوتا ہے اس کے اعمال بھی زیادہ ہی ہوتے ہیں (مقدار عمل اگر بالفرض زیادہ نہ بھی ہوئی تو کیفیت عمل یقیناً اس کی بڑھی ہوتی ہے اسی طرح اگر قالبی عمل زیادہ نہ ہوئے تو قلبی اور باطنی عمل تو عاقل ہے کے زیادہ ہوتے ہیں) غرض احادیث اور آثار صحابہؓ عقل کی فضیلت میں بکثرت وارد ہیں۔

(شرط) منجملہ شرائط دوستی کے ایک یہ بھی ہے کہ اس شخص کے اخلاق بھی اچھے ہوں اس لئے کہ بہت سے لوگ عاقل تو ہوتے ہیں یعنی اپنی عقل سے اشیاء کی حقیقت اور ماہیت تو دریافت کرلیتے ہیں مگر بہ سبب وجود رذائل مثلاً غصہ، شہوت، بخل، وغیرہ کے وقت پر اپنی خواہشات نفسانی کا اتباع کرلیتے ہیں گویا (اخلاق درست نہ ہونے کی وجہ سے) اپنی معلومات کے خلاف عمل کرتے ہیں پس حسن الخلق ہونے کی شرط گویا کہ پہلی شرط یعنی عقل ہونے کا تتمہ ہی ہے یعنی فی الحقیقت دونوں مل کر ایک ہی شرط ہے کیونکہ مقصود یہ ہے کہ عاقل ہو اور اپنی عقل کے تقاضے پر عمل بھی کرنے والا ہو۔ اور اگر صرف پہلی ہی شرط (یعنی عقل) پر اکتفا کرے تو بھی روا ہے (مطلب یہ کہ کام چل جائے گا کیونکہ جب کہ وہ عاقل ہے تو دوسرے کو غلط راستہ نہ بتلادے گا اس لئے کہ یہاں کوئی مزاحم نہیں ہے اور خود جو چوک گیا تو وہ اپنے نفس کی خواہش کی وجہ سے جو اس کو تو اپنے موافق چلائے گی دوسروں کو نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم)

(شرط) ایک شرط مصاحبت کی یہ ہے کہ وہ ہم نشین فاسق نہ ہو یعنی ایسا نہ ہو کہ اپنے فسق وفجور پر مصر ہو اور فسق کو عادت بنالیا ہو۔ اس لئے کہ فاسق کی صحبت سے نفع کی کچھ امید نہ رکھنی چاہئے کیونکہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے حقوق کے فوت کرنے سے نہیں ڈرتا اس کو تمہارے حقوق کی کیا پرواہ ہو گی۔

کو فرض خدا نمی گذارد
از قرض تو نیز غم ندارد

نیز یہ کہ فسق کمال عقل کے بھی منافی ہے (پس معلوم ہوا کہ اس کے اندر عقل کی بھی کمی ہے) اور بعضے فاسقوں سے کبھی نفع جو پہونچ جایا کرتا ہے مثلاً شراب پیتا ہے اور سخی ہے تو یہ نفع اس کے ضرر کے مقابلہ میں بہت ہی قلیل ہوتا ہے۔ نیز اس کو ثبات نہیں ہوتا اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ زر دیتا ہے اور سر کاٹتا ہے۔

(شرط) ایک شرط کسی کو دوست بنانے کی یہ ہے کہ وہ بدعتی نہ ہو (مومن۔ نہیں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم) کیونکہ اس کی صحبت سے اندیشہ ہے کہ بدعت خود اس کے اندر سرایت کر جائے اور اسکی برائی اس میں بھی اثر کر جائے۔ نعوذ باللہ من ذالک۔ پس راہ حق یہی ہے کہ بدعتی سے انقطاع کلی ہی کرے اور اس سے تعلقات دوستی نہ رکھے۔ اسی طرح سے اگر یہ سمجھتا ہے کہ مباحثہ اور مناظرہ کچھ مفید نہ ہوگا تو اس سے مباحثہ بھی نہ کرے اور اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ بحث و مباحثہ لاحاصل ہی ہوتا ہے۔ (وجہ اس کی یہ ہے کہ ہدایت کی توفیق اس کو ہوتی ہے جو اپنے کو خطا کار سمجھے اور یہ تو اپنے کو خود مہتدی جانتا ہے اور اپنے فعل کو ہدایت تصور کرتا ہے اس لئے بدعت کے چہ بچہ سے نکلنا اس کو نصیب نہیں ہوتا اللّٰھم احفظنا)۔

(شرط) ایک شرط ہم نشینی کی یہ ہے کہ وہ دنیا کا حریص نہ ہو تاکہ تمہارے اندر بھی دنیا کی حرص نہ پیدا ہو جائے کیونکہ دنیا کا حریص حقیقت میں دیوانہ ہے گو ظاہر میں عاقل معلوم ہوتا ہو اور یہ ایسی بیماری ہے جس کی کوئی دوا نہیں اور اس مرض کا علاج ہی کیا ہو سکتا ہے جس میں خود (طبیب یعنی) علماء بھی گرفتار ہوں۔ لیکن جو حقیقی عالم ہیں وہ راہ آخرت کے چلنے والے ہیں اور مقصود ان کا علم سے عمل ہے۔ وہ البتہ اس بلا سے محفوظ ہوتے ہیں ورنہ تو حرص کی بیماری سے نجات دینے والی دوا کا دستیاب ہونا بڑا ہی مشکل ہے۔ (اسی کو شیخ سعدی نے فرمایا ہے کہ۔

گفت چشم تنگ دنیا دار را
یا قناعت پر کند یا خاک گور

(جن اوصاف کا ذکر اوپر ہوا ہے ان سے جو لوگ متصف ہوں وہی لوگ ہیں جو صحبت کے لائق ہیں اگر اللہ تعالیٰ نصیب فرمائے تو انسان ایسوں کی صحبت میں بیٹھے ورنہ بس ان حضرات کی کتب کا مطالعہ خوب ہے یعنی صحبت کالی الجملہ بدل ہے کیونکہ اس کو بھی نفس کی شورش کے توڑنے میں خاصا دخل ہے اور اس کی بھی تاثیر یقینی ہے اور ادنیٰ فائدہ اس کا یہ ہے کہ جہل مرکب سے خلاصی ہو جاتی ہے (یعنی کم از کم آدمی کو اپنے جہل کا علم ہو جاتا ہے کیونکہ جہل مرکب اسی کو کہتے ہیں کہ انسان ایک بات کو نہ جانے اور یہ بھی نہ جانے کہ میں اس کو نہیں جانتا یہ تو بہت ہی برا ہے۔

آنکس کہ نداند و بداند کہ بداند
در جہل مرکب ابد الدہر بماند

چنانچہ اس زمانہ میں جو فائدہ کہ ایک طالب صادق کو مشائخ اہل حق کی کتابوں سے ہو جاتا ہے وہ مشائخ زمانہ کی ہم نشینی اور صحبت سے نہیں حاصل ہوتا۔ غرض حاصل ان تمام کا یہ ہے کہ بداخلاق کی صحبت سے احتراز کرے کہ اسی میں سلامتی ہے اور بلاوجہ اپنا وقت نہ ضائع کرے کہ عمر گرانقدر ہے اور شئی عزیز ہے اور اکثر و بیشتر انسان کو جو نقصان پہونچتا ہے وہ صحبت بدی سے پہونچتا ہے اور آخرت میں اس کا ثمرہ سوا ندامت کے اور کچھ نہیں ہے۔ حضرت سہل تستری فرماتے ہیں کہ تین شخصوں کی صحبت سے پرہیز کرو۔ اہل ظلم سے جو کہ غافل ہوں۔ ایسے علماء سے جو بے عمل ہوں اور ان صوفیوں سے جو جاہل ہوں۔ (اور جو شخص کہ ضروریات دین سے بھی جاہل ہو وہ صوفی اور بزرگ ہی نہیں ہے۔ (مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلِيًّا جَاهِلًا قَطُّ اللہ تعالیٰ نے کبھی کسی جاہل کو ولی نہیں بنایا)۔

فصل سوم اُخوۃ اور دوستی کے حقوق کا بیان

جانو کہ عقد اخوۃ (یعنی بھائی چارہ) اس ربط اور تعلق کو کہتے ہیں جو دو یا چند آدمیوں کے درمیان ان کے باہم متفق ہو جانے کی وجہ سے قائم ہوا ہو۔ جیسے کہ عقد نکاح باہم زوجین میں قائم ہو جاتا ہے پس اس کے حقوق کی ادائیگی جانبین پر لازم ہوتی ہے تاکہ عقد اخوت باقی رہے۔ چنانچہ ایک حق اخوت کا یہ ہے کہ اپنے اس ساتھی کے لئے تمہارے مال میں سے بھی کچھ حصہ ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ دو بھائیوں کی مثال دو ہاتھوں کی سی ہے کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کو دھوتا اور صاف کرتا ہے۔ مطلب یہ کہ گندگی کے ازالہ میں ہر ایک دوسرے کا معین بنتا ہے اور منافع میں دونوں آپس میں شریک ہوتے ہیں۔ بہرحال مال کے ساتھ کسی کو نفع پہونچانے کے تین درجے ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ اپنے ساتھی کو (جس کو مال دے رہا ہے اس کو) اپنے خادم اور غلام کی مانند جانے یعنی اپنی ضرورت اور حاجت سے جو مال زائد ہو اس سے اس کی مدد کرے اور یہ سب سے کم درجہ ہے اگر اتنا بھی نہ ہو تو پھر اخوت ہی کیا ہے؟ اور چاہئے کہ اس مرتبہ میں انتظار اس کے مانگنے اور سوال کرنے کا بھی نہ کرے کہ یہ اس کے حق میں غایت تقصیر ہے۔ حاصل یہ ہے کہ اپنی حاجت سے جو مال زائد ہو اس کے ذریعہ بھائی مسلمانوں کی از خود اعانت کرے اس کے مانگنے کا منتظر نہ رہے۔

اور دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ تو اس کو اپنی طرح جانے اور اپنے مال میں اس کو برابر کا شریک ہی بنالے یعنی نصف کا مالک تو رہے اور نصف کا مالک اس کو بنادے۔ یہ اوسط درجہ ہے۔ اور اخوت کا

اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ تو ایثار پیشہ ہو جائے یعنی اس کی حاجت کو اپنی حاجت پر مقدم جانے اور یہ رتبہ صدیقوں کا ہے۔ جیساکہ حدیث میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد کے موقع پر لشکر تیار کرنے کے لئے مالدار صحابہؓ سے مال طلب فرمایا تمام صحابہؓ اپنا آدھا آدھا مال لے آئے اور بقیہ نصف اپنے اہل و عیال کے لئے گھر چھوڑ آئے لیکن امیرالمومنین صدیق اکبرؓ اپنا سارا ہی سامان لے آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابو بکرؓ بال بچوں کے لئے کیا چھوڑ کر آئے ہو؟ حضرت صدیقؓ نے عرض کیا کہ اَللّٰہُ وَ رَسُولُہٗ یَکْفِی یعنی ان کے لئے اللہ اور اس کا رسول کافی ہے۔

پروانہ کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیقؓ کے لئے ہے خدا اور رسول بس

یہ جواب سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے فرمایا کہ تم میں اور ابو بکرؓ میں وہی فرق ہے جو تمہارے اور ان کے افعال میں فرق ہے۔ (جس کا تم نے ابھی مشاہدہ بھی کرلیا ہے یہ بیان تو مالی ایثار کا تھا) رہا جان اور نفس کا ایثار تو اس کا بھی یہی حکم ہے یعنی دوسرے کی جانوں کو اپنی جان سے مقدم جانے۔ چنانچہ منقول ہے کہ ایک امیر نے کسی غلط فہمی کی بنا پر صوفیہ کی ایک جماعت کو پکڑلیا اور ان سب کے قتل کا حکم دیدیا اس جماعت میں شیخ ابو الحسن نوریؒ بھی تھے جلاد نے چاہا کہ تلوار چلائے کہ اتنے میں شیخ ابو الحسن نوریؒ آگے بڑھے اور کہا کہ سب سے پہلے مجھے مارو کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ اپنے بھائیوں کو تھوڑی دیر اور زندہ رہنے میں اپنے اوپر ترجیح دوں کہ یہ ایثار ہے اور یہ مجھے پسند ہے۔ امیر کو جب اس بات کی اطلاع ہوئی تو اس نے ساری جماعت کو رہا کردیا۔ (سمجھا ہوگا کہ یہ نیک اور صوفی لوگ ہیں بے قصور قید ہو گئے)۔

بعض اسلاف نے لکھا ہے کہ جب کسی شخص کا دوست اس سے کہے کہ اپنے مال میں سے کچھ مجھے دیدو اس پر وہ مال والا اس سے یہ پوچھ لے کہ کتنا مال تمہیں درکار ہے؟ تو یہ شخص دوستی اور اخوت کے لائق نہیں ہے اس کو یہ چاہئے تھا کہ اپنا سب مال اس کے سامنے پیش کردیتا پھر وہ خود بقدر حاجت اس میں سے لے لیتا۔ اسی طرح سے مروی ہے کہ اسلاف میں سے ایک بزرگ اپنے کسی دوست کے پاس گئے اور اس سے کہا مجھے چار ہزار درہم کی ضرورت ہے تم مجھے دیدو اس نے کہا کہ دو ہزار لیجاؤ وہ بزرگ واپس چلے آئے اور فرمایا کہ تو نے خدا کے مقابلہ میں دنیا کو ترجیح دی اس لئے تو اخوت کے لائق نہیں ہے (مطلب یہ کہ میرا تم سے تعلق خدا کے لئے تھا اور تم دے بھی سکتے تھے مگر پھر جو تم نے نہیں دیا اس سے معلوم ہوا کہ دنیا کی محبت غالب ہے اور حب فی اللہ مغلوب ہے) اسی طرح سے حضرت فتح موصلیؒ جو اکابر اولیاء اللہ میں سے تھے ان کا واقعہ ہے کہ اپنے ایک مسلمان بھائی (دوست) کے مکان پر آئے مگر اس کو موجود نہ پایا پس اہل خانہ سے اس کا صندوق

منگوایا اور جس چیز کی ضرورت تھی اس میں سے نکال کر لے گئے۔ جب وہ شخص آیا تو ایک خادم نے اس کو اس واقعہ کی اطلاع دی اس نے کہا اگر تو سچ کہتا ہے یعنی واقعہ ایسا ہی ہوا ہے جیسا تو نے بیان کیا ہے تو میں نے تجھ کو آزاد کیا اس لئے کہ تو نے مجھے اس خبر سے خوش کر دیا۔

اسی طرح ایک شخص حضرت ابو ہریرہؓ کے پاس آیا اور کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ تم سے خدا کے لئے مواخاۃ (یعنی بھائی چارہ) کروں۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ تم اس کو نہیں کر سکتے اس لئے کہ اخوت کے حقوق بہت مشکل ہیں اس شخص نے کہا کہ فرمایئے وہ کیا ہیں کہ میں بھی تو جان لوں حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا بس یہ سمجھ لو کہ مواخاۃ اس کو کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں تمہارے نزدیک ایسا ہو جاؤں کہ پھر دنیا کی کوئی چیز تم کو مجھ سے زیادہ محبوب نہ رہے اس نے کہا واللہ میں تو ابھی اس مرتبہ کو نہیں پہونچا ہوں (ادب) جس شخص سے بھائی چارہ ہو اس پر کچھ خرچ کرنا فقیروں پر صدقہ کرنے سے بہتر ہے۔ (اور اپنے حقیقی بھائی پر خرچ کرنے کا ثواب اس سے بھی زیادہ ہے) حضرت علیؓ نے فرمایا کہ اگر میں عقد مواخاۃ والے بھائی کو بیس درہم دوں تو یہ دیگر فقراء پر سو درہم خیرات کرنے سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اور یہ بھی فرمایا کہ اگر میں کھانا لاؤں اور اس پر میرے عقد اخوت والے بھائی جمع ہوں تو اس کو میں ایک غلام آزاد کرنے سے کہیں بہتر تصور کروں گا۔ اور یہ سب حضرات ایثار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے پیرو تھے اس لئے کہ آپؐ بہت ایثار فرماتے تھے یعنی آپ اپنے صحابہؓ کو اپنے پر سب چیزوں میں ترجیح دیتے تھے اور مقدم رکھتے تھے۔

دوستی کے حقوق منجملہ حقوق اخوت کے ایک حق یہ ہے کہ جس طرح سے اپنے اس بھائی کی غم خواری مال سے کرتا ہے اسی طرح اس کی مدد اپنی جان و نفس سے بھی کرنے کو واجب جانے اور اس کی حاجت روائی کے لئے اس کے کہنے سے پہلے ہی تیار رہے۔ اور اس کے بھی تین مراتب ہیں اعلیٰ، اوسط، ادنیٰ، چنانچہ علماء نے لکھا ہے کہ جب تم نے اپنی حاجت اپنے کسی دوست کے سامنے پیش کی اور اس نے اس حاجت کے پوری کرنے میں سعی نہ کی تو اس کو مردہ تصور کرو اور اس پر چار تکبیریں کہہ کر اس سے الگ ہو جاؤ (مطلب یہ کہ نماز جنازہ پڑھ کر اس کو اور اس کی دوستی کو دفن کر دو) حدیث شریف میں آتا ہے کہ حق تعالیٰ کے لئے روئے زمین میں کچھ برتن ہیں اور وہ قلوب (بنی آدم) ہیں اور ان ظروف میں سے سب سے بہتر وہ ظرف ہے جو خوب صاف۔ نہایت مضبوط اور بہت نرم ہو۔ یعنی صاف ہو گناہوں کے میل کچیل سے اور مضبوط ہو دین کے اعتبار سے اور نرم ہو مسلمان بھائیوں کے حق میں۔ اور قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کا وصف ہی یہ بیان فرمایا ہے کہ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ یعنی آپس میں نہایت ہی رحمدل اور باہم خوب الفت اور محبت رکھنے والے تھے اور رحم کرنے والے تھے۔ اور یہ وصف (یعنی رحم) سب قسموں کی غمخواری کے لئے جامع ہے یعنی رحم ہو گا تو اس کی وجہ سے آدمی دوسروں کے سارے

حقوق ادا کرے گا اور جب آدمی میں رحم ہی نہ ہو تو اس سے کسی بھی حق کی ادائیگی کی توقع نہیں ہے۔

(۲) منجملہ حقوق اخوت کے ایک حق یہ ہے کہ دوست کے عیوب سے اس کے سامنے اور پیچھے سکوت بلکہ اس کی جانب سے تغافل اور تجاہل اختیار کرے (یعنی ایسا ہو جائے گویا اس کو جانتا ہی نہیں) اور جو بات وہ کہنے یا جو کام وہ کرے اس میں ردو کد نہ کرے۔ اسی طرح سے اگر اس کو کہیں راستہ میں دیکھے یا کسی کام میں پاوے تو یہ نہ کہے کہ تم کہاں سے آرہے ہو یا تم کیا کر رہے تھے کیونکہ ہو سکتا ہے وہ ایسی جگہ گیا ہو اور ایسا کام کر رہا ہو جس کے اظہار میں اس کو حجاب ہو اور اس شرم و حجاب کی وجہ سے وہ تم سے جھوٹ بول دے اور اپنے لئے دوزخ کا سامان کرلے (اور اس کے سبب تم ہوگے پس تمہارا اس کو ٹوکنا ہی صحیح نہ تھا)۔

اسی طرح سے جس بات کے ساتھ اس نے اپنے اس دوست کو خاص کیا ہے تو اس کو بھی چاہئے کہ اس بات کو کسی اور سے نہ کہے (اس لئے کہ شاید وہ شخص جس سے اس نے کہہ دیا ہے کسی چوتھے سے کہہ دے اور وہ بات مشہور ہو جائے اور اس پہلے شخص کا شبہ اپنے دوست پر جاوے کہ اسی نے کہا ہوگا)۔

(۳) اسی طرح سے دوست کا ایک حق یہ ہے کہ اس کے بھید اور راز کو کبھی ظاہر نہ کرے اگرچہ اس سے تعلقات منقطع ہو گئے ہوں اور جدائی ہو گئی ہو' اس لئے کہ یہ علامت ہے کم ظرفی اور بدباطنی کی اسی طرح سے اپنے دوست کے نیز اس کے اہل و اولاد کے وہ عیوب جن کے اظہار سے اس کو ایذا ہو ان کے ذکر کرنے سے بھی اجتناب کرے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کسی شخص کی برائی اس کے منہ پر نہیں فرمائی۔ روایت میں آتا ہے کہ ایک شخص آپؐ کے پاس زعفران کا رنگا ہوا کپڑا پہنے ہوئے گیا (جو کہ مردوں کو مناسب نہیں ہے عورتوں کو البتہ اجازت ہے) اس کے چلے جانے کے بعد آپؐ نے حاضرین سے فرمایا کہ اس شخص سے کہہ دینا کہ اس رنگ کو اپنے کپڑے سے دھو کر صاف کرلے تو بہتر ہے۔

(۴) اسی طرح سے ایک حق یہ ہے کہ اگر کسی سے اپنے دوست کا عیب سنے تو اس کے منہ پر آکر اس کو نہ بیان کرے کیونکہ اب درحقیقت یہی عیب کنندہ شمار ہوگا (کہ اس دوسرے نے غائبانہ کہا تھا اور اس نے تو منہ پر برائی کردی) اور یہ طریقہ زیادہ تر اہل نفاق اور اہل حسد اختیار کرتے ہیں (کہ برائی جو کرتے ہیں تو چھپا کر اور دوسرے پر ڈھال کر)۔

(۵) ایک حق اخوت کا یہ ہے کہ اگر کسی دوسرے سے اپنے دوست کی تعریف سنے تو اس کو اس سے بیان کردے کیونکہ تعریف کا چھپانا حسد کے قبیل سے ہے۔

(۶) ایک حق یہ ہے کہ اس کی تعریف میں مبالغہ نہ کرے بالخصوص جبکہ اس کی سرحد کذب

سے مل جائے یا موجب عجب و تکبر ہو رہا ہو۔ حاصل یہ کہ جو بات اس کو ناگوار ہو (جس بات سے اس کو ضرر پہونچے) اس سے سکوت اختیار کرے ہاں اگر اس موقع پر بولنا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے قبیل سے ہو تو وہ اس سے مستثنیٰ ہے کیونکہ اس وقت سکوت جائز نہیں اور خاموشی میں ضرر ہے اور اس کے برا ماننے کی پرواہ نہ کی جائے گی۔ اس لئے کہ حقیقت میں یہ احسان ہے اگرچہ بظاہر زجر و توبیخ کی صورت میں ہے۔ باقی امر و نہی کرنے میں بھی حلم اور لین کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے۔

اور اپنے نفس کو دوستوں کے عیب ڈھونڈھنے اور ان کی خطا پکڑنے سے بچانے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے احوال پیش نظر رکھے اور یہ دیکھے کہ ہمارے اندر بھی کچھ عیوب ہیں یا نہیں؟ بہرحال عیب کا نہ ہونا تو قریب قریب محال کے ہے اس لئے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کا قول نقل فرمایا ہے کہ وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِيْ إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ یعنی یوں میں اپنے نفس کو بالذات عیوب سے بری اور خواہشات کی جانب میلان سے پاک بھی نہیں کہتا کیونکہ نفس تو برائیوں کا حکم کیا ہی کرتا ہے (تو انبیاء جب یہ فرمائیں تو ہم کس شمار میں ہیں ان میں تو اللہ تعالیٰ کی عصمت بھی ہوتی ہے اور ہم تو سراپا عصیان میں لت پت ہیں) پس جبکہ تم خود عیب و نقصان سے نہ پاک ہوئے تو اپنے بھائی مسلمان کو بھی معذور رکھو اور یہ سمجھو کہ جس طرح سے کہ تم اپنی خصلت کو دور کرنے سے قاصر ہو اس طرح وہ بھی عاجز ہے نیز یہ کہ جس طرح سے کہ تم حق تعالیٰ کے حقوق میں تقصیر کرتے رہتے ہو اگر وہ تمہارے حق میں کچھ تقصیر کردے تو کیا بعید ہے۔ اور یہ بھی سامنے رکھو کہ عیبوں کو پوشیدہ رکھنا اللہ تعالیٰ کی صفت اور شان ہے (یعنی وہ جس طرح کہ غفار الذنوب ہے ستار العیوب بھی ہے) اسی لئے حدیث شریف میں یوں آیا ہے کہ "يَا مَنْ أَظْهَرَ الْجَمِيْلَ وَ سَتَرَا الْقَبِيْحَ" یعنی اے وہ ذات پاک جس نے کہ خوبی کو ظاہر کیا اور عیوب کو چھپایا۔ چنانچہ دیکھو خوبیوں کے ظاہر کرنے اور عیبوں کے چھپانے ہی کے قبیل سے یہ بھی ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے تمہاری حسین اور خوبصورت شکل و صورت تو ظاہر فرمائی اور تمہارے اندر جو برائی (اور غلاظت بھری) ہے یعنی پیشاب و پاخانہ کو تمہارے پیٹ کے اندر پوشیدہ رکھ دیا ہے۔

پس اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب بندوں میں محبوب ترین وہ بندہ ہے جو متخلق باخلاق اللہ تعالیٰ ہو یعنی خدائی اخلاق کے ساتھ متصف ہو مثلاً عفو و درگذر اور رحم وغیرہ اس کے اندر ہوں۔ اب خود دیکھو کہ جب اللہ تعالیٰ (بایں بزرگی و بڑائی) اپنے بندوں اور مخلوق کا عیب چھپالیتا ہے اور ان کے گناہوں کو معاف فرمادیتا ہے تو اگر تم اپنے برابر والے سے یا اپنے سے بڑے اور بہتر کے ساتھ یہ معاملہ کروگے تو کیسا کچھ اثر ہوگا؟ (غرض دوستوں کے عیبوں سے چشم پوشی ضروری ہے کیونکہ)

ایسے دوست کی تلاش جو تمام عیبوں سے پاک ہو ایک محال شے کو تلاش کرنے کے مرادف ہے۔ اور دور کرنا اس کے عیوب کا یعنی یہ خیال کرنا کہ کوئی عیب اس میں نہ رہ جائے تب اس سے ملوں گویا ترک مصاحبت کا ارادہ کرنا ہے اس لئے کہ کوئی انسان ایسا نہیں ہے کہ جو عیب سے بالکلیہ پاک ہو۔ ہاں یہ ہوگا کہ بعض باتیں کسی میں اچھی ہوں گی تو بعض باتیں بُری بھی ہوں گی لہٰذا اس سلسلہ میں زیادہ سے زیادہ یہ دیکھ لینا چاہئے کہ اس کی نیکیاں اس کی برائیوں پر غالب ہیں۔ بس یہ کافی ہے۔ باقی یہ فکر کہ اس کے اندر کوئی برائی ہی نہ ہو بڑی مشکل ہے۔ پس مومن منصف کی نظر ہمیشہ نیکیوں پر ہوتی ہے اور یہی سبب بنتی ہے محبت و الفت کا اور منافق بے انصاف کی نظر ہمیشہ برائی اور عیوب ہی پر رہتی ہے جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے۔

وَ عَيْنُ الرِّضَا عَنْ كُلِّ عَيْبٍ كَلِيْلَةٌ
وَلٰكِنَّ عَيْنَ السُّخْطِ تُبْدِيْ الْمَسَاوِيَا

یعنی رضا کی آنکھ ہر عیب سے تھکی ہوتی ہے اور غضب کی آنکھ برائیوں کو ظاہر کرتی ہے یعنی آدمی جس سے خوش ہوتا ہے اس کا عیب نہیں دیکھتا اور جس سے ناراض ہوتا ہے اس کی برائیاں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالتا ہے۔ ع نبیند مردم بدبیں مگر بد۔ یعنی برائی دیکھنے والے کو دوسروں میں برائی ہی نظر آتی ہے۔ ابن مبارکؒ نے فرمایا ہے کہ مومن ہمیشہ عذر طلب کرنے میں رہتا ہے اور منافق ہمیشہ عیب ہی کے تجسس میں لگا رہتا ہے۔ حضرت فضیل ابن عیاضؒ نے فرمایا کہ جواں مردی یہ ہے کہ تو اپنے بھائیوں کی لغزش پر گرفت نہ کرے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگو برے پڑوسی سے یعنی وہ کہ جب بھلائی دیکھے چھپالے اور جب کوئی برائی پاوے فوراً مشہور کرے۔

(۶) اور جس طرح سے کہ اپنے دوست کی برائیوں سے زبان کا روکنا واجب ہے اسی طرح لازم ہے کہ دل سے بھی سکوت اختیار کرے اور قلب کا سکوت یہ ہے کہ بدگمانی نہ کرے کیونکہ سوء ظن قلب کی غیبت ہے پس اس کے فعل کو جہاں تک ہو سکے بھلائی پر حمل کرے اور اگر تم نے اس کو کوئی غیر مناسب کام کرتے دیکھ بھی لیا ہو تو اس کے فعل کو سہو اور نسیان پر محمول کرو۔ اور اگر اس کا امکان نہ ہو تو پھر اس کو معذور سمجھو۔ (یعنی یہ کہ اس کے اندر نفسانی خواہش موجود ہے اور معصوم ہے نہیں اس لئے بیچارہ اس میں مبتلا ہو گیا) پھر بدگمانی کے متعلق یہ سمجھو کہ اس کا منشاء کبھی تو تفرس ہوتا ہے یعنی بعض قرائن اور علامات کو دیکھ کر بے اختیار قلب میں ایک بات آجاتی ہے اور راسخ ہو جاتی ہے مثلاً تم نے ایک شخص کو دیکھا کہ ہمیشہ صدارت اور بالانشینی کا طالب رہتا ہے اور اگر کوئی شخص اس کو اس سے روکتا ہے تو اس سے لڑ جاتا ہے اور اس کا تمام تر وقت اسی کے تذکرے میں اور بالانشینی کے اسباب کے حصول کے چکر ہی میں گذرتا ہے اس کی وجہ سے بلا اختیار تمہارے قلب میں یہ خیال گذرتا ہے کہ یہ متکبر شخص ہے تو اس گمان کو بہ تکلف بھی زائل کرنا ممکن نہیں

ہے تاہم بحد امکان اس کے دفع کرنے میں کوتاہی بھی نہ کرے۔

ایک اور قسم بد ظنی کی یہ ہے کہ اس کا منشاء (مظنون فیہ) سے بد اعتقادی ہو (یعنی سرے سے اعتقاد ہی اس کا برا ہے جس کی وجہ سے جو بات کسی کی دیکھتا ہے اس کو برائی پر حمل کرتا ہے) یہ ممنوع اور حرام ہے۔ کسی مسلمان کے حق میں یہ ٹھیک نہیں ہے خواہ وہ مصاحب (دوست) ہو یا غیر مصاحب۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ مومن پر حرام ہے کہ اپنے بھائی مسلمان سے بد گمانی کرے۔ اور یہ بھی فرمایا ہے کہ اپنے کو بد گمانی سے دور رکھو اس لئے کہ وہ بھی ایک قسم کا جھوٹ ہے۔ اب جو آدمی کہ بد عقیدہ ہی ہے تو وہ جس کا کوئی فعل دیکھے گا اگرچہ اس کے مختلف محل ہوں مگر وہ اس کو (اپنے اس کھوٹ کی وجہ سے) برے محمل ہی پر حمل کرے گا۔

بد گماں باشد ہمیشہ زشت کار
نامۂ خود خو اند اندر حق یار

سوء ظن رکھنے والا انسان بد عملی کا شکار ہوتا ہے۔ وہ اپنے دوست کے اندر اپنا ہی نامہ اعمال پڑھتا ہے یعنی اپنے مصاحب کے متعلق جو رائے قائم کرتا ہے وہ خود ہی ویسا ہوتا ہے کیونکہ دوست کے آئینہ میں وہ خود اپنی ہی تصویر دیکھتا ہے۔

اور اس بد گوئی اور عیب جوئی کا باعث زیادہ تر حسد بنتا ہے اس لئے کہ حاسد کی نظر میں سوا برائیوں کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ اگر نیکی دیکھتا ہے تو مرا جاتا ہے اور بعض لوگوں کے لئے عیب جوئی اور عیب گوئی کا سبب یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر میں اس کے ساتھ اظہار اعتقاد کروں تو لوگ مجھ کو برا جانیں گے اور اس سے کم سمجھیں گے۔ یعنی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص اس کے نزدیک بھی اچھا ہوتا ہے لیکن خیال مذکور کی وجہ سے اس کی تعریف نہیں کرتا ہے بلکہ برائی کرتا ہے اور عیب جوئی کے درپے رہتا ہے اور یہی معنی ہیں عار پر نار کے اختیار کرنے کے۔ یعنی عار کی وجہ سے آدمی دوزخ کو اختیار کرتا ہے جو کہ اس کی انتہائی بے عقلی کی دلیل ہے۔ اور بعض لوگوں کی اصل خلقت اور طینت ہی بد اعتقادی اور بد باطنی پر ہوتی ہے۔ یہ مرض لاعلاج ہے اور حاسد کا سینہ ہمیشہ عداوت اور کینہ سے لبریز رہتا ہے جب تک گفتگو کا موقع نہیں آتا عداوت اندر چھپی رہتی ہے اور علامت اس کی یہ ہے کہ جہاں اس کو ذرا موقع ملا اپنی اس عداوت کے ظاہر کرنے سے چوکتا نہیں۔

حاصل یہ کہ لوگوں کے قصور کے معاف کرنے میں کوتاہی نہ کرے اور جس مجلس میں کہ اٹھے بیٹھے جو کچھ اس میں سنے اس کو ان سنی کر دے کہ یہ بھی امانت ہے (یعنی جس طرح کسی کی رقم دوسرے کو نہیں دے سکتا اسی طرح کسی سے سنی ہوئی بات بھی اس کے منشاء کے خلاف دوسروں سے نہیں کہہ سکتا "المجالس بالامانۃ" حدیث شریف میں وارد ہے اور علماء نے بیان فرمایا ہے کہ صدور الابرار قبور الاسرار یعنی نیک لوگوں کا سینہ بھید اور راز کی قبر ہوتی ہے۔ مطلب یہ کہ جس

طرح سے کہ مردے قبروں میں پوشیدہ ہوتے ہیں کہ ان کے حال سے کوئی واقف نہیں ہوتا اسی طرح سے ان کے سینوں میں اسرار کا حال ہوتا ہے۔ بعض کا مقولہ ہے کہ احمق آدمی کا دل بھی اس کے منہ میں ہوتا ہے اور عاقل کی زبان اس کے قلب میں ہوتی ہے یعنی احمق کے دل میں جو کچھ آتا ہے جھٹ وہ کہہ بیٹھتا ہے اور عقلمند شخص بہت سی باتیں اپنے دل ہی میں رکھتا ہے۔ اگلے بزرگوں میں سے بعض کا ارشاد ہے کہ جب تم کسی سے دوستی کرنا چاہو تو پہلے اس پر غصہ کرو اور اس کے بعد کسی کو اس کے پاس بھیجو اور وہ اس سے تمہارا ذکر چھیڑ کر تمہارے متعلق دریافت کرے کہ کیسے آدمی ہیں اب اگر وہ تمہاری تعریف کرے یا سکوت اختیار کرے تو بیشک وہ دوستی کے لائق ہے ورنہ اس سے دوری اختیار کرو۔

بہرحال ہر حال میں ان سب امور پر جو مذکور ہوئے ثابت رہنا چاہئے (یعنی کسی سے اخوت قائم کرے تو اس کے حقوق کو بھی ادا کرے) معمولی سے غصہ یا خوشی تھوڑی سی طمع اور خواہش نفسانی کی وجہ سے تعلقات میں فرق نہ ڈالے کہ یہ صفت بدبختوں کی ہے۔

(۷) اسی طرح سے دوست اگر کچھ کہے تو اس پر رد و قدح اور مناقشہ نہ کرے (بشرطیکہ وہ بات خلاف شرع نہ ہو اور اگر خلاف شرع ہو تو پھر رد و قدح کرنا جائز ہے۔ خود حضرت شیخؒ کے سابق کلام سے یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ منہ) اور یہ بھی نہ کرے کہ خاموش ہو کر اس سے علیحدگی اختیار کرلے کیونکہ اسباب کینہ میں سے یہ بدترین اسباب ہیں اور انقطاع و بغض کے موجبات ہیں اس لئے کہ یہ (اس طرح سے ناراض ہو کر خاموش ہو جانا) مشتمل ہے تکبر۔ تحقیر۔ ایذاء دہی اور اس کو برا کہنے پر نیز یہ مرادف ہے اس کو گویا جاہل اور احمق کہنے کے کیونکہ آدمی بالعموم جاہل ہی سے اعراض کرتا ہے) اور ان سب امور کا عداوت و دشمنی کا سبب ہونا ظاہر ہے۔ پس کسی سے دوستی بھی رکھنا اور اسکی برائی بھی کرنا یہ دونوں باتیں جمع نہیں ہو سکتیں اس لئے کہ ان میں باہم منافات کلی ہے۔ (اسی کو متنبی شاعر نے یوں کہا ہے کہ۔

أَ أُحِبُّهُ وَ أُحِبُّ فِيهِ مَلَامَةً
إِنَّ الْمَلَامَةَ فِيهِ مِنْ أَعْدَائِهِ

یعنی میں اپنے محبوب کو بھی محبوب رکھوں اور اس کے بارے میں ملامت کو بھی دوست رکھوں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ملامت تو شیوۂ اعداء ہے اور دشمنوں کا طریقہ دوست کیسے اختیار کر سکتا ہے ۱۲ منہ)۔

علماء نے فرمایا ہے کہ جب تم اپنے کسی دوست سے کہو کہ آؤ اٹھو چلیں اس پر وہ تم سے یہ پوچھ لے کہ کہاں چلوں؟ تو وہ دوستی کے لائق نہیں ہے۔ ابو سلیمانؒ فرماتے ہیں کہ میرا ایک دوست تھا جب میں اس سے مال طلب کرتا تھا تو وہ مال کی تھیلی ہی میرے آگے رکھ دیتا تھا (کہ لو جتنا چاہو

لے لو) ایک دن میرے طلب کرنے پر وہ یہ کہہ پڑا کہ کتنا دوں؟ بس اس دن سے میرے اور اس کے درمیان سے دوستی کی حلاوت اٹھ گئی یعنی طبیعت میں اس سے تکلف پیدا ہو گیا اور لطف صداقت جاتا رہا۔

یہاں تک تو دوستی کے ان حقوق کا بیان تھا جو سکوت سے متعلق تھے اور بعضے حقوق یارانہ ایسے بھی ہیں جو کلام سے متعلق ہیں اس لئے کہ جس طرح سے کہ بھائی چارہ اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ دوست کے عیوب سے سکوت اختیار کیا جائے اسی طرح سے وہ اس کو بھی مقتضی ہے کہ اس کی اچھی باتوں کو بیان بھی کیا جائے اور یہ اس لئے کہ جو شخص ہمیشہ سکوت ہی اختیار کئے رہے گا وہ تو مانند مردے کے ہے۔ نیز یہ کہ سکوت سے غرض یہی تھی تاکہ اس کو ایذاء سے اور خود کو فضول باتوں سے بچایا جائے تو غرض بھائی چارہ سے محض ایذاء ہی سے بچانا تھوڑا ہی ہے بلکہ نفع پہونچانا بھی تو مقصود ہے۔

(۸) لہٰذا اس کے حال کی خبر گیری نیز اس کے دل کو خوش اور راضی رکھنے سے جن باتوں کا تعلق ہو ان سے سکوت نہ اختیار کرے کیونکہ یہاں سکوت حکم میں برے کلام کے ہو جائے گا۔ نیز اس کی اچھی باتوں کا بیان کرنا اس لئے بھی حق اخوت میں شمار ہوتا ہے کہ یہ سبب بنتا ہے باہم ازدیاد محبت کا۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ تم میں جو شخص اپنے کسی بھائی کو دوست رکھے اور اس سے محبت کرے تو چاہئے کہ اس کو اس کی خبر بھی کر دے۔ اس لئے کہ محبت تو باطنی اور طبعی شے ہے دوسرے کو پورا اندازہ نہیں ہو سکتا پس محبت کی خبر دینا باعث ہو گا زیادتی محبت کا۔

(۹) چنانچہ اسی قبیل سے یہ بھی ہے کہ اس کو غائبانہ بھی اور سامنے بھی ایسے نام سے پکارے جس کو وہ پسند کرتا ہے۔ امیر المومنین حضرت عمرؓ نے فرمایا ہے کہ تین امور محبت میں زیادتی کا ذریعہ بنتے ہیں، اولاً السلام علیکم کہنا۔ دوم مجلس میں کسی کو جگہ دیدینا۔ سوم کسی کو اس کے بہترین نام کے ساتھ پکارنا۔

(۱۰) نیز یہ بھی اسی قبیل سے ہے کہ اپنے دوست کی جن خوبیوں سے تم واقف ہو ان کو لوگوں سے بیان کرو خصوصاً جن لوگوں سے ان کا بیان کیا جانا اس دوست کو بھی پسند ہو۔ یہ بھی محبت کی زیادتی کا ایک بڑا سبب ہے اسی طرح سے ان کے اہل و اولاد اور ان کی صفات و افعال اور اخلاق و عادات نیز اس کی صورت و شکل اور شعر و کتابت اور تصنیف و تالیف کی تعریف کرنا بلکہ ان لوگوں کے کسی ایسی چیز کو سراہنا جن سے وہ خوش ہوں (یہ بھی سبب ازدیاد محبت ہے اس لئے محمود ہے) لیکن اس بات کا لحاظ ضروری ہے کہ اس میں کذب مبالغہ اور آمیزش ریا نہ ہو حق تعریف کرے اور حد پر رہے۔

(فائدہ) یہاں جس تعریف کو مستحسن قرار دیا گیا ہے اس سے مراد غائبانہ تعریف ہے اس لئے

پرکسی کے منہ پر اس کی تعریف کرنے کی تو شرع میں ممانعت آئی ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کسی کی تعریف کی آپؐ نے فرمایا اے تیرا ناس ہو تو نے تو اپنے بھائی کی گردن ہی کاٹ دی۔ اس جملہ کو آپؐ نے (تاکیداً) تین بار فرمایا۔ انتہی۔ اور یہ اس لئے منع ہے کہ یہ عجب و تکبر کا موجب بنتا ہے۔ فتاویٰ عالمگیریہ میں لکھا ہے کہ انسان کی تعریف تین قسم کی ہوا کرتی ہے۔ ایک تو یہ کہ کسی کے منہ پر اس کی تعریف کرے یہ حرام اور منع ہے دوسری قسم یہ کہ کسی کی غائبانہ تعریف کرے لیکن یہ جانتا ہو کہ میری اس تعریف کی اس کو اطلاع ہو جائے گی یہ بھی منع ہے اور تیسری قسم یہ ہے کہ غائبانہ تعریف کرے اور ممدوح کو تعریف پہنچنے نہ پہنچنے کی اس کو کچھ پرواہ نہ ہو نیز اس کی تعریف انہیں امور کے سبب کرے جو اس کے اندر واقعۃً ہوں۔ تو اس قسم کی تعریف کا مضائقہ نہیں۔ انتہیٰ۔ پس حضرت شیخ دہلوی رحمتہ اللہ علیہ کی تعریف سے یہاں یہی تیسری قسم مراد ہے اگرچہ بعد میں ممدوح اس کو سن بھی لے اور اس پر خوش بھی ہو مگر تعریف کرنے والے نے اس نیت سے تعریف نہ کی ہو بس یہ کافی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۱۱) منجملہ حقوق دوستی کے جو کلام سے متعلق ہیں ایک حق یہ ہے کہ جب کسی سے اپنے دوست کی غیبت۔ شکایت اور مذمت سے خواہ وہ صراحۃً کر رہا ہے یا اشارۃً تو اپنے دوست کی حمایت و رعایت کرے اور اس کی دوستی کا حق بجالاوے کیونکہ اس موقع پر سکوت اختیار کرنا شیوۂ محبت سے دور اور آئین دوستی کے خلاف ہے۔ ہاں اگر اس وقت بولنے میں شر و فساد کا اندیشہ ہو تو پھر خاموش رہے مگر دل سے اس پر راضی نہ ہو۔ اور اگر یہ کر سکے کہ اس مجلس سے اٹھ کر چلا جائے تو بہت بہتر ہے (کہ عملاً اظہار ناگواری بھی ہے اور فتنہ سے بھی خالی ہے)۔

حاصل ان تمام کا یہ ہے کہ دوست کو تم ہمیشہ پیش نظر رکھو بلکہ اس کو بالکل اپنی ہی طرح سمجھو (اور جو اپنے لئے پسند و ناپسند کرو وہی اس کے لئے کرو) پس مدار ان تمام آداب و حقوق کا اسی پر ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن کامل نہیں ہوتا جب تک کہ اپنے بھائی مسلمان کے لئے بھی وہی پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

(۱۲) اور اسی قبیل سے ہے دوست کو اس کے دین سے متعلق یا دنیا ہی سے متعلق نافع امور میں نصیحت کرنا۔ اس لئے کہ انسان کو نیکی کی ضرورت مال سے زیادہ ہے۔ اور نصیحت کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو اس کے فعل کے فوائد اور اس کی خوبیاں سمجھاؤ اور اس کے نقصان اور مضرتوں سے ڈراؤ کہ وہ خود اس فعل کی اچھائی برائی سے واقف ہو جائے (اور اس امر کا بھی خیال رکھو کہ) نصیحت تنہائی میں کرو تاکہ کوئی دوسرا اس کے عیب پر مطلع نہ ہو۔ برملا اور سب کے سامنے اس کو مت ٹوکو کہ یہ نصیحت نہیں ہے بلکہ فضیحت (رسوا کرنا) ہے۔ اسلاف اور علماء متقدمین کا یہی طریقہ تھا (کہ وہ تنہائی

میں نصیحت کرتے تھے)۔

کتاب وعظ اخوان میں لکھا ہے کہ ایک بزرگ سے لوگوں نے کہا کہ آپ اس شخص کو دوست رکھتے ہیں جو آپ کو آپ عیوب پر ٹوکے؟ فرمایا کہ ہاں! بشرطیکہ محض اللہ تعالیٰ کے لئے اس کا یہ کام ہو۔ لوگوں نے عرض کیا بھلا یہ کیونکر معلوم ہو؟ فرمایا تنہائی میں نصیحت کرے۔ برملا سب کے سامنے رسوا نہ کرے (بس یہی علامت ہوگی اس کے اخلاص کی) چنانچہ نصیحت اور توبیخ و فضیحت میں بس یہی فرق ہے کہ وہ پوشیدہ طور سے کی جاتی ہے اور اس میں اظہار و اعلان ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ اگر سب کے سامنے علانیہ طور پر ٹوکا تو سمجھا جائے گا کہ رسوا کرنا مقصود ہے اور تنہائی میں پوشیدہ طور پر کوئی بات سمجھا دی تو کہا جائے گا یہ نصیحت ہے۔ دیکھو غرض کے بدل جانے سے چیز بدل جایا کرتی ہے۔ اسی لئے ایک ہی معاملہ ایک جگہ مدارات شمار کیا جاتا ہے اور وہی دوسری جگہ مداہنت سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً تغافل سے مقصد اگر اپنے بھائی کے گناہ سے چشم پوشی کرنا ہے اور اپنے نیز اس کے دین کی اصلاح کی خاطر سے ایسا کیا ہے تو یہ مدارت ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ دینداروں کا طریقہ ہے۔ لیکن اگر اس کا منشاء نفس اور خواہشات نفس کی تحصیل ہے تو اس کا نام مداہنت (دینی سستی) ہے۔ جو مذموم ہے۔

نصیحت سے چڑھنا اور ناصح کی بات کا برا ماننا اس کا سبب حمق اور جہالت ہے اس کو مثال سے یوں سمجھو کہ اگر کوئی شخص کسی کو یہ خبر دے کہ تمہارے کپڑوں میں بچھو اور سانپ چھپا ہوا ہے اسکو نکال ڈالو ورنہ کاٹ لے گا۔ یہ سن کر وہ غصہ میں آجائے (اور اس سے لڑ پڑے کہ تم نے یہ کیوں کہا) تو اس میں شک نہیں کہ وہ انتہائی جاہل اور احمق شخص ہے۔ اسی طرح سے سمجھو کہ انسان کے اندر جو بری خصلتیں ہیں وہ بھی بمنزلہ سانپ اور بچھو کے ہیں کہ اس کے قلب اور روح کو کاٹ ڈالیں اور قبر میں سانپ اور بچھو کی شکل اختیار کرلیں گے (اور آلہ عذاب بنیں گے۔ اللھم احفظنا۔)

نیز صحبت نیک کے فوائد میں سے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ انسان اپنے عیوب پر مطلع ہو جاتا ہے کیونکہ وہ مصاحب صالح اپنے ذمہ حکم شرع سمجھ کر اپنے اس جلیس کا حق ادا کرے گا جن میں سے عیوب پر مطلع کرنا بھی ہے۔ اگر یہ فائدہ کسی صحبت سے نہ حاصل ہو تو پھر اس سے گوشہ نشینی یعنی تنہائی بہتر ہے۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ایک مومن دوسرے مومن کا آئینہ ہوتا ہے۔ یعنی جس طرح سے کہ آئینہ میں چہرہ کا عیب معلوم ہو جاتا ہے۔

(۴۳) اسی طرح سے مسلمان کو بھی چاہئے کہ اپنے بھائی مسلمان کو بھی اس کے عیب پر مطلع کر دے لیکن آئینہ کی طرح کہ کسی دوسری کو خبر نہ ہو۔ روایت میں آتا ہے کہ صحابی رسولؐ حضرت سلمان فارسیؓ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آئے تو حضرت عمرؓ نے ان سے پوچھا کہ تم نے میرے متعلق ایسی کوئی بات تو نہیں سنی جو تمہیں ناپسند ہو۔ حضرت سلمانؓ نے عرض کیا حاشا و کلاّ۔

نہیں حضرت میری کیا مجال کہ آپ کی بات کو ناپسند کروں۔ حضرت عمرؓ نے اصرار سے پوچھا کہ نہیں کوئی بات کسی درجہ میں بھی خلاف معلوم ہوئی ہو تو بلا خوف کہے میں تو خود ہی پوچھ رہا ہوں اس پر حضرت سلمان کھلے اور عرض کیا کہ حضرت اور تو کچھ نہیں ہاں میں نے اتنا ضرور سنا تھا کہ آپ دو جوڑے (بیک وقت) رکھتے ہیں ایک دن میں پہننے کے لئے اور ایک شب میں۔ نیز یہ بھی سنا ہے کہ آپ کے دسترخوان پر دو سالن جمع رہتے ہیں۔ بس یہی باتیں ہیں آپ کی میرے کانوں میں پڑی تھیں جو کہ مجھے پسند نہ آئیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا بس یہی نا ان کے علاوہ اور میرا کوئی عیب تو نہیں سنا۔ حضرت سلمانؓ نے فرمایا نہیں نہیں، بس یہی۔

روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ حذیفہ مرعشیؒ نے یوسف ابن اسباط کو لکھا کہ اجی میں نے سنا ہے کہ تم نے...... اپنا دین دو کوڑی میں بیچ دیا ہے۔ یعنی میں نے یہ سنا کہ تم کسی دودھ والے کے پاس گئے اور اس سے بھاؤ دریافت کیا۔ اس نے کہا آٹھ کوڑی کو اتنا دوں گا۔ تم نے کہا چھ میں دو گے۔ وہ تم کو جانتا پہچانتا تھا (اس لئے) کہہ دیا کہ اچھا صاحب لے لیجئے پس اس سے تمہارا یہ دو کوڑی کم کرانا گویا دو کوڑی مانگنا ہوا (اور اس نے تمہاری دینی وجاہت کے خیال سے کم بھی کر دیا تو گویا تم نے اپنا دین دو کوڑی میں بیچ دیا) یہ تمہارا دینی نقصان ہوا۔ آئندہ ذرا سنبھل کر رہنا کہیں ہلاک نہ ہو جانا۔

اور نصیحت اس جگہ مفید ہوتی ہے جہاں کسی عیب سے صاحبِ عیب غافل ہو مگر اس کا چھوڑنا اس کے لئے ممکن ہو۔ باقی وہ عیوب جو کہ طبعی ہوں یا وہ شخص نفس کا بندہ ہو اس کو نصیحت کارگر نہیں ہوتی پس اگر وہ اپنے عیب تم سے پوشیدہ رکھنا چاہتا ہے تو تم کو بھی چاہئے کہ اس کو اپنی زبان پر ہرگز نہ لاؤ اور اس سے تجاہل عارفانہ اور تغافل ہی برتو اور اگر تم سے وہ عیب ظاہر کرتا ہے تو نصیحت میں مبالغہ کرو (کیونکہ یہ مرض آسانی سے جانے والا نہیں ہے) اور اگر یہ سمجھتے ہو کہ نصیحت اسکو مفید نہ ہوگی تو اس موقع پر سکوت ہی اولیٰ ہے۔

حضرات صحابہ کرامؓ کے طریقے اس باب میں مختلف تھے چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور بعض صحابہؓ کا طریقہ یہ تھا کہ جب اس امر کا یقین ہو کہ نصیحت اس کو نفع نہ دے گی اور اس کو گناہ پر مصر دیکھے تو اس سے انقطاع (ترک تعلقات) اولیٰ ہے۔ کیونکہ جب اس کو خدا تعالیٰ کی رضا کی فکر نہیں تو تم کو بھی اس کو خوش کرنے کے فکر کی کیا ضرورت پڑی ہے۔ (اور مبغوض خدا کو اپنا محبوب بنانے کی کیا حاجت ہے)۔

اور مذہب ابوالدرداءؓ۔ حضرت علیؓ اور بعض دوسرے صحابہؓ کا اس کے خلاف تھا یہ حضرات فرماتے تھے کہ جب تمہارے بھائی (دوست) کا حال بدل جائے (یعنی بگڑ جائے) تو اس کو چھوڑو مت شاید (تمہاری برکت) سے اس کی اصلاح ہی ہو جائے۔ اسی لئے علماء نے فرمایا ہے کہ کسی عالم کی لغزش پر (فوراً) گرفت مت کیا کرو کیونکہ (اس کا ساتھی علم ہے جو اس کو اس لغزش کی شناعت پر

تنبیہ کرہی دیگا اور) وہ خود بخود ٹھیک ہو جائے گا اور اس امر خلاف سے باز آجائے گا۔ چنانچہ بزرگوں کے واقعات اور ان کی حکایتیں اس باب میں بے شمار ہیں۔

حاصل یہ کہ پہلا طریقہ تو اہم ہے اور دوسرا نرم اور تقاضائے کرم ہے لیکن محل ان تمام کا وہ امور ہیں جن کا تعلق تمہارے بھائی مسلمان کے دین و دنیا کی درستگی اور آراستگی سے ہو۔ اور اگر کوئی کمی اور کوتاہی اس کے اندر تمہارے حقوق میں تقصیر کرنے کے سلسلہ کی ہو تو یہاں پر اس کے ساتھ عارفانہ تجاہل ہی واجب ہے۔ لیکن اگر ایسی کوئی تقصیر ہے کہ مسلسل اس کا ارتکاب باعث انقطاع ہو جائے گا تو اس سے اس کو ظاہر کر دینا بہتر ہے اور اس میں بھی مناسب یہ ہے کہ اشارۃً کنایۃً اس سے کہے یا رقعہ لکھ کر اس کو مطلع کر دے۔ صریح اور بالمشافہ (منہ در منہ) اس سے نہ کہے۔ بایں ہمہ تم پر لازم ہے کہ تمہاری غرض یارانہ اور بھائی چارگی سے اپنے بھائی مسلمان کو نفع پہونچانا اس کی رعایت کرنی اور اس سے نفع اٹھانا ہو خواہ وہ تمہارے حقوق کی ادائیگی میں تقصیر ہی کیوں نہ کرے (مطلب یہ کہ یہ رشتہ حتی الامکان ٹوٹنا نہیں چاہئے۔

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

حضرت ابو علی رباطیؒ (جو کہ اپنے وقت کے اولیا اللہ میں سے تھے) فرماتے ہیں کہ میں نے چاہا کہ عبداللہ رازی کے ساتھ (کہ وہ بھی اس زمانہ کے اولیا میں سے شمار ہوتے تھے) دوستی اور یارانہ پیدا کروں اور وہ سفر کا ارادہ رکھتے تھے (مجھے بھی سفر کرنا تھا) عبداللہ نے کہا اے ابو علی! سفر میں ایک امیر سفر ہوا کرتا ہے پس تم امیر بنتے ہو یا میں ہی اس منصب کو قبول کروں میں نے فوراً کہہ دیا آپ ہی امیر ہیں یہ سن کر عبداللہ نے کہا بہتر ہے لیکن یہ سمجھ لو کہ تم کو بہر حال میرا مطیع اور تابع رہنا ہوگا اور میں جو حکم دوں وہی کرنا ہوگا۔ اس کے بعد ہم لوگ شہر سے باہر نکلے۔ اثناء سفر میں ایک شب بارش ہونے لگی، عبداللہ نے یہ کیا کہ سارا سامان جمع کیا اور مجھ کو درمیان میں بٹھلایا اور مجھے اور سامان کو بچانے کے لئے ساری رات چادر تانے کھڑے رہے میں نے کہا کہ تھوڑی دیر کے لئے آپ آرام فرمالیں اور یہ خدمت میں انجام دوں۔ کہا کہ میں نے ابتداء سفر میں تم سے نہ کہہ دیا تھا کہ مجھ کو امیر بنایا ہے تو میری اطاعت لازم رکھنا۔ مطلب یہ کہ اطاعت امیر میں یہ بھی داخل ہے کہ میں جو کچھ کروں (اس میں چون و چرا مت کرو۔ باقی میں جو یہ سب کر رہا ہوں تو یہ تو میری سرداری کے فرائض اور امیری کا تقاضا ہی ہے۔ (سچ ہے سید القوم خادمہم)

(۴) منجملہ حقوق یارانہ کے ایک یہ بھی ہے کہ اپنے دوست کے لئے اس کی زندگی میں بھی اور موت کے بعد بھی دعا کیا کرے اس کو اپنے ذمہ لازم جانے۔ اور جس طرح سے اپنے لیے اور اپنے اہل و عیال کے لئے دعا کرتا ہے اسی طرح اپنے بھائی مسلمان کے لئے بھی دعا کرے اور فی الواقع اس

کے لئے دعا کرنا اپنے ہی کو نفع پہونچاتا ہے۔ اس لئے کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو شخص اپنے مسلمان بھائی کے لئے غائبانہ دعا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اول تجھ ہی سے ابتدا کرتا ہوں یعنی پہلے تیری مراد برلاؤں گا پھر اس کی۔ ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ ایک مسلمان کی غائبانہ دعا اپنے دوسرے مسلمان بھائی کے حق میں رد نہیں کی جاتی یعنی قبول ہی ہو جاتی ہے۔

(فائدہ) ایک اور حدیث ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرد مسلم کی دعا اپنے بھائی مسلم کے حق میں غائبانہ قبول کی جاتی ہے اور دعا کرنے والے کے سر کے پاس ایک فرشتہ متعین کر دیا جاتا ہے چنانچہ جب وہ شخص اپنے بھائی کے لئے کسی بھلائی کی دعا کرتا ہے تو وہ فرشتہ کہتا ہے کہ اٰمِیْن وَلَکَ بِمِثْلِہٖ یعنی اے اللہ اس کی دعا کو قبول فرما اور اس داعی سے کہتا ہے اس کو تو ملے ہی اور تجھ کو بھی اس کے مثل ملے۔ اور ایک روایت میں مسلم کے "دو مثل" کا لفظ آیا ہے پس اے مخاطب دیکھ لے کہ کسی بھائی کے لئے غائبانہ دعا کرنے مین کتنی فضیلت ہے کہ اس کے لئے فرشتہ دعا کرتا ہے۔ سبحان اللہ۔

چنانچہ ابو الدرداؓ فرماتے ہیں کہ میں اپنے سجدے میں اپنے دوستوں میں سے ستر آدمیوں کے لئے نام بنام دعا کرتا ہوں اور بعض سلف سے منقول ہے کہ مُردوں کے لئے دعا کرنا ایسا ہے جیسے زندوں کے پاس کوئی ہدیہ اور تحفہ بھیجے۔ روایت میں ہے کہ جو شخص کسی مردے کے لئے دعا کرتا ہے تو فرشتے اس کو نور کے طباق میں رکھ کر اس میت کی خدمت میں پیش کرتے ہیں اور اس سے کہتے ہیں کہ یہ تیرے فلاں بھائی کی طرف سے تحفہ ہے۔ پس وہ میت اسی طرح سے خوش ہوتی ہے جیسے زندہ شخص تحفہ پاکر مسرور ہوتا ہے۔

(۱۵) اور منجملہ حقوق دوستی کے ایک یہ ہے کہ دوست کے ساتھ اخلاص اور وفا کے ساتھ تم پیش آؤ۔ وفا کا مطلب یہ ہے کہ دوستی اور محبت پر ثابت قدم رہو۔ اور اس کے انتقال کے بعد اس کے لئے دعاء مغفرت کرتے رہو۔ اور اس کی اولاد و متعلقین کے ساتھ اس کے بعد احسان اور نیکی کا برتاؤ رکھو کیونکہ جس اخوت کے حقوق بیان ہو رہے ہیں وہ خدا اور آخرت کے لئے ہے لہٰذا اب اگر وہ مرنے سے قبل ہی ختم ہو جائے تو اس سے فائدہ؟ حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک بڑھیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی حضرتؐ نے اس کی خاطر مدارات فرمائی اور احوال پرسی کی۔ صحابہؓ نے دریافت کیا یا رسول اللہ یہ کون عورت ہے آپؐ نے فرمایا کہ خدیجہؓ جب زندہ تھیں تو یہ ان سے ملنے آیا کرتی تھی۔ مجھے اس کا آنا پسند ہوتا ہے کہ اس کے آنے سے خدیجہؓ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ نیک عہد ایمان کا شعبہ ہے (یعنی کسی سے کوئی عہد و وعدہ کرے یا محبت رکھے تو اس کا نباہنا اور اس کی رعایت رکھنا ایمان کی شاخ ہے)۔

منجملہ وفا کے ایک یہ دوست کے متعلقین کی رعایت کرے کیونکہ دوست کے نزدیک یہ چیز

اپنی رعایت سے بھی زیادہ پسندیدہ تر ہوتی ہے۔ نیز محبت کا کمال بھی یہی ہے کہ وہ محبوب سے گذر کر اسکے متعلقین تک پہونچ جاوے۔ یہاں تک کہ اس کا اگر کوئی کتا بھی ہو تو اس کی حیثیت تیری نظروں میں اور کتوں سے تو ممتاز ہونی چاہئے۔ اسی سے علماء نے فرمایا ہے کہ محبت حق کا ثمرہ یہ ہے کہ اس کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی محبوب ہو جائیں کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کی محبت بوجہ ان کے انعام اور احسان فرمانے کے ہوئی ہو اور اس محبت میں غرض کی آمیزش ہے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت تو محض اس لئے ہوگی کہ آپ محبوب حق ہیں اور بلاشبہ یہ ثمرہ ہے حق تعالیٰ کے ساتھ صدق محبت کا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا ثمرہ آپ کی آل و اولاد سے محبت کا ہونا ہے۔ (اسی طرح سے آپؐ کی ازواج اور خدامؓ سے بھی۔ اسی طرح سے آپ کے صحابہؓ اور متبعین سے بھی)۔

نیز منجملہ وفا کے یہ بھی ہے کہ اپنے دوست کے ساتھ کسی معاملہ میں بھی خواہ وہ دینی ہو یا دنیوی حسد کو درمیان میں نہ آنے دے۔ کیونکہ دوست غیر نہیں ہے۔ اس کا فائدہ اپنا ہی فائدہ ہے (پس اپنی ہی ترقی پر حسد کیا)۔

نیز منجملہ وفا کے ایک یہ بھی ہے کہ اپنے بھائی کے ساتھ جس لطف و تواضع سے پیش آتا تھا اس میں تغیر و تبدل نہ ہونے دے اگرچہ خود کو چاہے کتنا ہی بڑا جاہ و مرتبہ کیوں نہ حاصل ہو جائے لیکن ہے یہ ذرا مشکل کام اسی لئے بعض حکماء نے فرمایا ہے کہ تمہارے کسی اخ فی الدین (یعنی دوست) کو اگر کوئی منصب اور مرتبہ مل جائے اور اس کے بعد تم سے اس کا تعلق اور محبت آدھی رہ جائے تو اس کو بھی پورا ہی سمجھو کیونکہ ایسی حالت میں اس کا تم کو اتنا یاد رکھنا بھی غنیمت ہے اور کمال تعلق کی دلیل ہے۔ اس لئے کہ منصب اور عہدہ ملنے کے بعد پہلی حالت کا باقی رہنا بڑا ہی مشکل ہے۔ البتہ یہ لازم ہے کہ خلاف شرع امور میں اس دوست کی موافقت نہ کرو کہ یہ وفا نہیں ہے۔ بلکہ اب وفا اس فعل کے ترک ہی کر دینے میں ہے۔ لاطاعۃ لمخلوقٍ فی معصیۃ الخالق)۔

نیز منجملہ وفا کے ایک یہ امر بھی ہے کہ دوست کی مفارقت کے بعد تم بہت زیادہ غمگین رہو اور اس کی یاد تمہارے دلنشین رہے یعنی غم جدائی آہستہ آہستہ فرو ہو۔ یہ نہیں کہ اس کو ایک بارگی فراموش کر دو کہ یہ منافقین کا شیوہ اور غیر مخلصین کا طریقہ ہے۔

اسی طرح سے منجملہ آئین وفا کے ایک یہ ہے کہ اپنے دوست کے حق میں اہل غرض کی بات نہ سنے (کیونکہ صاحب غرض بعض مرتبہ یہ چاہتا ہے کہ دوستوں میں بگاڑ پیدا ہو جاوے تاکہ میری غرض نکلے اس لئے اہل اغراض کو پہچاننا چاہئے اور ان کی باتوں میں نہ آنا چاہئے) خصوصاً اس شخص کی بات جو اپنے کو دوستی کے لباس میں ظاہر کرے۔ اس کی بات کو تو ہرگز قبول نہ کرنا چاہئے۔

نیز منجملہ وفا کے یہ بھی ہے کہ دوست کے بدخواہوں سے یارانہ نہ رکھے۔

اسی طرح وفا کے منجملہ یہ بھی ہے کہ دوست کی جفا پر صبر کرے کیونکہ دوام محبت بدون اس کے مشکل ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ محبت وہ پائیدار ہوتی ہے جو بے لوث ہو باقی اگر اس میں آمیزش غرض کی ہو جائے تو اس کو بقاء نہیں ہوتی۔

(۲) منجملہ حقوق یارانہ کے یہ ہے کہ احباب کے مابین تکلف نہ ہو چنانچہ یہ بھی تکلف ہی کی قسم ہے کہ ایسی کسی چیز کا بوجھ اس پر رکھے جو اس پر گراں ہو خواہ وہ حاجات کے قبیل سے ہوں یا مشقت کے۔ بلکہ مقصود یہ ہو کہ تم اس کا بوجھ اٹھاؤ گے اور اس کی خدمت کرو گے۔

اسی طرح سے یہ بھی تکلف ہی کہ اپنے دوست کی جانب سے تواضع کے متوقع رہو اور اپنی تعظیم کے منتظر رہو کہ یہ طریق محبت سے قطعی دور ہے۔ اور منجملہ تکلف کے یہ بھی ہے کہ تم اپنے دوست سے کھانے پینے۔ سونے جاگنے۔ اٹھنے بیٹھنے میں اپنی رغبت اور پسندیدگی کے اظہار سے شرم کرو کہ یہ بھی اتحاد اور یگانگت کے منافی ہے اور دوست سے اجنبیت برتنا ہے۔ اور تکلف انقطاع محبت کا سبب ہوتا ہے۔ اسی لئے سلف کے واقعات باہم بے تکلفی کے بہت ہیں۔ کیونکہ اہل تکلف سے دوام محبت متصور نہیں۔

اور بے تکلفی کا ایک اثر یہ ہے کہ اپنے دوست پر ترک نوافل کی وجہ سے اعتراض نہ کرے چنانچہ بعض صوفیوں کا یہ دستور تھا کہ وہ دوستی سے پہلے چار چیزوں کی شرط کر لیتے تھے۔ اول یہ کہ اگر ساتھی علاوہ رمضان المبارک کے تمام سال افطار کرے یعنی روزہ نہ رکھے تو وہ یہ نہ کہے کہ تم روزہ کیوں نہیں رکھتے۔ دوم یہ کہ وہ اگر تمام سال عیدین اور ایام تشریق کے علاوہ روزہ رکھے تو یہ نہ کہے کہ افطار کرو۔ سوم یہ کہ اگر ایک دوست عشاء (اور فجر تو پڑھے مگر اس) کے بعد بقیہ تمام رات سوئے تو وہ یہ نہ کہے کہ تم شب میں نوافل نہیں پڑھتے۔ چہارم یہ کہ اگر ایک ساتھی تمام رات نوافل پڑھتا رہے تو دوسرا اس سے یہ نہ کہے کہ بس بھی کرو جی اب سو رہو۔ اور اس کی محبت اس کے ساتھ تمام حالتوں میں یکساں رہے۔ بعض صحابہؓ سے منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ تکلف کرنیوالوں پر لعنت کرتا ہے۔ اور یہ کہ اہل تکلف اکثر ریاکار ہوتے ہیں۔

علماء نے فرمایا ہے کہ اپنے زہد و ورع کو اپنے احباب کے سامنے بیان کرنا ریا نہیں ہے اس لئے کہ یہاں تو معاملہ اتحاد کا ہے۔ مطلب یہ کہ جہاں اتحاد اور بے تکلفی ہو وہاں اپنے افعال بیان کرنے سے نمود نہیں ہوتا بلکہ بیان واقعہ اور دوسروں کو بھی رغبت دلانا مقصود ہوتا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ حقوق یارانہ اور آداب اخوت و محبت کی تفصیل کا بیان کرنا تو از حد دشوار ہے حاصل ان سب کا یہ ہے کہ تمام حالات میں اپنے جملہ اعضا اور مجموعۂ حواس کو دوست کی خدمت اور اسکے ساتھ شفقت کے ساتھ پیش آنے میں صرف کرے اور ظاہراً و باطناً اس کا مخلص و محب رہے۔ مگر بات یہ ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے ازل سے ہی مؤدب اور مہذب بنایا ہے اس سے

... تمام آداب بے تکلف ادا ہو جاتے ہیں اور جو شخص اصل اور فطرت ہی میں بد خلق پیدا ہوا ہے وہ کتنا ہی تکلف کرے ہر وقت ادب ملحوظ نہیں رکھ سکتا کسی وقت اگر بالفرض حیاء یا ریاء بہ تکلف کچھ خیال کر بھی لیا تو دوسرے وقت پھر اسکی اصل طبیعت غالب آجائے گی اور اسی کے مطابق افعال اس سے صادر ہوں گے۔ لہٰذا اس باب میں بھی پس اللہ تعالیٰ ہی توفیق دینے والے ہیں اور انہیں کی اعانت سے کچھ کام چل سکتا ہے۔ (اس لئے انہیں سے توفیق ادب طلب کرنا چاہئے۔ ع۔ از خدا جوئیم توفیق ادب۔

فصل چہارم

معیشت اور ہمنشینی کے بعضے آداب اور خُلق کی اقسام منتخب از کلام حکماء اسلام

(ادب) جاننا چاہئے کہ ہر کام میں توسط یعنی میانہ روی ہی پسندیدہ امر ہے اور افراط تفریط دونوں مذموم ہیں (ادب) باوقار رہو لیکن نہ اس طرح کہ جس میں شائبہ کبر کا ہو جائے اسی طرح سے تواضع اختیار کرو مگر نہ ایسی جس میں آمیزش ذلت کی ہو جائے (ادب) ہر مجمع میں نہ کھڑے ہو جاؤ یعنی جو مجمع کہ گناہ یا لغو و فضول کام پر مشتمل ہو۔ مثلاً میلہ تماشا یا بازاری مجمع باقی جو مجمع کہ کسی نیک اور ثواب کے کام پر مشتمل ہو مثلاً درس و وعظ وہاں تو ٹھہرنے کی فضیلت آئی ہے اور اسکی شرکت میں ثواب ہے۔ (ادب) جب کسی مجلس میں بیٹھے تو ادھر ادھر دیکھنا نہ شروع کر دے کہ یہ حرکت خلاف تمیز اور بھونڈا پن ہے (ادب) بہتر ہے کہ دو زانو بیٹھے اور جہاں تک ہو سکے قبلہ رو بیٹھے۔ (ادب) مجلس میں نہ تو بہت زیادہ بولو کہ کسی دوسرے کو بولنے کا موقع ہی نہ رہے اور نہ بالکل گم صم یعنی خاموش ہی بیٹھے رہو (کہ تمہارا اس مجلس میں ہونا نہ ہونا برابر ہو جائے یا شبہ ہو کہ حاضرین کی باتیں پسند نہیں۔ اسلئے اگر جائز گفتگو ہو رہی ہے تو تم بھی اس میں شرکت کرو اور اگر خدانخواستہ خلاف شرع گفتگو ہو تو لطیف طریقہ سے اس مجلس ہی سے کنارہ کش ہو جاؤ (ادب) مجلس میں بیٹھ کر اپنی انگلیوں کو مت چٹخاؤ۔ نیز اپنی داڑھی یا انگوٹھی سے بھی مت کھیلو (نہ چٹائی یا وغیرہ سے) تنکے توڑو اور نہ اس وقت دانتوں میں خلال کرو کہ اس سے دوسروں کو گھن معلوم ہوتی ہے۔ نہ سب کے سامنے ناک میں انگلی ڈالو نہ بلا ضرورت بہت زیادہ کھانسو۔ نہ سب کے

سامنے تھوکو نہ نمایاں طور سے منہ پر سے مکھی اڑاؤ (بعض لوگ اس میں ایسا انداز اختیار کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شکار کرنا مقصود ہے اسی کو منع فرمارہے ورنہ آہستہ سے اڑادینے میں کچھ حرج نہیں ہے) سب کے سامنے جمائی نہ لو (اور اگر ضرورت آن ہی پڑے تو ہاتھ یا رومال سے منہ ڈھانک لو) اور بار بار انگڑائی بھی نہ لو۔ اسی طرح سے منٹ منٹ پر تکیہ کو بھی مت درست کرو۔ سب کے سامنے پاؤں نہ پھیلاؤ۔ کلام کرنے میں تکلف کو دخل مت دو کہ خوب مقفیٰ مسجع الفاظ بولو کہ یہ اظہار لیاقت اور نمود ہے نیز شیوہ ہے اہل تکبر کا اسلئے غیر محمود ہے۔ کلام مرتب کرو اور سکون واطمینان کے ساتھ کرو۔ (ادب) کوئی دوسرا بولے تو اسکو توجہ سے سنو اور دوسرے کی بات سننے میں بہت زیادہ زبان سے یا چہرے کو بنا بگاڑ کر تعجب اور حیرت نہ ظاہر کرو اسلئے کہ لوگ اس انداز سے گھبراتے ہیں نیز یہ تمیز کے خلاف بھی بات ہے۔ کلام کرنے والے سے بار بار بات کو نہ دھرواؤ اس سے اسکو الجھن ہوتی ہے اور یہ امر تمہاری بے توجہی پر بھی دال ہے توجہ سے سنتے تو اسکی نوبت نہ آتی (ادب) ہر وقت ہنسی مذاق کی بات کرنے سے یا قصہ کہانی بیان کرنے سے احتراز کرو۔ (ادب) اپنے بیٹے یا اپنے شعر یا اسی طرح سے اپنی تصنیف یا اور کسی ایسی چیز کو جو اپنی ہی جانب منسوب ہو اسکی تعریف کرکے لوگوں کے سامنے عجب نہ کرو اور عجب کہتے ہیں کہ اپنی کسی خوبی کی وجہ سے اندر اندر پھولے اور خوش ہو (چنانچہ واقعی بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ مجمع میں اپنے بیٹے کے اوصاف ذہانت وغیرہ کے بیان کرکے خوش ہوتے ہیں یا موقع بے موقع اپنی نظم وغیرہ پیش کرنے لگ جاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ لوگ اسکی داد دیں یا اپنی تصنیف کی خوبیاں کرکے اسپر تحسین چاہتے ہیں۔ چنانچہ مجلس میں یہ امور کثرت سے پیش آتے ہیں اس لئے مؤلف نے اسپر تنبیہ فرمائی کہ یہ بھی آداب مجلس کے خلاف ہے)۔ (ادب) اپنے کو عورتوں کی اور نوکر غلام کی طرح ذلیل و خوار بھی نہ رکھو۔ (ادب) کسی سے کوئی حاجت ہو تو اس میں بہت زیادہ الحاح و اصرار سے کام نہ لو کہ جبر و ناگواری کا اندیشہ ہے۔ (ادب) نہ خود ظلم پر دلیر بنو اور نہ دوسرے کو دلیر ہونے کا موقع ہو۔ (ادب) اپنے اہل و عیال کو اور خصوصاً اجنبی کو اپنے مال کی مقدار پر مطلع نہ کرو اسلئے کہ تمہارے پاس جتنا مال ہے اگر وہ انکی نظروں میں کم ہوا تو تم کو نظروں سے گرادیں گے اور حقیر جانیں گے اگر زیادہ ہوا تو تم سے نظریں پھرالیں گے یعنی حسد کریں گے اور ناراض رہیں گے (یعنی دل دل میں تم سے مطالبہ کریں گے کہ اپنے اس مال میں ہمارا بھی حصہ لگالو) (ادب) نہ بہت سختی کرو اور نہ حد سے زیادہ نرمی اختیار کرو (بلکہ بین بین رہو سختی کے موقع پر سختی کرو اور نرمی کے موقع پر نرمی) بر تو نہ حلوہ بن کر چٹ کر جائیں بھوکے نہ کڑوا بن کہ جو چکھے سو تھوکے)۔ (ادب) اپنی لونڈی

اور غلام سے ہنسی مذاق مت کرو کہ اس سے رعب اور وقار جاتا رہتا ہے۔ بات کہنے میں جلدی نہ کرو بلکہ جو کچھ کہو خود خوب سوچ سمجھکر کہو۔ (ادب) دشمنی کی حالت میں بھی باوقار رہو (یعنی) ہلکے پن کی باتیں اسوقت بھی زبان سے نہ نکالو۔) (ادب) باتیں کرتے وقت ہاتھ سے بہت زیادہ اشارے مت کرو یعنی جیسی کہ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ ہاتھ نچانچا کر باتیں کرتے ہیں یہ خلاف تمیز ہے۔ (ادب) بادشاہوں اور امیروں کا قرب نہ اختیار کرو اور اگر نوبت اسکی آہی جائے تو بہت زیادہ ہوشیار رہنا اور انکے تقرب پر مغرور نہ ہونا اور انکے تلون مزاجی سے کبھی بے خوف نہ ہونا۔ اور کوئی بات انکے خلاف ہرگز نہ کہنا۔ اور انکے اہل اور اولاد کے معاملات میں تو قطعی دخل مت دینا۔ (ادب) کسی شخص کی اولاد کو اسکے سامنے برا نہ کہو کیونکہ کسی کو اپنے اولاد کی برائی اور اہانت پسند نہیں ہوتی۔ چنانچہ اگر وہ خود بھی اپنی اولاد کی برائی تم سے کرے تو تم خاموشی کے ساتھ سن لو۔ اسکی تائید اور موافقت بھی مت کرو (ادب) کسی سے مطلب کی دوستی نہ کرو اور مال کو آبرو پر ترجیح نہ دو (بلکہ مال کو اسکی حفاظت کا ذریعہ بناؤ) ایسا نہ کرو جیسا اہل حرص کرتے ہیں کہ مال کو دانت سے پکڑتے ہیں۔ آبرو رہے چاہے جائے۔

(ادب) جب مجلس میں آؤ تو پہلے السلام علیکم کہو، اور جہاں جگہ ملجائے بیٹھ جاؤ (مجلس میں کود پھاند نہ مچاؤ) اور سلام کرنے میں پاس والے کی تخصیص نہ کرو۔ بلکہ سب اہل مجلس کو سلام کرو۔ (ادب) راستہ اور گذر گاہ پر نہ بیٹھو اور اگر اسکی نوبت آجائے تو (اسکے حقوق ادا کرو) نامحرموں پر نظر نہ ڈالو۔ ضعیف اور مظلوم کی مدد کرو۔ راستہ بھولے کو راستہ بتادو گذرنے والوں کے سلام کا جواب دو۔ سائل کی حاجت روائی کرو۔ اچھی بات کا حکم کرو اور بری باتوں سے لوگوں کو منع کرو (یہ سب حقوق ہیں طریق کے)۔ (ادب) راستہ چلنے میں اپنے ساتھیوں سے سبقت نہ کرو۔ (ع۔ ہمرہ اگر شتاب کند ہمرہ تو نیست) (ادب) قبلہ کی جانب نیز داہنی جانب مت تھوکو بلکہ بائیں یا پاوں کے نیچے تھوک ڈالو (ادب) راستہ میں اتراتے اور اکڑتے ہوئے نہ چلو۔ اور بازار میں آواز بلند نہ کرو۔ (ادب) بادشاہ کے اول تو ہمنشین ہی نہ بنو اور اگر ساتھ ہو جائے تو کسی کی غیبت اس سے نہ کرو اور نہ کسی اور سے اسکی غیبت کرو۔ نیز اسکے سامنے جھوٹ نہ بولنا اور کبھی اس کا راز کسی پر افشا نہ کرنا۔ اور ہر وقت اس کے سامنے اپنی یا دوسروں کی حاجات لیکر نہ جانا۔ زبان کو مہذب اور شائستہ کرنا۔ بات واضح طور سے صاف صاف اس سے کہنا۔ نیز سلاطین اور بادشاہوں کے اخلاق اور واقعات کا اس کے سامنے ذکر کرتے رہنا۔ خوش طبعی کم کرنا اور انکے غصہ سے پُر حذر رہنا۔ (ادب) دنیا دار کی دوستی کا اعتبار نہ کرنا۔ اور ان لوگوں سے بہت زیادہ بے تکلفی بھی مناسب نہیں

کھانے کے بعد سلاطین اور اہل تنعم کے سامنے دانتوں میں خلال نہ کرنا۔(کہ انکی طبع نازک پر امربار ہوتا ہے) نیز ان لوگوں سے کسی امر میں ردو قدح سے بھی احتیاط رکھنا۔ اور انکے حرم یعنی ناموس میں خیانت نہ کرنا (ادب) اسی طرح سے عوام الناس کے ساتھ بھی زیادہ اختلاط نہ رکھنا۔ اور اگر کبھی بیٹھنا ہو جائے تو انکی سب باتوں میں شریک نہ ہو جانا اور انکی واہی تباہی باتوں پر کان نہ دھرنا۔ انکی سخت مزاجی سے چشم پوشی کرنا۔ (ادب) انکے سامنے بہت زیادہ خوش طبعی نہ کرنا کیونکہ اسکی وجہ سے آدمی بے آبرو اور بے رعب ہو جاتا ہے۔ اور یہ کینہ کا سبب بھی بن جاتا ہے۔ اور دوستی تو اس سے ختم ہی ہو جاتی ہے اور عالم کو زیادہ خوش طبعی عیب دار کر دیتی ہے۔ (یعنی اسکا وقار ختم ہو جاتا ہے) اور حکیم کا اعتبار کھو دیتی ہے اور خود صاحب مزاح کے دل کو مردہ کر دیتی ہے۔ نیز انسان میں غفلت پیدا کر کے اس کو خدا سے دور کر دیتی ہے۔ اور لوگوں میں اس کو ذلیل و خوار کر دیتی ہے۔ (ادب) جس مجلس میں لہو لعب ہو یا ہنسی مذاق یعنی خوش طبعی ہوتی ہو اس سے اٹھتے وقت یہ دعا پڑھ لو تاکہ جو کچھ اس سے اس مجلس میں سرزد ہوا ہو وہ معاف ہو جائے اور یہ ذکر اس غفلت کا کفارہ بن جائے۔ وہ دعا یہ ہے سُبْحَانَکَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِکَ اَشْهَدُاَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُکَ وَاَتُوْبُ اِلَیْکَ (ترجمہ یہ ہے 'اے اللہ تعالیٰ پاک ہے آپ کی ذات۔ آپ ہی کے لئے سب تعریف ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ کے سوا تو کوئی معبود نہیں ہے۔ آپ سے گناہوں کی معافی طلب کرتا ہوں اور توبہ کرتا ہوں)۔ (فائدہ) اس دعا کو کفارۃ المجلس کہتے ہیں۔

حضرت ابو ہریرۃؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص کسی ایسی مجلس میں شرکت کرے جہاں لغویات بھی ہوں تو اگر وہاں سے اٹھنے سے پہلے یہ دعا پڑھ لے گا تو اس مجلس کی تمام کوتاہیاں اس سے بخش دی جائیں گی۔ اور ایک دوسری روایت میں حضرت عائشہؓ سے منقول ہے کہ جب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی مجلس میں تشریف فرما ہوتے یا نماز پڑھتے تو ان چند کلمات کو ضرور پڑھتے (انکا ذکر آگے آرہا ہے) میں نے آپؐ سے ان کلمات کا فائدہ دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ اگر ان کلمات کو بھلے کام اور ثواب کی بات کے بعد پڑھے تو یہ کلمات بمنزلہ 'مُہر اور چھاپ کے ہو جاتے ہیں یعنی وہ بات قیامت تک کیلئے زوال اور محو ہونے سے محفوظ ہو جاتی ہے اور اگر بری باتیں بھی خدانخواستہ اسمیں بولی گئی ہیں تو یہ کلمات انکا کفارہ ہو جاتے ہیں۔ وہ کلمات یہ ہیں۔ سُبْحَانَکَ اَللّٰهُمَّ وَ بِحَمْدِکَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُکَ وَاَتُوْبُ اِلَیْکَ انتھی۔

پہلی روایت میں اور اس میں فرق یہ ہے کہ اس میں لفظ اَشْهَدُاَنْ نہیں ہے۔ باقی ان دونوں روایتوں کو صاحب مشکوۃ نے نقل کیا ہے۔

چوتھا باب

عامۃ المومنین۔ اہل قرابت۔ پڑوسی اور باندی وغلام وغیرہ کے حقوق کے بیان میں

جان لو کہ انسان مدنی الطبع واقع ہوا ہے یعنی زندگی گزارنے میں اسباب کا نیز اجتماع کا اور اپنے ہم جنس کے ساتھ باہمی میل جول رکھنے کا محتاج ہے۔ اسکے لئے چونکہ دوسرے انسانوں سے اختلاط ناگزیر ہے اسلئے مخالطت (یعنی میل جول) کے آداب اور ہمسائگی کے حقوق کا جاننا بھی اسکے لئے ضروری ہے۔

اور ادب ہر شے کا بقدر اسکے حق کے ہوا کرتا ہے یعنی جتنا جسکا حق ہوگا اتنا ہی اس کا ادب ہو گا۔ اور حق بقدر رابطہ کے ہوتا ہے یعنی جس قدر جس سے رابطہ قوی ہوگا اتنا ہی اس کا حق زیادہ ہوگا اور سب سے زیادہ عام رابطہ اسلام کا رابطہ ہے کہ سب مسلمان اس میں شریک ہیں اسکے بعد رابطہ معرفت (یعنی جان پہچان اور تعلقات) کا ہے اور اسکے بھی مختلف درجات ہیں کیونکہ ایک شخص سے معرفت کم ہوتی ہے اور دوسرے سے زیادہ ہوتی ہے چنانچہ اس شخص کا حق جس سے کبھی کی ملاقات اور جان پہچان نہ ہو بلکہ صرف غائبانہ تعارف ہو اس شخص کے حق کے مانند نہیں ہے جس کو دیکھا ہے اور جس سے ملاقات بات ہے۔

اسکے بعد رابطہ مصاحبت کا ہے یعنی صحبت اور معیت کی وجہ سے اس سے رابطہ ہو جائے اور اس کے درجات بھی متفاوت ہیں۔ چنانچہ جو شخص صرف سفر میں ساتھ رہا ہو اسکا حق ہم سبق اور ہم مکتب کے حق سے کم ہوگا۔ اسی طرح سے رابطہ ہمسائگی بھی قرب و بعد کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے اسکے بعد اخوت اور دوستی کا حق ہے اور اس سے بڑھکر حق ہے قرابت کا اور اس میں بھی تفاوت ہے۔ چنانچہ وہ قرابت جس میں خون کا تعلق ہے وہ بڑھی ہوئی ہے دوسرے رشتوں سے اور اس میں بھی ماں باپ کا حق سب سے بڑھا ہوا ہے۔ ہم یہاں ان تمام حقوق کو دو فصلوں میں بیان کرتے ہیں۔

فصل اول

مسلمانوں کے حقوق کا بیان

(۱) وہ تمام حقوق جو ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر ہیں انکا حاصل جو کہ اکثر بلکہ تمام ہی حقوق کو حاوی ہے کہ مسلمان کو اس طرح محبوب رکھے جیسے اپنے نفس کو رکھتا ہے یہ کمال دینداری اور اعلیٰ درجہ کا مسلمان ہونا ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اتفاق و اتحاد میں مسلمانوں کی مثال جسم کی سی ہے کہ اگر اسکے ایک عضو کو تکلیف پہونچتی ہے تو دوسرے اعضاء بھی بیقرار ہو جاتے ہیں مطلب آپ کا اس ارشاد سے یہ ہے کہ اسی طرح سے مسلمانوں کو ہونا چاہئے کہ ایک کی تکلیف سے دوسرا بھی متأذی اور بے قرار ہو جائے اور اسکے دفع کی تدبیر کرے۔

بنی آدم اعضاء یکدیگر اند
کہ در آفرینش زیک جوہر اند
چو عضوے بدرد آورد روزگار
دگر عضوہار انما ند قرار

یعنی تمام بنی آدم ایک دوسرے کے لئے بمنزلۂ اعضاء کے ہیں اس لئے کہ ایک ہی ذات سے سب وجود میں آئے اور عضو کا یہ حال ہے کہ اگر ایک عضو کو بھی تکلیف ہو جاتی ہے تو دوسرے تمام اعضا سے بھی قرار جاتا رہتا ہے۔

(۲) غرض مسلمانوں کے سب حقوق کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی مسلمان کو تمہارے ہاتھ اور زبان سے تکلیف نہ پہونچے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ مسلمان کے ساتھ بھلائی اور نیکی کرو اور اگر بھلائی نہ کر سکو تو کم از کم اسکو تکلیف ہی نہ پہونچاؤ کہ یہ بھی ایک قسم کی بھلائی ہی ہے۔

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک صحابی حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ مجھے کوئی ایسی بات تعلیم فرمایئے جو مجھے نفع دے آپ نے فرمایا کہ مسلمانوں کے راستہ سے ایذاء کی چیزوں کو دور کرو۔ جیسے کانٹا کنکر پتھر (یا کیلے کے چھلکے) وغیرہ یا کوئی موذی انسان یا جانور بیٹھا ہو تو اسکو بھی ہٹا دینا اسی میں داخل ہے۔ چنانچہ راستہ سے کانٹا پتھر اور نجاست وغیرہ کے ہٹا دینے میں بہت ثواب آیا ہے۔ اور کسی مسلمان کو بدون کسی شرعی وجہ کے تکلیف پہونچانا بد ترین عمل ہے۔ پھر یہ سمجھو کہ ایذو کے مراتب میں تفاوت ہے۔ اول درجہ ایذاء کا یہ ہے کہ اپنے کسی بھائی مسلمان کی جانب ایسی نگاہ سے دیکھے جس سے اسکو ایذاء ہو۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ کسی

مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ اپنے کسی مسلمان کی جانب نظر سے اس طرح اشارہ کرے جس سے اسکو ایذاء ہو۔ حاصل یہ کہ دوسرے مسلمان کو جو بات ناگوار ہو اور بری لگے وہ ایذا میں شمار ہے۔

(۴) ایک حق مسلمان کا یہ ہے کہ اسکے ساتھ تواضع سے پیش آئے۔ تکبر کو راہ نہ دے کیونکہ اللہ تعالیٰ متکبر شخص کو پسند نہیں فرماتا۔ اور جس پر تکبر کیا گیا ہے اسکو چاہئے کہ تحمل سے کام لے اور برداشت کر کے خاموش رہ جائے اور اگر چاہے تو بدلہ بھی لے سکتا ہے مگر۔

بدی را بدی سہل باشد جزا   اگر مردیٔ احسن الیٰ من آسا

یعنی برائی کا بدلہ برائی تو بہت آسان ہے لیکن اگر تم واقعی مرد ہو تو اپنے ساتھ برائی کرنے والے کے ساتھ بھی احسان کرو اور اہل تکبر کا بہترین علاج یہ ہے کہ انکی صحبت سے کنارہ کشی اختیار کرلو یہ نہیں کہ انکے ساتھ تم بھی تکبر کرنے لگ جاؤ کیونکہ آدمی جس بات پر دوسرے کو نکیر کرے خود اسی کام کو کیوں کرے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت زیادہ متواضع اور شفیق تھے۔ روایت میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ آپ حضرات صحابہؓ کے ساتھ کہیں تشریف لے جارہے تھے کہ اچانک ایک عورت سامنے آئی اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ مجھے آپ سے ایک حاجت ہے ذرا ٹھہر جائیے اور تشریف رکھئے آپؐ نے فرمایا کہ تم جہاں چاہو بیٹھو میں تمہارا تابع ہوں میں بھی وہیں بیٹھ جاؤنگا۔ غرض آپ ٹھہر گئے اور اسکی حاجت برآری فرمادی۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ آپؐ کی کریم النفسی کا یہ حال تھا کہ کسی سے مصافحہ فرماتے تو کبھی آپ اسکا ہاتھ نہ چھوڑتے یہاں تک کہ وہی چھوڑ دیتا۔ اور جب آپؐ کسی سے کلام فرماتے تو اپنا سارا رخ اسکی جانب فرمالیتے اور اسکی جانب سے منہ نہ پھیرتے مگر یہ کہ وہی منہ پھیر لیتا یا آپؐ کلام پورا فرمالیتے۔

(۵) ایک حق مسلمان کا یہ ہے کہ اسکی چغلی نہ کھائے یعنی کسی کی بات کسی نہ لگائے اور اگر کوئی شخص کسی مسلمان کے متعلق کچھ کہے تو اسکی جانب کان نہ دھرے۔ اور یہ سمجھ لو کو جو شخص دوسروں کی باتیں تم سے نقل کرتا ہے تو ضرور تمہاری باتیں بھی اوروں سے جاکر کہتا ہوگا۔ لہٰذا ایسے شخص کے سامنے کچھ بات مت کرو اور اس سے ہوشیار رہو۔ یہ امر تجربہ کیا ہوا ہے لہٰذا یقینی ہے۔

ہر کہ عیب دگراں پیش تو آورد و شمرد
لاجرم عیب تو پیش دگراں خواہد برد

یعنی جو شخص دوسروں کے عیوب تم سے بیان کرتا ہو تو یقین کرلو اسی طرح سے تمہارے عیوب بھی دوسروں سے جا کر کہتا ہو گا۔ (یہ بہت ہی برا مرض ہے اور بڑا اسکا فساد ہے اسی لئے) حدیث شریف میں آتا ہے تمام یعنی سخن چین (چغل خور) جنت میں داخل نہیں ہو گا۔

(فائدہ) سخن چین وہ شخص کہلاتا ہے جو ان دو شخصوں میں سے (جن میں باہم رنجش اور

عداوت ہو) ایک کی بات دوسرے کو پہنچاتا ہو تاکہ عداوت اور زیادہ ہو۔ یا لوگوں کی باتیں حاکم وقت کے پاس جا جا کر واغا کرتا ہو تاکہ ایک ہل چل مچی رہے۔ مسلمانوں کے اکثر فتنہ وفساد کا سرچشمہ یہی نمیمہ (چغلی) ہوتا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں بھی منافقین کا بڑا فتنہ یہی تھا کہ یہ لوگ مسلمانوں سے ملتے ہی اسی لئے تھے کہ انکا بھید لیکر اپنے لوگوں (یعنی کافروں) کو پہنچائیں اور اس طرح سے فتنہ انگیزی کیا کریں۔

چغل خوری انسان کو ذلیل وخوار کردیتی ہے اور لوگوں کے قلوب سے اسکا اعتبار کھو دیتی ہے ایسے شخص کو لوگ دل سے قبول بھی نہیں کرتے۔ یعنی اس سے متنفر رہتے ہیں۔ نعوذ باللہ منہ۔

(۶) ایک حق مسلمان کا یہ ہے کہ اگر کبھی اس سے لڑائی وغیرہ ہو جائے تو تین دن سے زیادہ ناراض نہ رہے یعنی اس سے زیادہ اس سے ترک ملاقات وسلام وکلام جائز نہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ کسی مسلمان کے لئے حلال نہیں کہ اپنے بھائی مسلمان سے تین دن سے زیادہ ترک ملاقات کرے۔ اور جب دونوں باہم ملیں تو اچھا وہ ہے جو سلام میں پہل کرے۔ نیز حدیث شریف میں یہ بھی آتا ہے کہ جو شخص اپنے کسی مسلمان بھائی کی غلطی کو معاف کریگا تو اللہ تعالیٰ اس سے قیامت میں عفو اور درگذر کر معاملہ فرمائیں گے۔ (لہٰذا آخرت کے اس شیریں نفع کو سوچ کر ہی دنیا میں یہ تلخ گھونٹ پی لینا چاہئے اللہ تعالیٰ توفیق دے)۔

انبیاء سابقین کے حالات میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس وحی بھیجی کہ تم کو یہ بلند مرتبہ جو ملا ہے تو اس سبب سے کہ تم نے اپنے (مسلمان) بھائیوں کی خطا کو معاف کردیا تھا (یعنی جس وقت کہ انہوں نے آپؑ کے سامنے عاجز وبے بس ہو کر یہ اقرار کرلیا کہ (تَاللّٰہِ لَقَدْ اٰثَرَکَ اللّٰہُ عَلَیْنَا وَ اِنْ کُنَّا لَخٰطِئِیْنَ تو آپؑ نے فرمایا کہ لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ یَغْفِرُ اللّٰہُ لَکُمْ وَھُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ۔ بس یہ ادا ہمیں پسند آئی)۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی اپنے حق کے سبب

ے قولہ۔ یہ مطلق نہیں ہے احقر عرض کرتا ہے کہ حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے تحقیق مسئلہ کے سلسلہ میں حاشیہ پر ایک حدیث اور اس کے تحت اقوال علماء تحریر فرمایا ہے ناظرین کے افادہ کے لئے ہم یہاں وہ عبارت اور اس کا ترجمہ پیش کرتے ہیں۔ وھو ہذا

(عن ابی ایوب الانصاری قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یحل للرجل ان یھجر اخاہ) ای المسلم واعم من اخوۃ القرابۃ والصحابۃ قال الطیبی و تخصیصہ بالذکر اشعار بالعلیۃ والمراد بہ اخوۃ الاسلام ویفھم منہ انہ ان خالف ھذا الشریطۃ وقطع ھذہ الرابطۃ جاز ھجرہ فوق ثلاثۃ انتھی

بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر

کسی سے بدلہ نہ لیتے تھے ہاں مگر یہ کہ اس میں حرمت دین کی ہتک ہوتی ہو تو اس وقت دین کی خاطر بدلہ لے لیتے تھے۔

وفیه لن حینئذ یجب بجرانه و قوله (فوق ثلاث لیال) ای بایامها و انما جاز الهجر فی ثلاث وما دونه لما جبل علیه الادمی من الغضب فسومح بذلک القدر لیرجع فیها ویزول ذلک الفرض ذکره السیوطی۔

قال الخطابی رخص للمسلم ان یغضب علی اخیه ثلاث لیال لقلته ولا یجوز فوقها الا اذا کان الهجران فی حق من حقوق الله تعالی فیجوز فوق ذالک۔

قال ابن عبدالبر هذا مخصوص بحدیث کعب ابن مالک ورفیقیه حیث امر صلی الله علیه وسلم اصحابه بهجرهم یعنی زیادة علی ثلثه الی ان بلغ خمسین یوما۔ قال واجمع العلماء علی ان من خاف من مکالمة احد وصلته ما یفسد علیه دینه او یدخل مضرة فی دنیا یجوز له مجانبته و بعده ورب هجر جمیل خیر من مخالطة موذیة۔

وفی النهایه یرید به الهجر ضد الوصل یعنی فیما یکون بین المسلمین من عتب و موجدة او تقصیر یقع فی حقوق العشرة والصُّحبة دون من ما کان من ذالک فی جانب الدین فان هجرة اہل الاهواء والبدع واجبة علی الاوقات مالم یظهر منه التوبة والرجوع الی الحق فانه صلی الله علیه وسلم لما خاف علی کعبؓ ابن مالک و اصحابه النفاق حین تخلفوا عن غزوة التبوک حکم بهجر انهم خمسین یوما وقد هجر نساؤہ شهر او هجرت عائشةؓ ابن الزبیرؓ مدة و هجر جماعة من الصحابه جماعة منهم وما متهاجرین و لعل احدهما منسوخ بالاخر۔

قلت الاظهر ان یحمل نحو هذا الحدیث علی المتواخین اوا التساوین بخلاف الولد مع الوالد والاستاذ مع تلمیذه و علیه یحمل ما وقع من السلف والخلف لبغض الخلف و یمکن ان یقال الهجرة المحرمة انما تکون مع العداوة والشحناء کما یدل علیه الحدیث الذی یلیه فغیرها اما مباح او خلاف الاولی (مرقاة ج ۴)

حضرت ابو ایوب انصاریؓ سے مروی ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ کسی شخص کے لئے جائز نہیں کہ اپنے (مسلمان) بھائی سے تین دن سے زیادہ مقاطعہ رکھے۔ یہاں اخوت سے مراد عام ہے

دوستوں کی لغزش و خطا کو معاف کر دینا صالحین کا طریقہ اور انکا اعلیٰ خُلق ہے۔ نادان اور کمینہ شخص سے عفوو درگذر وقوع میں نہیں آتا۔ یہ اسی لئے کہ معاف کر دینا غایت بردباری ہے۔ ایک بات یہاں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ جو مشہور ہے کہ باہم تین دن سے زیادہ رنج و مقاطعہ نہ رکھے جو

چاہے قرابت کی ہو یا رفاقت کی۔ علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ حدیث میں اس موقع پر اخوۃ کا لفظ لانے میں علت حرمت کی جانب بھی اشارہ فرمانا مقصود ہے اور اس سے مراد اخوت اسلام ہے اور اس سے یہ بھی سمجھ میں آیا کہ اگر یہ شرط نہ پائی جائے یعنی رابطہ اسلامی ہی منقطع ہو تو اس سے تین دن سے زیادہ کا بھی مقاطعہ جائز ہے۔ انتہیٰ

(میں کہتا ہوں) ایسے شخص سے تو مقاطعہ جائز کیا واجب ہے اور حدیث میں ثلاث لیال جو فرمایا تو مراد اس سے رات دن سمیت ہے اور یہ ہجران تین دنوں سے کم کم تک اس لئے جائز ہے کہ غصہ میں مغضوب علیہ سے مقاطعہ انسانی فطرت ہے اس لئے اس کی اجازت بھی دی اور ایام مقرر کر کے شریعت نے یہ بھی چاہا کہ بس اپنے سابق حال پر لوٹ آوے علامہ خطابی فرماتے ہیں کہ مسلم کو اپنے بھائی پر تین دن اس لئے غصہ رہنے کی اجازت دی کہ یہ کم ہیں اور اس سے زیادہ کی اجازت نہیں دی الا یہ کہ یہ ہجران حقوق اللہ میں سے کسی حق سے متعلق ہو تو اس وقت تین دن سے زیادہ جائز ہے۔

علامہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے تین ہی دن کے مقاطعہ کا جو جواز معلوم ہوتا ہے وہ کعبؓ بن مالک اور ان کے دونوں ساتھیوں والی حدیث کی وجہ سے مخصوص ہو گیا ہے کہ اس میں تین ہی نہیں بلکہ پچاس دن تک آپ نے ان سے مقاطعہ جائز رکھا تھا۔ نیز فرماتے ہیں کہ علماء کا اتفاق ہے کہ جو شخص کسی سے بات چیت کرنے میں یا اس سے تعلقات رکھنے میں اپنے دین کو برباد ہوتا ہوا دیکھے یا دنیوی ہی ضرر کا احتمال پاوے تو اس کے لئے ایسی شخص سے دور رہنے کی گنجائش ہے اس لئے بہت سی جدائی جو خوبصورتی کے ساتھ ہو ایذاء اور نقصان رساں اختلاط سے کہیں بہتر ہوا کرتی ہے۔ اور نہایہ میں ہے کہ ہجران سے مراد وصل کی ضد ہے یعنی وہ چیزیں جو مسلمانوں میں ہوا کرتی ہیں مثلاً باہمی کچھ مخالفت یا قدرے ناراضگی یا حقوق معاشرت اور صحبت میں کوتاہی وغیرہ' نہ وہ اعراض و مخالفت جس کا منشاء دین ہو اس لئے کہ اہل ہواء اور اہل بدعت سے تعلقات نہ رکھنا تو واجب ہے چاہے جتنے زمانہ تک کے لئے ہو جب تک کہ وہ اپنی بدعت سے توبہ نہ کرے اور حق کی جانب رجوع نہ کرلے۔ اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کہ غزوہ تبوک سے تخلف کے موقع پر کعبؓ بن مالک اور ان کے ساتھیوں پر نفاق کا اندیشہ فرمایا تو پچاس دن تک ان سے مقاطعہ فرمایا اور سب صحابہؓ کو حکم فرمادیا کہ ان سے تعلق نہ رکھیں۔ اسی طرح سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج مطہرات سے ایک مہینہ کے لئے علیحدگی اختیار فرمائی۔ اسی طرح حضرت عائشہؓ نے عبداللہ ابن زبیر سے عرصہ دراز تک تعلق نہیں رکھا اور حضرات صحابہؓ میں سے بعض نے بعض سے ایسا تعلق ختم کیا کہ اسی حال میں دنیا سے تشریف لے گئے (اب مذکورہ حدیث اور ان تمام معاملات میں جو

مطلق۔ نہیں ہے۔ یعنی عام حکم نہیں ہے بلکہ اگر کوئی شخص ایسا ہو کہ اپنے دین و دنیا کی سلامتی اس سے ترک تعلقات ہی میں ہے تو اگر تین دن سے زیادہ بلکہ ساری عمر اس سے نہ ملے تو جائز ہے۔ اسی طرح سے منقول ہے صحابہؓ تابعین اور تبع تابعین سے۔ چنانچہ ان میں سے بعضوں نے بعض سے تعلقات اور دوستی منقطع کرلی تھی۔ لیکن نیت اس میں اچھی تھی یعنی سلامتی دین۔ البتہ اپنے کسی بھائی مسلمان سے بغض و کینہ رکھنا' یہ جائز نہیں۔

(فائدہ) یعنی جس صورت میں دنیا کی مضرت کا یقین ہو اسلئے تعلقات منقطع کرے تو یہ تو جائز ہے مگر اس سے کینہ نہ رکھے اور اگر اسکی بد دینی کی وجہ سے ملنا جلنا ترک کیا ہے تو بغض و کینہ بھی رکھنا چاہئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے الحب للہ والبغض للہ کو اسلام کا شعبہ فرمایا ہے۔

(فائدہ) اور یہ جو فرمایا کہ تین دن سے زیادہ بھی ترک تعلق کیا جا سکتا ہے مگر بغض و کینہ نہ ہونا چاہئے تو یہ اس وقت کے لئے ہے جبکہ کسی دنیوی مضرت کا یقین ہو یعنی اس وجہ سے اگر ترک تعلق کیا ہے تو گو مدت تین دن سے زیادہ ہو سکتی ہے۔ لیکن باہم کینہ نہ ہونا چاہئے۔ اگر مقاطعہ کا منشاء اسکی بد دینی ہو تو ایسے شخص سے تو کینہ اور بغض بھی رکھنا چاہئے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اسلام کی شاخوں میں سے شاخ الحب فی اللہ والبغض اللہ ہے۔

اور منجملہ مسلمانوں کے حقوق کے ایک حق یہ بھی ہے کہ تم بدون کسی امتیاز اور فرق کے جس کسی بھی مسلمان کے ساتھ حسن سلوک کر سکو ضرور کرو خواہ وہ اہل ہو یا نا اہل۔ چنانچہ منقول

ے بخدا کچھ شک نہیں تم کو اللہ تعالیٰ نے ہم پر فضیلت عطا فرمائی اور بیشک ہم خطاوار تھے

ے یعنی تم پر آج کوئی الزام نہیں اللہ تعالیٰ تمہارا قصور معاف کرے اور وہ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے۔

گذشتہ صفحہ سے آگے

تعارض سا معلوم ہوتا ہے اس کے جواب میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ شاید ان دو مختلف امور میں سے بعض' بعض کیلئے ناسخ ہو یعنی تین دن کا قول پہلے تھا بعد میں منسوخ ہو گیا۔

(صاحب نہایہ فرماتے ہیں کہ) میں کہتا ہوں کہ ظاہر یہ ہے کہ اس جیسی حدیث کو اس تعلق پر محمول کیا جائے جو دو برابر کے دوستوں میں ہوا کرتا ہے باقی اس میں وہ تعلق داخل نہیں (جس میں تربیت بھی ملحوظ ہو) جیسے لڑکے اور باپ کا تعلق یا شاگرد استاد کا تعلق (یا پیر مرید کا تعلق) چنانچہ اسلاف یا ان کے بعد اخلاف میں بھی جو ہجران (ترک تعلق) کے واقعات پائے گئے وہ بھی اسی قبیل سے تھے اس لئے حدیث ان کو شامل نہیں۔ اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہجرت (قطع تعلق) جو حرام ہے وہ ہے جو کہ عداوت اور کینہ کے ساتھ ہو جیسا کہ اگلی حدیث اس پر دال ہے۔ اس کے علاوہ جو ہجرت ہوگی وہ یا تو مباح ہوگی یا خلاف اولیٰ۔ (مرقات ص ۲۰۶ ج ۴)

ہے کہ ایک شخص حضرت محی الدین سید عبد القادر جیلانیؒ کے پاس آیا اور کہا کہ میرے پاس زکوٰۃ کے علاوہ کچھ مال ہے میں اسکے مستحق اور اہل کو نہیں سمجھ پا رہا ہوں اسلئے متردد ہوں کہ کس کو دوں اور کس کو نہ دوں۔ آپ نے فرمایا کہ میاں کس فکر میں پڑے ہو جس کو بھی دے سکتے ہو دیدو خواہ وہ اہل ہو یا نااہل تاکہ اللہ تعالیٰ بھی تم کو وہ بھی دیں جسکے تم اہل ہو اور وہ بھی جسکے تم اہل نہیں ہو۔

اسی طرح سے حدیث شریف میں بھی آیا ہے کہ اہل و نااہل سب کے ساتھ سلوک کرو اس لئے کہ وہ اگرچہ لینے کا اہل نہیں ہے مگر تم تو دینے کے اہل ہو۔ مطلب یہ کہ تمہارا دینا تو ضائع نہ ہو گا۔ چنانچہ ایک صادق اور کامل الایمان کا اور کامل الجود و العرفان کا یہی طور ہوتا ہے۔ باقی جہاں یہ معلوم ہو جائے کہ اس کو دینا اس کے فسق و معصیت میں مدد کرنا ہے تو ایسے کو نہ دے۔ اور اس میں شک نہیں کہ یہ بھی منجملہ حب فی اللہ اور بغض للہ ہی کے ہے جس کا مدار نیت پر ہے۔

(فائدہ) حضرت شیخؒ کے کلام کا حاصل یہ ہے کہ جہاں لاعلمی ہو تو اس حال میں ہر شخص کو دینا عالی ہمتی ہے اور اسکے حال کی تفتیش و تمیز نہ کرنا اس کے کمال ایمان و عرفان کی دلیل ہے۔ اور جب یہ معلوم ہو جائے اسکو دینا اس کے لئے فسق و فجور کرنے کا سبب بنتا ہے مثلاً کسی شرابی یا بھنگی وغیرہ کو اگر کچھ دیتا ہے تو گمان غالب ہے کہ وہ جا کر اس کی شراب لیکر پی لے گا تو ایسوں کو نہ دینا چاہئے۔ انتہیٰ۔

یہ ہیچداں مترجم عرض کرتا ہے کہ بعض لوگوں کی نیت یہ ہوتی ہے کہ جو بہت زیادہ محتاج ہو اس کو دیں اور اس میں زیادہ حاجت روائی ہے۔ یا یہ کہ کسی نیک اور صالح کو دیں گے جس کو عبادت پر قوت حاصل ہوگی۔ اس نیت کے پیش نظر وہ اہل کو تلاش کرتا ہے اور اسی کو دیتا ہے تو امید ہے کہ اس کی یہ نیت بھی باعث زیادت ثواب ہو پس پہلے حال کو (یعنی بلا لحاظ اہل و نااہل سب کو دینا) ایک اعتبار سے فضیلت حاصل ہے اور دوسرے حال کو (یعنی اہل کو تلاش کر کر کے دینا) دوسرے اعتبار سے فضیلت ہے اور یہ بات بھی روایات ہی سے معلوم ہوتی ہے۔ بہرحال مدار نیت پر ہے جیسا کہ حضرت شیخ رحمتہ اللہ نے فرمایا ہے واللہ اعلم بالصواب۔

اسی طرح منجملہ حقوق مسلم کے یہ بھی ہے کہ ہر شخص سے اس کے حال کے مناسب معاملہ کرے اور اس کے مرتبہ کے مطابق اپنا طور برتاؤ رکھے کہ یہ بھی منجملہ حسن خلق کے ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ غیر اہل علم یعنی عوام سے اظہار علم نہ کرنا چاہئے اور نادان کم علموں کیساتھ زیادہ فصاحت بلاغت نہ استعمال کرے کہ ایسا کرنا موجب ایذاء ہوگا۔ کیونکہ وہ لوگ بہ سبب کم علمی اور کم فہمی کے سمجھنے سے قاصر رہیں گے اور ان کو الجھن ہوگی۔ اس لئے چاہئے کہ مخاطب کی رعایت کرتے ہوئے اپنے مرتبہ سے تنزل کرے اور ان کے مرتبہ میں اتر کر ان سے کلام کرے کہ اس میں ترحم اور محبت ہے مگر اترنے کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ایسی صورت اختیار کرے کہ جس میں ترکِ

دین ہو جائے یا خلاف شرع امر کا ارتکاب ہو جائے کیونکہ اسکا نام خوش اخلاقی نہیں ہے۔ مثلاً یوں سمجھو کہ مخاطب کوئی ایسا شخص ہے کہ اس کی زبان بولنے میں اسلام کی سبکی یا مذہب کی ہتک لازم آتی ہے یا اسم مبارک اللہ تعالیٰ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نامی کی بے ادبی ہوتی ہو تو اس میں بھی اس کی موافقت نہ کرے۔

اسی طرح سے حقوق مسلم سے یہ بھی ہے کہ تمام لوگوں ؎ سے کشادہ روئی کے ساتھ ملے اور نرمی سے پیش آئے یعنی ترش رو اور تند خو نہ ہو کیونکہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ السَّھلَ الطَّلِق یعنی اللہ تعالیٰ نرم مزاج اور خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آنے والے کو پسند فرماتے ہیں۔ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے فرمایا کہ تم لوگ جانتے ہو کہ دوزخ کی آگ کس شخص پر حرام ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ ہم سے زیادہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ اس کو جاننے والے ہیں، فرمایا کہ اس شخص پر دوزخ حرام ہے جو نرم گو اور سہل گر ہو یعنی ملائم بات کہے اور آسان معاملہ کرے۔ اسی طرح سے حدیث میں آیا ہے کہ جنت میں نہایت صاف و شفاف بالا خانے ہیں ایسے کہ ان کے اندر سے باہر کا حصہ اور باہر سے اندر کا حصہ صاف نظر آتا ہے۔ ایک اعرابی نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ وہ کس کے لئے ہوں گے؟ آپؐ نے فرمایا کہ اس شخص کے لئے جو نرم بات کہے اور لوگوں کو کھانا کھلا دے اور شب میں اٹھ کر نماز پڑھے جس وقت کہ وہ لوگ آرام کی نیند سوتے ہوں (مراد اس سے نماز تہجد ہے)

منجملہ مسلمان کے حقوق کے یہ بھی ہے کہ وعدہ کو پورا کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وعدہ ایک قرض ہے نیز حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ منافق کی تین نشانیاں ہیں جھوٹ بولنا۔ وعدہ خلافی کرنا۔ امانت میں خیانت کرنا۔ اور جس شخص کے اندر یہ تینوں خصلتیں جمع ہوں وہ (پورا) منافق ہے اگرچہ نماز روزہ کرتا ہو۔ اور وعدہ کا پورا کرنا کریموں کی خصال میں سے ہے۔ باقی جو کمینہ شخص ہوتا ہے اس کے اندر ایفائے وعدہ کم ہوتا ہے۔

اسی طرح سے منجملہ حقوق مسلم کے ایک یہ ہے کہ کسی کے گھر میں بغیر اجازت داخل نہ ہو۔ کیونکہ بلا اجازت کسی کے خلوت خانہ میں جانے سے اس کو ایذاء اور تکلیف ہوتی ہے۔ اور اجازت لینے کی انتہاء تین بار تک ہے۔ اگر تین دفعہ پکارنے پر بول دے اور بلا لے تب تو جائے ورنہ واپس ہو جائے۔ حدیث شریف میں اس تین دفعہ پکارنے کی مصلحت یہ بیان فرمائی ہے کہ پہلی بار میں

(حاشیہ ؎) قولہ تمام لوگوں سے الخ یعنی ان لوگوں سے جو خلاف شرع امور کے ارتکاب میں ملوث نہ ہوں ورنہ ایسوں سے تو بیزار ہونا اور ترش روئی ہی اختیار کرنی چاہئے جبکہ یہ سمجھے کہ سیدھی طرح سے نہ مانیں گے یہ بات بھی احادیث سے ثابت ہے بلکہ اس کتاب سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ منہ ؒ

لوگ خاموش ہو کر آواز پہچاننے کی کوشش کریں گے (یعنی اہل خانہ آپس میں کہیں گے کہ چپ رہو دیکھو کوئی پکار رہا ہے) اور دوسری بار اس لئے تاکہ باہم صلاح و مشورہ کرلیں کہ اس کو اندر بلائیں یا نہیں۔ اور تیسری بار اس لئے تاکہ اس کے بعد یا تو بلا ہی لیں یا واپس کردیں۔

اسی طرح سے حقوق مسلم میں سے ایک یہ ہے کہ بڑے بوڑھوں کا ادب کرے اور چھوٹوں پر رحم اور شفقت کرے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو شخص بڑوں کا ادب ملحوظ نہ رکھے اور چھوٹوں پر رحم نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے یعنی ہمارے طریق پر نہیں ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بچوں پر شفقت اور مہربانی بہت فرمایا کرتے تھے چنانچہ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ آپ سفر سے واپس تشریف لاتے ہوتے اور بچے سامنے آجاتے تو آپ ان میں سے کسی کو تو اپنے آگے گھوڑے پر بٹھا لیتے اور کسی کو پیچھے بٹھا لیتے اور صحابہؓ سے فرماتے کہ تم لوگ بھی بچوں کو گھوڑوں پر بٹھالو یا گود ہی میں لے لو۔ اور جب اترتے تو لڑکے آپس میں فخر کرتے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو اپنے آگے بٹھایا اور تجھ کو پیچھے بٹھایا۔ اسی طرح سے جب لوگ اپنے بچوں کو آپؐ کے پاس دعا کرانے کے لئے لاتے تو آپؐ انہیں گود میں بٹھا لیتے پھر جب اگر کوئی لڑکا پیشاب کردیتا تو آپ اس کو اپنے گود سے نہ اتارتے اور جو کوئی اٹھانے لگتا تو منع فرماتے پھر آپ دعا فرماتے اور اس پر شفقت فرماتے تاکہ اس کے بڑے خوش ہوں اور یہ نہ محسوس کریں کہ اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذاء ہوئی اور جب وہ چلے جاتے تب آپ کپڑے دھوتے۔ اور جب نیا پھل آتا تو سب سے پہلے بچوں کو دیتے۔ چنانچہ یہی سنت ہے کہ جب نیا پھل آئے تو پہلے بچوں کو دے پھر خود کھائے۔ اور مقصد اس سے یہ ہے کہ بچے نیا پھل پاکر خوش ہو جاتے ہیں اور بڑوں کی تعظیم اور توقیر کے متعلق بہت روایت آئی ہے۔ اپنے بڑوں کی تعظیم کرنا سبب ہوا کرتا ہے درازئ عمر اور صاحب اولاد ہونے کا۔ پس یہ خصلت نصیب نہیں ہوتی مگر اسی کو جس کے متعلق حق تعالیٰ کو یہ منظور ہوتا ہے کہ اسکی عمر دراز ہو اور وہ صاحب اولاد ہو۔

منجملہ حقوق مسلم کے ایک یہ بھی ہے کہ جس کی ظاہری ہیئت اور لباس وغیرہ سے معلوم ہو رہا ہو کہ کوئی بڑے مرتبہ کا شخص ہے تو اس کی رعایت کرے اور اس کے مرتبہ کا لحاظ کرے کہ حفظ مراتب ضروری ہے اور اس کا یہی طریقہ ہے۔ الغرض اپنے اکابر اور اشراف کی توقیر اور احترام بھی ایسا ہی ہونا چاہئے جیسا کہ رذیل اور ادنیٰ لوگوں پر شفقت ہوا کرتی ہے یعنی جس طرح ایک جانب ان لوگوں کی توقیر لازم ہے۔ اسی طرح ان دوسرے لوگوں پر شفقت کو بھی لازم سمجھے کیونکہ ہر شخص کے لائق اس کی رعایت کرنی چاہئے اگر اس کے خلاف کرے گا تو اس کی ایذاء دہی کا سبب ہوگا کیونکہ اگر انسان کسی معزز اور مکرم شخص کی تعظیم نہ کرے تو اس سے اس کو ایذاء ہوتی ہے اور کسی غریب و مسکین پر تھوڑا سا بھی التفات کردے تو وہ اس سے بہت خوش ہو جاتا ہے روایتوں میں آتا ہے کہ

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سامنے کھانا رکھا ہوا تھا کہ اتنے میں کوئی سائل آگیا آپ نے فرمایا کہ اس کو ایک روٹی دے دو اس کے بعد ایک سوار بھی اس راستہ سے گذرا حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ اس سوار کو یہاں بلاؤ حاضرین نے عرض کیا' اے ام المومنین آپ غریبوں کو دور ہی سے دیدیتی ہیں اور اغنیاء کو اپنے پاس بلا کر کھلاتی ہیں ایسا کیوں؟ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کا مرتبہ الگ الگ بنایا ہے پس ہم پر بھی لازم ہے کہ ان کے مراتب کا لحاظ کریں۔ چنانچہ غریب ایک روٹی ہی پر راضی ہو جاتا ہے اور اس سے زیادہ کسی اور شے کی طمع نہیں رکھتا اور اگر اس امیر کو فقیروں کی طرح روٹی کا ایک ٹکڑا دیدوں تو اس سے اسے ایذاء ہوگی اور کسی مسلمان کو ایذاء دینا مناسب نہیں۔ اسی طرح سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ گھر کے اندر تشریف رکھتے تھے' صحابہ کرام جمع تھے کہ اچانک جریر ابن عبد اللہ بجلی آگئے اور اندر جگہ نہ پائی تو دروازہ ہی پر بیٹھ گئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ایک کپڑا لپیٹ کر ان کی طرف پھینک دیا کہ اسکو بچھا کر بیٹھ جاؤ۔ حضرت جریر نے اس کپڑے کو اٹھا کر آنکھوں سے لگالیا اور رو دیے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ میرا کیا رتبہ کہ آپ کے کپڑے پر بیٹھوں اور یہ کہا کہ اَکْرَمَکُمُ اللّٰهُ کَمَا اَکْرَمْتَنِی یعنی اللہ آپ کا بھی اکرام کرے جیسا کہ آپ نے مجھ پر نظر کرم فرمائی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قوم کی طرف دیکھا اور فرمایا کہ جب تمہارے پاس کسی قوم کا کوئی بڑا شخص آیا کرے تو اس کی تعظیم و توقیر کیا کرو۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پس جب کوئی آتا اور آپ گدے پر بیٹھے ہوتے اور اس پر اس کے بھی بیٹھنے کی گنجائش نہ ہوتی تو آپ گدا اپنے نیچے سے کھینچ کر اس کے نیچے بچھا دیتے اور اگر وہ نہ بیٹھتا تو آپ اصرار کر کے اس کو بٹھاتے۔

اسی طرح سے منجملہ حقوق مسلم کے ایک یہ ہے کہ اگر ہو سکے تو مسلمانوں سے باہم صلح کرا دیا کرے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ بہترین صدقات اور عمدہ ترین حسنات یہ ہے کہ مسلمانوں میں باہم صلح کرادی جائے۔ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے فرمایا کہ کیا تم کو خبر نہ دوں ایک ایسے عمل کی جو درجہ میں نماز' روزہ اور صدقہ سے بھی بہتر ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ضرور خبر دیجئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ مسلمانوں کے مابین صلح کر دینا (ان سب عبادات سے بڑھ کر ہے) چنانچہ چند مقامات ایسے ہیں جہاں شرعاً جھوٹ بولنا بھی جائز ہے ان میں سے ایک جگہ یہ بھی ہے یعنی دو مسلمانوں کے درمیان صلح کرانے کے لئے۔ یہی معنی ہیں شیخ سعدیؒ کے اس مقولہ کے جو بہت مشہور ہے کہ "دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز۔" یعنی جس جھوٹ کو صلح کرانے میں استعمال کیا جائے وہ اس سچ سے کہیں اچھا ہے جو کہ باہم فتنہ کا سبب بن جائے (پس یہاں ہر جگہ اپنا مطلب نکالنے کے لئے کذب کی اجازت نہیں دی گئی ہے بلکہ یہ صرف صلاح مابین المسلمین کے لئے ہے خوب سمجھ لیجئے۔ بعض لوگ جہل سے یا تجاہل سے مصلحت کے

معنی مطلب بر آری کے لیتے ہیں ایسا نہیں ہے بلکہ یہاں مصلحت آمیز کے معنی صلح آمیز کے ہیں۔
ہکذا افادعلینا الشیخ ھٰھنا رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(فائدہ) وہ مقامات جہاں کذب جائز ہے یہ ہیں جو اس حدیث میں مذکور ہیں۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہ کذب جائز نہیں ہے مگر تین جگہوں پر اولاً شوہر کے لئے جب کہ اس کا مقصد اس سے اپنی بیوی کو راضی اور خوش کرنا ہو۔ مثلاً بیوی سے اس کو محبت نہیں ہے مگر اس کو خوش کرنے کے لئے کہہ دے کہ میں تجھ کو بہت چاہتا ہوں (یہ جائز ہے) اسی طرح سے بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ عورت بھی اس مقصد کے پیش نظر شوہر سے جھوٹ بول سکتی ہے یعنی دونوں کو ایک دوسرے سے اظہار محبت جائز ہے اگرچہ واقعہ کے خلاف ہو کیونکہ اس کہنے کی وجہ سے باہم الفت و محبت پیدا ہوگی۔

ثانیاً جہاد یعنی کفار سے مقابلہ کے وقت بھی جھوٹ بول سکتا ہے مثلاً یوں کہے کہ میری مدد کے لئے ابھی اور فوج آرہی ہے (حالانکہ نہ آرہی ہو) یا دشمن سے کہے کہ پیچھے تو دیکھ تجھے کون مارنے آرہا ہے اور مقصد یہ ہو کہ وہ ذرا ادھر رخ کرے اور یہ انکی گردن کا صفایا کردے (یہ جائز ہے چنانچہ حدیث شریف میں اسی کو فرمایا ہے کہ الحربُ خُدعَۃٌ لڑائی دھوکا دینے کا نام ہے) ثالثاً آپس میں صلح و مصالحت کرانے کے لئے جھوٹ بولنا یہ بھی جائز ہے مثلاً دو شخصوں میں عداوت ہے اور تم ہر ایک سے ملکر کہتے ہو کہ وہ دوسرا شخص تو تمہاری بہت تعریف کیا کرتا ہے اور تم سے تو اس کو کوئی شکایت ہی نہیں ہے اور مقصد اس سے تمہارا یہ ہوتا ہے کہ ایک کے قلب میں دوسرے کی بات سے جگہ پیدا ہوجائے تاکہ وہ باہم مل جائیں تو یہ بھی جائز ہے اور یہ روایت مشکوٰۃ شریف میں آئی ہے اور ان تینوں مقامات پر جھوٹ بولنا اس لئے جائز ہوا اگر واقع کے مطابق بیان کرتا ہے تو فتنہ برپا ہوتا ہے اور جھوٹ کہہ دینے میں رفع شر اور فتنہ کا انسداد ہے یہی مطلب ہے دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز کا۔

اور منجملہ حقوق مسلم کے ایک یہ ہے کہ مسلمانوں کے عیوب کی پردہ پوشی کرے یعنی کسی کا عیب دوسروں سے نہ بیان کرے اگر یقیناً جانتا ہے کہ اس شخص کے اندر یہ عیب موجود ہے حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو شخص کسی کا عیب دنیا میں ڈھانکے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے عیب دنیا و آخرت میں ڈھانکیں گے دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں حضرت ماعزؓ سے زنا کا ارتکاب ہوگیا تھا انھوں نے خود حاضر ہوکر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کو عرض کیا آپؐ نے فرمایا تم اس کو ستر کرلیتے تو بہتر ہوتا چنانچہ اسی پردہ پوشی ہی کے خیال سے علماؒ نے فرمایا ہے کہ پوشیدہ گناہوں کی توبہ بھی پوشیدہ ہی کرنی چاہئے اور کھلم کھلا گناہوں کی توبہ بھی آشکار طور پر کرے پس جب اسلام نے ہر شخص پر خود اپنے گناہوں کا ستر لازم کیا ہے تو پھر بھلا دوسرے مسلمانوں کے عیوب

کا اظہار کیونکر جائز ہوگا لہٰذا بھائی مسلمان کے عیب کا چھپانا اسلامی حق ہے جو ہر مسلمان پر لازم تر ہے۔

نیز اظہار معصیت میں اپنے دین کو فاسد کرنا اور حرمت شرع کی ہتک بھی ہے۔ (اس لئے بھی منع ہے کیونکہ اس سے آدمی کی بیباکی کا پتہ چلتا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے دل میں شریعت کی عظمت کم ہے اس لئے کہ شرعاً جو چیز قبیح ہے یہ اس کو خوب مزے لیکر سب کے سامنے بیان کررہا ہے) چنانچہ پردہ پوشی میں مبالغہ شرعاً مطلوب ہے اور یہی وجہ ہے کہ زنا کا ثبوت بڑی مشکل سے ہوتا ہے اسمیں اسقدر احتیاط کی گئی ہے کہ چار گواہوں کے عینی شہادت پر اس کے ثبوت کو معلق رکھا ہے اور اگر ثابت نہ ہو تو خود مدعی کو حد قذف لگائی جائے گی یعنی تہمت زنا کے جرم میں اسی کوڑے لگیں گے سبحان اللہ کیا شان ستاری و غفاری ہے اور یہ حق تعالیٰ شانہٗ کی خاص صفت ہے

پس پردہ بیند عملہائے بد
ہماں پردہ پوشد بآلائے خود

یعنی پردہ کے پیچھے سے بھی برے عمل کو دیکھ لیتا ہے مگر پھر خود ہی اس کو اپنی نعمتوں سے نواز کر اس کی پردہ پوشی بھی فرما دیتا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ایک بندے کا حساب لینے کے لئے اپنے قریب کرے گا اور اپنے دامن ستر سے اسے ڈھانک کر مخلوق کی نگاہوں سے اس کو پوشیدہ کردے گا۔ پھر اس سے سوال کرے گا تجھے علم ہے تونے فلاں فلاں گنہ کئے تھے وہ بندہ عرض کرے گا ہاں میرے رب بیشک میں نے یہ گناہ کئے ہیں پھر جب اقرار کرے گا تو مارے خوف کے ہلاکت کے قریب ہو جائے گا یہ خیال کرکے کہ دیکھئے اب اللہ تعالیٰ میرے ساتھ کیا معاملہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اے بندے میں جس طرح سے تیرے گناہوں کو دنیا میں ڈھانکتا تھا آخرت میں بھی غفاری کرونگا۔ یعنی تیرے بہت سارے گناہ بخش دونگا لیکن یہ معاملہ مسلمانوں کے ساتھ ہوگا اور کافروں کو رسوا کرے گا چنانچہ ہر طرف سے فرشتے ندا دیں گے کہ هٰؤلاء الذین کذبوا علی ربهم الا لعنة الله علی الظٰلمین یعنی یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے پرودگار پر جھوٹ بولے تو سن لو کہ ظالموں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے نعوذ باللہ منہا۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو شخص مسلمانوں کی باتوں کو (تجسس اور جاسوسی کے طور پر) سنے اور انکی جانب کان لگائے جسے وہ لوگ پسند نہ کرتے ہوں تو کل کو قیامت کے دن اس سننے والے کے کان میں سیسہ پگھلا کر ڈالا جائے گا ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لوگ ایک چور کو لائے آپ نے اس کا ہاتھ کاٹے جانے کا حکم فرمایا جیسا کہ شریعت کا حکم ہے لیکن آپ کا چہرہ مبارک متغیر ہوگیا۔ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا آپ کو اس کا ہاتھ کاٹا جانا شاق ہوا۔ فرمایا کہ

حدود شرع کے قائم کرنے سے تو مجھ کو چارہ نہیں (یعنی جب کوئی جرم ثابت ہی ہو جائے گا تو حد تو جاری کروں گا ہی) لیکن تم اپنے بھائی کے حق کے بارے میں شیطان کے مددگار نہ بنو بلکہ عفو و چشم پوشی اختیار کیا کرو۔ ان اللہ غفور رحیم۔ بیشک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے حدیث میں آتا ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے گروہ ان لوگوں کے جو کہ زبان سے ایمان لائے ہو اور ابھی ایمان تمھارے قلوب میں داخل نہیں ہوا ہے لوگوں کی غیبت نہ کیا کرو اور لوگوں کے گناہوں کے تجسس میں نہ پڑا کرو تاکہ اللہ تعالیٰ تمھارے گناہوں کے درپے نہ ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ جس کے گناہوں کے درپے ہوں گے اس کو رسوا کر کے چھوڑیں گے اگرچہ وہ سو پردوں کے اندر ہے۔

مروی ہے کہ امیرالمومنین حضرت عمرؓ کے کان میں ایک شب ایک گھر سے گانے کی آواز آئی آپ پشت کی جانب سے دیوار پھاند کر گھر کے اندر داخل ہوئے دیکھا کہ ایک شخص شراب پی رہا ہے اور ایک عورت اس کے سامنے بیٹھی ہے۔ آپ نے فرمایا اے خدا کے دشمن یہ کیا ہو رہا ہے؟ اس نے کہا اے امیرالمومنین میں نے اگر ایک گناہ کیا ہے تو آپ سے تین معصیت کا ارتکاب ہوا ہے ایک تو یہ کہ آپ نے جاسوسی کی حالانکہ قرآن شریف میں آیا ہے کہ وَلَا تَجَسَّسُوا یعنی تجسس مت کیا کرو دوسرے یہ کہ آپ مکان کے اندر اس کے پشت کی جانب سے آئے حالانکہ قرآن میں ہے کہ لَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا یعنی یہ کوئی نیکی کی بات نہیں ہے کہ تم گھروں میں پشت کی جانب سے داخل ہو اور تیسرے یہ کہ آپ دوسرے کے گھر میں بدون اجازت لئے اور سلام کئے داخل ہوئے حالانکہ قرآن شریف میں ہے کہ وَلَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِکُمْ حَتّٰی تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓی اَهْلِهَا یعنی دوسروں کے گھروں میں نہ داخل ہو یہاں تک کہ ان میں رہنے والوں سے اجازت لے لو اور انکو سلام کرلو۔ یہ سنکر حضرت عمرؓ خاموش ہو گئے۔ پھر اس سے فرمایا کہ اگر توبہ کرلے تو تجھ کو معاف کردوں۔ اس نے کہا کہ خدا کی قسم اے امیرالمومنین اگر آپ مجھے معاف کردیں گے تو پھر میں کبھی اس گناہ کے قریب نہ جاؤنگا پس آپ نے معاف کردیا اور باہر تشریف لے آئے۔

نیز منجملہ حقوق مسلم کے ایک یہ ہے کہ تہمت کی جگہوں میں جانے سے پرہیز کرے تاکہ دوسرے لوگ بدگمانی میں نہ پڑیں اور غیبت نہ کریں کہ اس میں انکے دین کا ضرر ہے اور چونکہ یہ شخص اس کا سبب بنا اس لئے یہ بھی گناہ میں شریک ہوگا کیونکہ جو کسی گناہ کا سبب بنتا ہے وہ بھی اس میں شریک متصور ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے کفار کے سامنے ان کے بتوں کو برا کہنے سے منع فرمایا ہے تاکہ وہ اس کے جواب میں خدا تعالیٰ جل جلالہ کو برا نہ کہنے لگیں ارشاد فرماتے ہیں وَلَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَیَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَیْرِ عِلْمٍ یعنی

برا نہ کہو تم ان بتوں کو جن کو کفار اللہ تعالیٰ کے سوا پکارتے ہیں مبادا برا کہنے لگیں وہ کافر لوگ اللہ تعالیٰ کو بہ سبب اپنی نادانی کے (دیکھئے کفار کے بتوں کو ان کے سامنے برا کہنے سے اسی لئے منع کیا گیا ہے کہ وہ سبب بن جائے گا اللہ تعالیٰ کو گالی دیے جانے کا) ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے ارشاد فرمایا کہ انسان کا اپنے ماں باپ کو گالی دینا گناہ کبیرہ ہے صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا کوئی ایسا بد نصیب بھی ہے جو اپنے ہی ماں باپ کو گالی دے گا آپؐ نے فرمایا کہ ہاں اور اس کی صورت یہ ہے کہ یہ دوسرے کے باپ کو گالی اور وہ اس کے بدلے اس کے باپ کو گالی دے یا یہ کہ کسی کی ماں کو گالی دے اور وہ اس کے عوض اس کی ماں کو گالی دے دے پس چونکہ یہ شخص سبب ہوا اپنے ماں باپ کے گالی دیئے جانے کا تو گویا اپنے ماں باپ کو اس نے ہی گالی دی۔

دوسروں کی بدگمانی کے خیال سے تہمت کی باتوں سے بچنا اور دور رہنا اس کے متعلق بہت سی احادیث وارد ہیں چنانچہ روایت میں آتا ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ازواج مطہرات میں سے کسی زوجہ کے ساتھ باتیں کر رہے تھے ایک شخص پاس سے گزرے جب وہ کچھ آگے بڑھ گئے تو حضرتؐ نے انھیں بلایا اور فرمایا کہ اے فلانے یہ میری بیوی صفیہ ہیں۔ انھوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپؐ کے اس فرمانے کی کیا ضرورت تھی آپ کے حق میں کون گمان بد کر سکتا ہے آپؐ نے فرمایا کہ نہیں بھائی شیطان کے وسوسہ سے بے خوف نہیں ہونا چاہیے کیونکہ وہ انسان کے بدن میں خون کے مانند جاری اور سرایت کئے ہوئے ہے۔ اور حضرت عمرؓ کا ایک شخص پر گذر ہوا کہ وہ بر سر راہ ایک عورت سے باتیں کر رہا تھا۔ آپ نے اس کو مارنے کے لئے درّہ اٹھایا اس نے عرض کیا یا امیرالمومنین یہ میری بیوی ہے آپ نے فرمایا کہ پھر تم نے اس سے ایسی جگہ کیوں باتیں کیں کہ کوئی نہ دیکھتا اور بدگمانی کا موقع نہ ہوتا۔

نیز مسلمان کے حقوق سے یہ بھی ہے کہ محتاجوں اور غریبوں کی سفارش کرے ایسے شخص سے کہ جس کے یہاں کچھ قدر و منزلت رکھتا ہو اور مسلمانوں کی حاجت روائی میں سعی کرے حدیث شریف میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے فرمایا کہ میرے پاس لوگ حاجتیں طلب کرنے کے لئے آتے ہیں اور سوال کرتے ہیں اور تم لوگ میرے پاس ہوتے ہو پس انکی سفارش کر دیا کرو تاکہ تمھیں بھی ثواب ملجایا کرے۔ نیز فرمایا کہ میں کاموں میں تاخیر کر دیتا ہوں اسی لئے تاکہ تم سفارش کرو اور اس کا ثواب حاصل کر لو چنانچہ بادشاہوں کی صحبت میں جو فوائد حاصل ہوتے ہیں منجملہ انکے ایک یہ بھی ہے کہ انکے پاس کسی کی سفارش کا موقع مل جایا کرے گا۔ کیونکہ راہ نیک بتا دینے کا بڑا ثواب ہے۔

(فائدہ) چنانچہ آتا ہے کہ جو شخص کسی کو کسی اچھی بات کی جانب رہنمائی کرتا ہے تو اس رہنمائی کرنے والے کو ویسا ہی ثواب ہوتا ہے جیساکہ اس کرنے والے کو۔ مثلاً ایک شخص نے

کسی کو کسی سے کچھ دلوادیا یا کسی کا قصور معاف کرادیا یا کسی کو ظلم سے یا خلاف شرع امور سے روک دیا تو اس کو بھی ویسا ہی ثواب ہوگا جیسا خود اس کرنے والے کو نیز روایت میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی مدد فرماتا رہتا ہے جب تک وہ اپنے بھائی مسلمان کی مدد میں رہتا ہے اسی طرح سے اور بہت سی روایتیں آئی ہیں۔ پس یہ تحصیل ثواب کے لئے عجیب نعمت ہے جو کہ بدون مشقت کے حاصل ہوتی ہے یعنی ذرا سی زبان ہلا دینے سے حاصل ہوتی ہے مگر افسوس کہ اس سے لوگ اس طرح غافل ہیں کہ کبھی اس کا خیال بھی نہیں کرتے۔ چنانچہ بادشاہوں کی مصاحبت سے قصد و نیت یہی ہونی چاہئے کہ لوگوں کی حاجات برآوری میں کوشش و سفارش کروں گا نہ یہ کہ اس کو اس کی مصاحبت کا بہانہ بنائے اور لوگوں کو چپ کرنے کے لئے اس کو ذلیل بنائے (اور مقصد ان کے قرب سے تحصیل جاہ و مال ہو یہ تو بہت ہی برا ہے۔ (اللہ ما حفظنا ۱۲)

(فائدہ) مطلب یہ کہ امیروں اور بادشاہوں کی صحبت میں آفات بھی بہت ہیں پس اگر خالص نیت جو اوپر مذکور ہوئی رکھے گا تو جائز ہوگا۔ اور اگر اس کو فقط بہانہ بنائے گا اور لوگوں پر یہ ظاہر کرے گا کہ میں ان کی صحبت میں لوگوں ہی کو نفع پہنچانے کے لئے حاضر ہوتا ہوں حالانکہ مقصود اپنی خواہش نفسانی کا پورا کرنا ہو تو یہ اچھا نہیں۔ مخلوق کو نیت کا حال نہیں معلوم لیکن اللہ تعالیٰ تو علام الغیوب ہیں ہر ایک کی نیت کو وہ جانتے ہیں پس ان کے سامنے بہانہ بازی کچھ کام نہ آئے گی۔

نیز حقوق مسلم میں سے ایک یہ ہے کہ گفتگو کرنے سے پہلے نیز اس کی مجلس میں حاضر ہونے سے پہلے اس کو سلام کرے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب ایک مسلمان اپنے دوسرے مسلمان بھائی کو سلام کرتا ہے اور وہ اس کا جواب دیتا ہے تو اس پر ستر فرشتے صلوٰۃ بھیجتے ہیں یعنی اس کے لئے دعا مانگتے ہیں۔ نیز حدیث شریف میں آتا ہے کہ ملائکہ تعجب کرتے ہیں اس مسلمان پر جو کسی مسلمان سے ملاقات کرے اور اس کو سلام نہ کرے اور تعجب اس پر کرتے ہیں کہ بڑا ہی نادان ہے وہ شخص ذرا سی زبان ہلانے میں اسے کتنا ثواب مل جاتا اس سے محروم رہا۔ اور لکھا ہے علماء نے کہ اگلی امتوں میں سلام کرنے کی جگہ سجدہ تھا اور سلام ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے ساتھ مخصوص ہے۔ چنانچہ اہل جنت کا سلام یہی کلمہ ہوگا کہ وہ باہم السلام علیکم کہیں گے۔

(ادب) جس شخص کے متعلق جانتا ہے کہ وہ جواب نہیں دے گا تو اس کو سلام نہ کرے چنانچہ منقول ہے بعض اگلے بزرگوں سے کہ وہ کسی قوم پر سے گذرے اور انہیں سلام نہیں کیا اور کہا کہ مجھ کو سلام کرنے سے کوئی چیز مانع نہیں ہوئی بجز اس خوف کے کہ مبادا یہ لوگ جواب نہ دیں اور اس کی وجہ سے فرشتے ان پر لعنت کریں۔

(ادب) چاہیے کہ جب اپنے گھر میں آئے تو بوقت داخلہ سلام کرے اگرچہ گھر میں کوئی موجود نہ ہو کیونکہ وہاں فرشتے تو ہوتے ہی ہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایسا کرنے سے گھر میں برکت

ہوتی ہے۔

(فائدہ) بیہقی کی ایک روایت میں آتا ہے کہ جب تم گھر میں داخل ہو تو اپنے اہل کو سلام کرو اور جب نکلو تو ان کو سلام ہی کے ساتھ رخصت کرو۔

بعض علماء نے فرمایا ہے کہ جس مکان میں کوئی نہ ہو اس میں یوں کہے اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَ عَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ۔ اور اس میں فرشتوں کو بھی سلام کرنے کی نیت کرے۔ ملا علی قاریؒ نے ایسا ہی بیان کیا ہے۔ حضرت سہیل بن سعدؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص نے حاضر ہو کر اپنی تنگ دستی اور محتاجی کا شکوہ کیا۔ آپؐ نے فرمایا جب تم گھر میں داخل ہوا کرو تو سلام کیا کرو۔ خواہ کوئی گھر میں ہو یا نہ ہو پھر اس کے بعد مجھ پر سلام بھیجو یعنی "صلی اللہ علی محمد" یا اس کے مانند کچھ اور کہو اور پھر قل ہو اللہ احد ایک بار پڑھ لیا کرو اس شخص نے ایسا ہی کیا جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس پر کشائش فرمائی اور اس کو اتنی روزی عطا فرمائی کہ وہ اپنے پڑوسیوں اور قرابت داروں میں تقسیم کرتا تھا۔ حصن حصین کے مصنف نے اس روایت کو حاشیہ پر نقل کیا ہے۔

(ادب) مستحب ہے کہ سلام کے جواب میں کچھ زیادہ ہی کر دے یعنی اگر کوئی کہے السلام علیکم تو جواب دینے والا کہے وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'۔ اس لئے کہ قرآن شریف میں آیا ہے وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَا اَوْ رُدُّوْهَا۔ یعنی جب تم میں کوئی السلام علیکم کہہ کر سلام کرے تو اس کو اس سے اچھا جواب دو یعنی کچھ زیادہ کر کے یا انہیں کلمات کو دہرا کر۔

(فائدہ) میں کہتا ہوں سلام کرنے میں جتنے بھی الفاظ زیادہ کرے گا اتنا ہی زیادہ ثواب پائے گا۔ حدیث شریف میں آتا ہے ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا السلام علیکم' حضرتؐ نے اسے سلام کا جواب دیدیا وہ بیٹھ گیا آپؐ نے فرمایا اس شخص کو دس نیکیاں حاصل ہوئیں۔ پھر ایک اور شخص آیا اور اس نے کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ' حضرتؐ نے اس کے بھی سلام کا جواب عطا فرمایا وہ بھی بیٹھ گیا آپؐ نے فرمایا اس کو بیس نیکیاں ملیں۔ پھر ایک اور شخص آیا اس نے کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'۔ حضورؐ نے اس کے بھی سلام کا جواب دیا اور وہ بھی بیٹھ گیا آپؐ نے فرمایا اس کو تیس نیکیاں ملیں۔ یہ حدیث ترمذی اور ابو داؤد کی ہے اور ابو داؤد میں ایک اور روایت آئی ہے اس میں اتنا اور آیا ہے کہ پھر ایک اور شخص آیا اس نے کہا السلام علیکم و رحمۃ اللہ وبرکاتہ ومغفرتہ'۔ اس پر حضرت نے فرمایا کہ اس کو چالیس نیکیاں ملیں۔ اور یہ فرمایا کہ اسی طرح جتنے بھی الفاظ بڑھتے جائیں گے اتنا ہی ثواب بڑھتا جائے گا۔

(ادب) اگر ایک شخص جماعت میں سے سلام کرے تو سب کی طرف سے کفایت کرے گا یعنی

سلام سماعت کی جانب سے سنت ادا ہو جائے گی۔ اسی طرح سے جواب میں بھی اگر ایک شخص جواب دیدے گا تو سب کی جانب سے واجب' ادا ہو جائے گا۔

(ادب) سوار کو چاہیے کہ پیدل چلنے والے کو سلام کرے اور پیادہ پا چلنے والے کو چاہئے کہ بیٹھے ہوئے کو سلام کرے اور تھوڑے لوگ بہت لوگوں کو سلام کریں یعنی چھوٹی جماعت بڑی جماعت کو ابتداء بالسلام کرے اور چھوٹی عمر والا بڑی عمر والے کو حدیث شریف میں یہی ترتیب آئی ہے۔

(ادب) جب کسی مجلس میں جائے تو چاہئے کہ پہلے سلام کرے پھر بیٹھے اور جب اٹھے تو پھر سلام کرے۔

(ادب) اہل ذمہ کو سلام نہ کرے اور اگر وہ سلام کریں تو جواب میں ہداک اللہ یا اسی کی مانند کوئی کلمہ کہے۔ اور کافر اہل کتاب کے سلام کے جواب میں فقط علیکم کہے۔

(فائدہ) کتاب مغنی الطالب میں لکھا ہے کہ ابتداء سلام کرنا سنت ہے اور اس کا جواب دینا فرض ہے اور سلام کا ادب یہ ہے کہ اعلیٰ درجہ والے اپنے سے کم درجے والے کو ابتداء بالسلام کریں جیسے سوار بیٹھے ہوئے کو اور پیدل چلنے والے کو اور چلنے والا بیٹھے ہوئے کو۔ استاد اپنے شاگرد کو۔ اسی طرح آقا اپنے غلام کو پہلے سلام کرے اور...... ایک کا سلام جماعت کی طرف سے اسی طرح ایک کا جواب دینا سب کی طرف سے کافی ہو جائے گا۔ امام ابو اللیثؒ نے فرمایا ہے کہ مسجد میں داخل ہونے والا "اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا مِنْ رَّبِّنَا" کہے جبکہ مسجد میں کوئی نہ ہو' اور اگر لوگ نماز پڑھ رہے ہوں تو پھر یوں کہے "اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَ عَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ" اور اگر لوگ نماز نہ پڑھ رہے ہوں تو اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ کہے۔

(ادب) جب قبرستان جائے تو یوں کہے اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُسْلِمِيْنَ وَ اِنَّا اِنْشَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَا حِقُوْنَ نَسْئَلُ اللّٰهَ لَنَا وَلَكُمُ الْعَافِيَةَ۔ یعنی تم پر سلام ہو اے قبر والو جو کہ مومنین اور مسلمین ہو۔ انشاء اللہ ہم بھی تمہارے ساتھ ملنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے ہم اپنے لئے اور تمہارے لئے عافیت طلب کرتے ہیں۔

سلام منجملہ حقوق اسلام کے ہے۔ شناسائی اور معرفت پر موقوف نہیں ہے۔ چنانچہ جب ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے ملے تو چاہئے کہ اس کو سلام کرے۔ اور اس میں دیوار یا درخت جیسی کوئی شے حائل ہو جانے کے بعد کی ملاقات بھی داخل ہے۔ یعنی ملاقات ہوئی پھر دیوار کی آڑ میں ہو گیا اور پھر لوٹا تو اب پھر سلام کا استحقاق ہو گیا۔ روایت میں آتا ہے کہ یہود کی ایک جماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئی اور کہا السام علیک اور سام جو بغیر لام کے ہے اس کے معنی ہیں موت کے۔ پس اس جملہ کے معنی یہ ہوئے کہ تم پر موت آئے یہ سن کر حضورؐ نے فرمایا

"علیکم" یعنی تم پر۔ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہودیوں کو مخاطب کر کے کہا علیکم السام ولعنۃ اللہ یعنی تم پر موت ہو اور خدا کی لعنت ہو۔ آپؐ نے فرمایا اے عائشہ! اللہ تعالیٰ ہر چیز میں نرمی کو پسند فرماتا ہے۔ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ نے سنا نہیں کہ انہوں نے کیا کہا ہے آپ کو کوسا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں نے بھی تو کہا "علیکم" یعنی ان کا کوسنا انہیں پر لوٹا دیا۔

(ادب) انگلی اور ہاتھ کے اشارے سے سلام نہ کرے کہ یہ نصاریٰ اور یہود کا سلام ہے اور سلام کرنے میں جھکے بھی نہیں کہ حدیث میں اس کی ممانعت آئی ہے۔

(فائدہ) علامہ طیبیؒ نے محی السنۃ سے نقل کیا ہے کہ (سلام کے وقت) پیٹھ کا جھکانا مکروہ ہے کیونکہ حدیث صحیح میں اس کی ممانعت آئی ہے اگرچہ بہت سے اہل علم وصلاح بھی اس کو کرتے ہیں لیکن اس کا اعتبار اور اعتماد نہ کرنا چاہئے اور مطالب المومنین میں شیخ ابو منصور سے منقول ہے کہ اگر کوئی کسی کے آگے زمین کا بوسہ دے یا پیٹھ خم کرے یا سر جھکا دے تو اس سے کافر تو نہیں ہوگا کیونکہ مقصود تعظیم ہے نہ عبادت مگر گنہ گار ہوگا۔ انتہیٰ۔ اور بعضے مشائخ نے اس کے منع کرنے میں بہت تشدید اور تغلیظ کی ہے چنانچہ کہا ہے کہ کاد الانحناء ان یکون کفرًا یعنی جھکنا قریب بکفر ہے واللہ اعلم۔ حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ نے ترجمہ مشکوٰۃ میں ایسا ہی لکھا ہے۔

(ادب) پیشاب کرنے والے کو سلام نہ کرے اور اگر کوئی کرے تو اس کو چاہئے کہ جواب نہ دے۔ حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی حالت میں سلام کیا کہ آپ پیشاب کر رہے تھے۔ آپ نے اس کو جواب نہیں دیا۔

(ادب) السلام سے پہلے علیک کہنا یعنی علیک السلام کہنا مکروہ ہے ایک شخص نے اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا آپ نے فرمایا یہ تو میت کا سلام ہے یعنی قبر پر جا کر یوں سلام کیا کرتے ہیں اور اس بات کو آپ نے تین بار فرمایا۔ اس کے بعد فرمایا کہ تم میں سے جب کوئی شخص اپنے بھائی مسلمان سے ملے تو چاہئے کہ اس کو السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ کہے۔

(فائدہ) سلام کا جواب دینا اسی طرح سے چھینک کا جواب دینا فی الفور واجب ہے یعنی تاخیر کرنا جائز نہیں ہے۔ اور جس خط میں سلام لکھا ہو تو اس کے جواب میں سلام لکھنا واجب ہے جس طرح کہ زبانی سلام کا جواب زبان سے دینا واجب ہے۔ اور اگر کوئی شخص یوں کہے کہ میری جانب سے فلاں کو سلام کہہ دینا تو اس پر واجب ہے سلام کہنا (یعنی یہ ایک امانت ہے جس کا ادا کرنا ضروری ہے یا اس کو قبول ہی نہ کرے اور کہہ دے کہ اگر یاد رہا تو کہہ دوں گا وعدہ نہیں کرتا) اور اگر کوئی فاسق

کھلم کھلا فسق میں مبتلا ہو تو اس کو سلام کرنا مکروہ ہے۔ یہ تمام مسائل "درمختار" سے لکھے گئے ہیں اور کتاب معدن الجواہر میں سلام کے مسائل مفصل بیان کئے گئے ہیں جسے دیکھنا منظور ہو وہاں ملاحظہ کرے۔

اور سلام کے ساتھ مصافحہ کرنا بھی سنت ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب دو مسلمان باہم ملاقات کرتے ہیں اور پھر آپس میں مصافحہ کرتے ہیں تو ان دونوں کے درمیان ستر مغفرت تقسیم کی جاتی ہے جس میں سے انہتر اس کے لئے ہوتی ہے جس کی جانب سے شگفتگی اور تازگی زیادہ ہو یعنی جو شخص زیادہ خندہ روئی کے ساتھ ملے گا اس کو اس قدر ثواب ملے گا انہتر مغفرت اس کے لئے ہوئی اور بقیہ ایک مغفرت دوسرے شخص کے لئے اور اس پہلے کو اس قدر ثواب اس لئے ملا کہ اس نے اپنی خوش خلقی سے مومن کا دل خوش کر دیا اور کسی مومن کے دل کا خوش کرنا بڑے ہی اجر و ثواب کی بات ہے۔ ایک دوسری حدیث میں بجائے ستر کے سو کا لفظ آیا ہے۔ یعنی سو درجے تقسیم ہوتے ہیں نوے اول شخص کے لئے اور دس دوسرے کے لئے۔

روایت میں آتا ہے کہ ایک صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام کیا۔ آپ وضو فرما رہے تھے جواب نہیں دیا۔ جب آپ وضو فرما چکے تو ان کے سلام کا جواب دیکر ان سے مصافحہ فرمایا انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں تو اب تک اس عمل یعنی مصافحہ کو اہل عجم کی رسم سمجھتا تھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ جب دو مسلمان باہم ملاقات کریں اور مصافحہ کریں تو ان کے گناہ اس طرح جھڑ جاتے ہیں جیسے درختوں سے پتے۔

(ادب) اور جو شخص صالح اور بزرگ ہو تو بغرض تعظیم و توقیر دینی کے اس کا ہاتھ چومنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کو بوسہ دیا کرتے تھے۔ نیز روایت میں آتا ہے کہ ایک اعرابی نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ کے سر اور دست مبارک کو بوسہ دوں آپؐ نے اس کو اجازت دے دی۔ اور یہ بھی آتا ہے کہ حضرت ابو عبیدہؓ نے جب حضرت عمرؓ سے ملاقات کی تو ان سے مصافحہ کیا اور ان کے ہاتھ کو چوما اور پھر دونوں ہی رو پڑے۔ یوں بعض روایت سے دست بوسی کی ممانعت بھی معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا ہم سلام کے وقت جھکا کریں آپ نے فرمایا نہیں۔ پھر میں نے عرض کیا اچھا کیا ہم بوسہ دیا کریں؟ آپؐ نے فرمایا کہ نہیں۔ میں نے عرض کیا' اچھا تو کیا مصافحہ کر لیا کریں؟ آپؐ نے فرمایا کہ ہاں یہ ٹھیک ہے۔

اس روایت میں کوئی تصریح نہیں کہ کس چیز کے بوسہ سے منع فرمایا پیشانی اور سر کے یا ہاتھ کے پس ہو سکتا ہے آپ کی مراد بوسہ سے ہاتھ کے بوسہ کے علاوہ کسی اور چیز کا بوسہ دینا ہو۔ واللہ

(فائدہ) کتاب دُرَر میں ہے کہ کسی مرد عالم اور پرہیز گار کے ہاتھ کو تبرک کے طور پر چومنے میں کچھ حرج نہیں ہے اور بزازیہ میں ہے کہ عالم کے سر کو چومنا بھی مستحسن ہے اور کسی غیر عالم غیر عادل کے ہاتھ کے چومنے کی اجازت نہیں ہے۔ یہی مختار قول ہے۔ اور محیط میں ہے کہ اگر اس شخص کے اسلام کی تعظیم اور اس مسلم کے اکرام کے خیال سے ہو تو جائز ہے۔ اور اس سے دنیا حاصل کرنے کے خیال سے ایسا کرنا مکروہ ہے۔ باقی یہ جو جاہل لوگ کیا کرتے ہیں کہ جب کسی سے ملتے ہیں تو مصافحہ کر کے اپنا ہی ہاتھ چوم لیتے ہیں ایسا نہ صرف یہ کہ مکروہ ہے بلکہ جائز بھی نہیں ہے۔ اسی طرح سے جاہل عوام' امراء اور علماء کے آگے زمین بوسی کرتے ہیں یہ تو بالکل حرام ہے۔ اس فعل کا کرنے والا اور اس سے خوش ہونے والا دونوں گناہ گار ہوں گے کیونکہ یہ بت پرستی کے مشابہ ہے۔ اور اگر کسی غیر اللہ کی عبادت اور تعظیم کے خیال سے زمین بوس ہوا ہے تب تو یہ کفر ہی ہے۔ اور اگر تحیتہ کیا یعنی سلام کی جگہ یہ طریقہ اختیار کیا تو کافر تو نہ ہو گا مگر گناہ گار اور مرتکب کبیرہ ہو گا۔

اور کتاب ملتقط میں ہے کہ غیر اللہ کے سامنے تواضع اور عاجزی کی صورت بنانا حرام ہے جیسے کسی امیر کے سامنے اس کی امیری کا خیال کر کے تواضع اختیار کی چنانچہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جس شخص نے کسی غنی کے آگے اس کی غناء کے سبب سے تواضع اختیار کی تو اس کا دو تہائی دین جاتا رہا۔ باقی دینی علم و شرف رکھنے والوں کے آگے جو تواضع کی جاتی ہے وہ حقیقتاً اللہ تعالیٰ کے لئے اور اس کی رضا کے لئے ہوتی ہے۔ غیر اللہ کے لئے نہیں ہوتی اس لئے وہ اس میں داخل نہیں یہ مسائل درمختار وغیرہ سے لئے گئے ہیں۔

یہاں فقہاء نے زمین بوسی کو جو منع کیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ یہ جہلاء قبروں کے آگے یا مزاروں کی چوکھٹ پر جو بوسہ دیتے ہیں یہ بہت ہی برا ہے اس لئے کہ حرمت کی علت بت پرستی کی مشابہت کو قرار دیا اور وہ یہاں بھی پائی جاتی ہے بلکہ کچھ زیادہ ہی ہے اسی طرح سے قبر کو بوسہ دینا منع ہے۔ چنانچہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے مدارج النبوۃ میں لکھا ہے کہ قبر کو بوسہ دینا اور اس کو سجدہ کرنا اور اس پر رخسار رکھنا حرام اور ممنوع ہے اور والدین کی قبر کو بوسہ دینے کے متعلق فقہ کی روایتیں جو نقل کرتے ہیں وہ بھی جائز نہیں ہے۔ انتہیٰ کلام الشیخ۔ اور یہاں غیر اللہ کے سجدہ کو جو حرام و ممنوع فرمایا ہے تو اس کی جو تفصیل مائتہ المسائل میں ہے خوب ہے۔ لکھتے ہیں کہ سجدہ کرنا غیر خدا کو خواہ قبر ہو یا کچھ اور حرام اور گناہ کبیرہ ہے۔ اور اگر غیر اللہ کو بطور عبادت کے سجدہ کیا تو موجب شرک و کفر ہے اور اگر غیر خدا کو خواہ قبر ہو یا غیر قبر بدون حضور نیت یونہی سجدہ کرے (یعنی نہ عبادت کی نیت ہو نہ تعظیم کی جیسا کہ بالعموم عوام کیا کرتے ہیں تو) وہ بھی موجب کفر ہی ہے۔ چنانچہ یہ بات فقہ کی کتابوں سے معلوم ہوتی ہے۔ انتہیٰ۔

سفر کی واپسی پر کسی کا اکرام کرنا یعنی کچھ خاطر مدارات کر دینا اور اس سے گلے ملنا اور اس کے (سر یا پیشانی) کا بوسہ لے لینا روایات میں وارد ہے۔ باقی اگر فتنہ کا اندیشہ ہو تو پھر گلے ملنا مکروہ ہے۔ اسی طرح سے کسی کی تعظیم کے لئے اٹھنا اور کھڑا ہونا اگر اس کی دنیوی جاہ و عظمت اور ثروت کے لحاظ سے ہو تو مکروہ ہے اور اگر اس کا منشا دینی عظمت اور اس کی علمی بزرگی ہو تو جائز ہے لیکن مسجد میں کسی کی تعظیم کے لئے اٹھنا بہت ہی برا ہے اس لئے کہ مسجد اللہ تعالیٰ کی جگہ ہے (نہ کہ غیر اللہ کی تعظیم کی) پس اس مقام کو اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کے لئے مخصوص رکھے۔ دوسرے کی تعظیم کر کے شرک نہ کرے۔ حضرات صحابہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لاتے وقت کھڑے نہ ہوتے تھے اس لئے کہ آپ کو یہ فعل پسند نہ تھا۔ فرماتے تھے کہ یہ سب اہل عجم کے تکلفات ہیں (یعنی ریاست کے چونچلے ہیں) باقی آنے والے کے حق کے سلسلہ میں مسنون جو ہے وہ یہ کہ اس کے لئے جگہ میں وسعت کر دے اور خوش خلقی اور شگفتہ روئی کا اظہار کرے اور اس کو دعا دے۔ لیکن اس زمانہ میں چونکہ لوگوں میں تکلفات زیادہ ہو گئے ہیں اور نفسانیت طبیعتوں میں راسخ ہو گئی ہے اس لئے اگر کسی کے اسلام کے اکرام کی خاطر سے اور محض اس وجہ سے کھڑا ہو جائے کہ اس (متکبر) کی ایذاء سے محفوظ رہوں گا تو گنجائش ہے مگر احباب میں جہاں کچھ تکلف نہیں ہوا کرتا یہ رسم نہ ہو تو بہتر ہے۔

کتاب مغنی الطالب میں لکھا ہے کہ بادشاہ عادل' والدین اور دیندار پرہیزگار اور بزرگوں کی تعظیم کے واسطے کھڑا ہونا مستحب ہے اور فاسق و فاجر کے لئے مکروہ اور منع ہے۔ اسی طرح سے علماء کی سواری کی رکاب پکڑنا بھی توقیر و تعظیم ہی میں داخل ہے۔ چنانچہ صحابہؓ کے اقوال اس بارے میں وارد ہیں۔ آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ ایک مجلس میں تشریف فرما تھے (حضرت ابن عباسؓ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی تھے اور زید بن ثابتؓ کاتب وحی اور ایک جلیل القدر صحابی تھے) جب مجلس برخاست ہوئی اور حضرت زید بن ثابتؓ جانے کے لئے اپنی سواری پر سوار ہوئے تو ابن عباس نے ان کی سواری کی لگام پکڑ لی یعنی پیدل اس کو پکڑے پکڑے چلنے لگے۔ حضرت زید نے فرمایا کہ اے ابن عم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ آپ کیا کر رہے ہیں آپ لگام چھوڑ دیجئے ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ہم کو اپنے علماء کی اسی طرح تعظیم کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ سن کر حضرت زید نے ابن عباس کا ہاتھ پکڑ کر اس کو بوسہ دیا اور فرمایا کہ ہم بھی اسی طرح سے اپنے اشراف کے ساتھ ادب کرنے کا حکم کئے گئے ہیں (سبحان اللہ دونوں حضرات کا ادب بے نظیر ہے اور قابل تقلید ہے۔ اسی طرح سے منجملہ حقوق مسلم کے ایک یہ ہے کہ اس کی جان مال اور آبرو کو حتی وسع ظالموں کے پنجرے سے محفوظ رکھے اور مظلوم کی فریاد کو پہونچے۔ ان کی مدد کرے اور ان کا خیر خواہ رہے کیونکہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جس کے پاس اس کا مسلمان

بھائی فریاد لے جائے اور وہ اس معاملہ میں اس کی مدد کرنے پر قادر بھی ہو اور پھر مدد نہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو دنیا و آخرت میں رسوا کریں گے۔ اور یہ بھی حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص دنیا میں اپنے بھائی مسلمان کی آبرو کی حفاظت کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت میں اس کے لئے ایک فرشتہ مقرر فرماویں گے جو اس کی دوزخ سے حفاظت رکھے گا۔

اسی طرح سے مسلمان کا ایک حق یہ ہے کہ جب وہ چھینکے اور اس پر الحمد للہ کہے تو اس کے جواب میں یرحمک اللہ کہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب تم میں سے کسی کو چھینک آوے تو وہ الحمد للہ رب العالمین کہے اور جب وہ یہ کہہ لے تو جو شخص سنے وہ یرحمک اللہ کہے اور جب وہ یہ کہے تو چھینکنے والا کہے یغفر اللہ لنا ولکم۔

(فائدہ) کتاب مغنی الطالب میں لکھا ہے کہ چھینکنے والے کے لئے مستحب ہے کہ وہ چھینکنے میں آواز کو بلند نہ کرے اور چھینکنے کے بعد الحمد للہ بلند آواز سے کہے۔ اور سننے والے پر واجب ہے کہ اس کے جواب میں یرحمک اللہ کہے اور چھینکنے والا پھر اس کے جواب میں یغفر اللہ لنا ولکم کہے یہ کہے یہدیکم اللہ ویصلح بالکم۔ اور یہ الحمد للہ کہنا یا اس کا جواب دینا بس تین چھینکوں تک ہے۔ اس کے بعد چھینکنے والا تو ہر بار الحمد للہ کہے مگر سننے والے کو اب اختیار ہے کہ جواب دے یا نہ دے۔ نیز یہ جواب دینا وہاں واجب ہوتا ہے جبکہ چھینکنے والا بلند آواز سے الحمد للہ کہے اور اگر اس نے بلند آواز سے نہیں کہا تو جواب واجب نہیں۔

(ادب) اگر پاخانہ میں یا بوقت جماع چھینک آوے تو دل میں الحمد للہ کہہ لے زبان سے نہ کہے۔ روایت میں آتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سوال کیا کہ یا رب العزۃ! ہم کبھی ایسی حالت میں ہوتے ہیں کہ تیرا ذکر کرنا اس وقت بے ادبی معلوم ہوتا ہے' مثلاً جنابت کی حالت میں یا قضاء حاجت کے وقت میں' ایسے وقت میں ہم کیا کریں؟ حکم ہوا کہ اُذْکُرْنِی عَلٰی کُلِّ حَالٍ مجھے ہر حال میں یاد کرو اور ایسے اوقات میں صرف دل میں یاد کر لیا کرو۔ نیز حدیث شریف میں آتا ہے کہ تین چھینکوں تک تو جواب دینا ہے اس سے زیادہ زکام کی علامت ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک چھینکنے والے کا جواب دیا پھر اس نے دوبارہ چھینکا آپ نے فرمایا کہ تم کو زکام معلوم ہوتا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب چھینک آتی تو آپ آواز کو پست فرماتے تھے اور اپنے دہان مبارک کو ہاتھ یا رومال سے ڈھانک لیتے تھے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ یہودی لوگ آپ کے سامنے قصداً چھینکتے تھے اس امید پر کہ آپ اس کے جواب میں یرحمکم اللہ فرمادیں گے (تو رحم کی دعا مل جائے) مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے جواب میں یہدیکم اللہ فرماتے تھے یعنی اللہ تم کو ہدایت دے۔

حدیث شریف میں آتا ہے چھینک رحمان کی جانب سے ہے اور جمائی شیطان کی طرف سے

مطلب یہ کہ چھینک آجانے سے دماغ کو فرحت حاصل ہوتی ہے اور دماغ ہلکا ہو جاتا ہے اور عبادت میں نشاط پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لئے اس کو رحمان کی جانب سے منسوب کیا (اور اسی لئے اس پر الحمد للہ کہا جاتا ہے) اور جمائی علامت کسل اور سستی کی ہے اور شیطان اس سے خوش ہوتا ہے کہ بس اب میں اس پر خوب قادر ہوں گا اس لئے اس کو شیطان کی جانب منسوب کیا' ورنہ تو خالق یعنی پیدا کرنے والے ہر دو کے اللہ تعالیٰ ہی ہیں۔ اور حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب جمائی لینے والا جمائی لیتے وقت ہاہا کرتا ہے جیسا کہ عام عادت اسی طرح سے آواز کرنے کی ہے تو شیطان اس جمائی لینے والے کے پیٹ کے اندر سے ہنستا ہے۔ (رہا یہ کہ وہ پیٹ میں کیسے چلا جاتا ہے اور اس کا ہنسنا کس طرح ہوتا ہے تو اس کی کیفیت کا جاننا ضروری نہیں یہ خبر ہم کو صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے اس لئے ہمارا اس پر ایمان ہے اس کی کیفیت ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے مومن کو اس موقع پر بس یہی کہنا چاہئے کہ صَدَقْتَ یا رسول اللّٰہ۔ یا رسول اللہ آپ نے سچ فرمایا ہے' ہم اس پر ایمان لاتے ہیں۔

(فائدہ) مغنی ابو الطالب میں لکھا ہے کہ جمائی شیطان کی جانب سے ہے لہٰذا جب جمائی آئے تو منہ پر ہاتھ رکھ لے اور آواز بلند نہ کرے' بلکہ جہاں تک ہو سکے آواز کرنے ہی سے بچے۔

اسی طرح سے منجملہ مسلمانوں کے حقوق کے ایک حق یہ ہے کہ شریر لوگوں سے پرہیز کرے اور خلق و مدارت کا معاملہ رکھتے ہوئے اپنے کو ان کے شر سے محفوظ رکھے اور اپنی زبان پر ان کی برائی نہ لاوے کہ موجب فتنہ و فساد ہے اور دل سے تو ان کو برا سمجھنا اور زبان سے برا نہ کہنا یہ نفاق نہیں ہے۔ بلکہ خود کو ان کے شر سے بچانا ہے۔ نفاق تو یہ ہے کہ کسی اہل خیر کی طرف سے قلب میں برائی اور بد عقیدگی رکھے اور زبان سے نرمی کرے اور موافقت ظاہر کرے۔ حضرت ابو الدرداءؓ فرماتے ہیں کہ ہم ایک قوم کے سامنے تواضع اور انکسار سے پیش آتے ہیں اور ہمارے قلوب ان پر لعنت کرتے ہوتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اس آیت وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ کی تفسیر میں اس کو بھی داخل فرماتے ہیں۔ مطلب یہ کہ مسلمان دور کرتے ہیں فحش اور ایذاء کی چیزوں کو سلام' اور مدارات کے ذریعہ۔ چنانچہ ام المومنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاضری کی اجازت چاہی آپ نے فرمایا آنے دو برا انسان ہے اور جب وہ آگیا تو آپ نے اس کے ساتھ ایسی نرم گفتگو فرمائی جس سے میں یہ سمجھی کہ آپ اس کو دوست رکھتے ہیں۔ جب وہ چلا گیا تو حضرت عائشہؓ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ یہ کیا معاملہ تھا کہ اول تو آپ نے اسے مکروہ رکھا لیکن جب وہ آگیا تو اس طرح (نرمی) سے پیش آئے۔ آپ نے فرمایا کہ اے عائشہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بدترین شخص وہ ہے جس کی فحش گوئی کی وجہ سے لوگ اس کو چھوڑ دیں۔ (نعوذ باللہ منہا)

اسی طرح سے مسلم کا ایک حق یہ ہے کہ ان میں سے فقیروں اور مسکینوں سے ملا کرے اور یتیموں پر شفقت اور احسان کرے۔ اور صرف امیروں کے ساتھ مصاحبت اور ہم نشینی نہ اختیار کرے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاء ہی یہ تھی اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِیْ مِسْکِیْنًا وَ اَمِتْنِیْ مِسْکِیْنًا وَاحْشُرْنِیْ فِیْ زُمْرَۃِ الْمَسَاکِیْنَ۔ یعنی اے اللہ مجھے مسکین ہی زندہ رکھ اور اسی حالت پر موت دے مجھے اور مسکینوں ہی کے زمرہ میں میرا حشر فرما۔ اسی طرح سے حضرت سلیمان پیغمبر علیہ السلام جب مسجد میں تشریف لاتے اور کسی مسکین کو بیٹھا ہوا دیکھتے تو وہیں جا کر بیٹھ جاتے اور فرماتے کہ ایک مسکین دوسرے مسکین کے پاس بیٹھ گیا۔ کہتے ہیں کہ سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کوئی نام اتنا محبوب نہ تھا جتنا کہ یا مسکین پیارا تھا یعنی مسکین کہنے سے خوش ہو جاتے تھے اور اس نام کو بہت دوست رکھتے تھے۔ حضرت کعب احبارؓ نقل فرماتے ہیں کہ جس طرح سے قرآن شریف میں یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْ (یعنی اے ایمان والو) آیا ہے اسی طرح سے اس کی جگہ پر توراۃ میں یا ایھا المساکین (یعنی اے مسکینو!) آیا ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دریافت کیا کہ اے رب العزت! میں آپ کو کہاں تلاش کروں فرمایا شکستہ دلوں کے پاس۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگ موتی سے دور رہو۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ موتی کون ہیں۔ آپ نے فرمایا امیر لوگ۔ اور یتیم پر شفقت کرنے اور خبر گیری رکھنے پر بہت ثواب آیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میں اور یتیم کا خیال رکھنے والا جنت میں ایک ساتھ ہوں گے اور یہ بھی حدیث آیا ہے کہ جو کوئی یتیم کے سر پر اپنا ہاتھ رکھے بطور رحم و شفقت کے تو اس کو ہر بال کے عوض ایک نیکی ملے گی' نیز فرمایا کہ سب گھروں سے بہتر وہ گھر ہے جس میں لوگ یتیم کے ساتھ اچھا برتاؤ کریں۔

اور منجملہ حقوق مسلم کے ایک یہ ہے کہ ہمیشہ سب مسلمانوں کا خیر خواہ رہے اور ان کی حاجت روائیوں میں کوشش کرے۔ اور ہمیشہ اس فکر میں رہے کہ کس طرح کسی مسلمان کا دل خوش کروں۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ مومن وہ ہے کہ جو اور دوسرے مسلمانوں کو اپنے نفس کی مانند چاہے اور یہ بھی حدیث میں آیا ہے جو کوئی ایک گھنٹہ رات یا دن کا کسی مسلمان کی حاجت روائی میں صرف کرے تو یہ اس کے لئے دو مہینے کے اعتکاف سے بہتر ہے۔ پھر خواہ اس کی حاجت پوری ہو یا نہ ہو۔ اور یہ بھی فرمایا کہ جو شخص کسی مسلمان کا دل خوش کر دے یا کسی مظلوم کی مدد کر دے تو اللہ تعالیٰ اس کو تہتر مغفرتیں عطا فرمائے گا۔ نیز حدیث شریف میں آتا ہے کہ دو خصلتیں ایسی ہیں کہ ان سے بڑھ کر کوئی نیکی نہیں ایک اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا اور دوسرے اللہ کے بندوں کو نفع پہنچانا۔ یہ بھی حدیث میں آیا ہے کہ کسی مسلمان کے دل کا خوش کرنا بہترین اعمال میں سے ہے۔ اور یہ بھی حدیث میں آیا ہے کہ اپنے بھائی مسلمان کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ صحابہؓ نے

عرض کیا یا رسول اللہ مظلوم کی مدد تو ظاہر ہے مگر ظالم کی مدد کیونکر کی جائے آپ نے فرمایا کہ اس کو ظلم کرنے سے روک دو۔ یعنی ظالم کی مدد یہی ہے کہ اس کو ظلم کرنے سے روک دیا جائے۔

حضرت معروف کرخی رحمتہ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ جو شخص روزانہ یہ دعا تین بار پڑھ لے اس کا شمار ابدالوں میں سے ہوگا اور وہ دعاء یہ ہے۔ اَللّٰهُمَّ اَصْلِحْ اُمَّةَ مُحَمَّدٍ اَللّٰهُمَّ ارْحَمْ اُمَّةَ مُحَمَّدٍ اَللّٰهُمَّ فَرِّجْ عَنْ اُمَّةِ مُحَمَّدٍ (صلی اللّٰہ علیہ وسلم) ترجمہ۔ اے اللہ امت محمدیہ کی اصلاح فرما۔ اے اللہ امت محمدیہ پر رحم فرما۔ اے اللہ امت محمدیہ کی مشکلات آسان فرما۔

(فائدہ) امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ جو شخص ہر روز تین بار یہ دعاء پڑھے اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِاُمَّةِ مُحَمَّدٍ اَللّٰهُمَّ ارْحَمْ اُمَّةَ مُحَمَّدٍ اَللّٰهُمَّ تَجَاوَزْ عَنْ اُمَّةِ مُحَمَّدٍ (صلی اللہ علیہ وسلم) ترجمہ۔ امت محمدیہ کی مغفرت فرما۔ اے اللہ امت محمد پر رحم فرما اے اللہ امت محمدیہ کی لغزشوں سے درگذر فرما۔ علماء نے اس کو ابدال کے درجہ میں شمار کیا ہے۔ اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے بھی مشکوۃ کے ترجمہ میں ایسا ہی لکھا ہے۔

اور منجملہ حقوق مسلم کے ایک یہ ہے کہ اگر وہ بیمار ہو تو اس کی عیادت (یعنی بیمار پرسی) کو جائے کہ بیمار کی عیادت کا بہت ثواب آیا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو شخص کسی بیمار کی عیادت کو صبح کو جاتا ہے تو اس کے لئے ستر ہزار فرشتے شام تک رحمت اور مغفرت کی دعاء کرتے ہیں اور جنت میں اس کے لئے ایک باغ بنا دیا جاتا ہے۔ اور یہ بھی آیا ہے کہ جو شخص کسی بیمار کی عیادت کرے تو وہ ایسا ہے کہ گویا دریائے رحمت میں گھس جاتا ہے اور اسی طرح رحمت میں بیٹھتا ہے اور غوطے لگاتا ہے۔

(فائدہ) ایک روایت میں آتا ہے کہ فرمایا رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جو شخص اچھی طرح سے وضو کرے اور پھر محض ثواب طلب کرنے کی غرض سے اپنے کسی مسلمان بھائی کی عیادت کو جائے تو بقدر ساٹھ برس کی مسافت کے دوزخ سے دور کر دیا جاتا ہے۔

عیادت کے آداب یہ ہیں۔ بیمار کے پاس بہت دیر تک نہ بیٹھے مگر یہ کہ اس کو اس کے بیٹھنے ہی سے سکون ملتا ہو۔ اس لئے بیٹھنا پسند کرتا ہو۔ اس سے بہت زیادہ اس کا حال نہ پوچھے (یعنی مختصر مزاج پرسی کرے اور تفصیلی حالات تیمارداروں اور عزیزوں سے پوچھے اس لئے کہ بسا اوقات مریض کو بولنا بار ہوتا ہے) اس کی تکلیف پر اظہار رنج کرے اور اس کی صحت کے لئے دعاء کرے۔ اور اس کے عیبوں کی طرف نظر نہ کرے، مثلاً اس کی آنکھ سوجی ہو یا منہ پھول گیا ہو تو اس پر بار بار نظر نہ کرے اس لئے کہ اس سے اس کو شرمندگی اور تکلیف ہوتی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ مریض کی کامل عیادت یہ ہے کہ اپنا ہاتھ اس کی پیشانی یا ہاتھ پر رکھے۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ایک بار عیادت کرنا سنت ہے اور اس سے زیادہ نفل (یعنی مستحب) ہے۔ بعض

علماء نے یہ بھی فرمایا ہے کہ عیادت تین دن کے بعد کرے۔

(فائدہ) لیکن یہ قول قابل اعتماد نہیں۔ محدثین کے نزدیک سنت عیادت کی اول مرض ہی میں ہے اور اکثر علماء اس پر ہیں کہ عیادت کسی وقت کے ساتھ مقید نہیں۔ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امیر المومنین حضرت عمرؓ کی عیادت کو تشریف لائے اور کئی بار فرمایا بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ أُعِيْذُكَ بِاللّٰهِ الْأَحَدِ الصَّمَدِ الَّذِيْ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا أَحَدٌ مِنْ شَرِّ مَا تَجِدُ (یعنی پناہ میں دیتا ہوں میں تجھ کو اس اللہ بے نیاز کی جو نہ جنتا ہے اور نہ جنا گیا ہے اور نہ اس کا کوئی ہمسر ہے اس چیز (مرض) سے جو تو پاتا ہے)

(فائدہ) حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ فرمایا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جو مسلمان کسی مسلمان کی عیادت کو جائے اور سات باریوں کہے أَسْئَلُ اللّٰهَ رَبَّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ أَنْ يَّشْفِيَكَ (یعنی سوال کرتا ہوں اللہ سے جو کہ رب ہے عرش عظیم کا یہ کہ شفا دے تم کو) اس کی وجہ سے بیمار شفا پا جاوے گا مگر یہ کہ اس کی موت ہی آگئی ہو تو اور بات ہے کہ موت کا کوئی علاج نہیں۔ یہ روایت مشکوٰۃ میں ہے۔

اور مریض کے آداب یہ ہیں، صبر و سکون کے ساتھ رہے۔ مرض کی شکایت نہ کرے اور جزع فزع یعنی بہت زیادہ واویلا نہ مچائے۔ علاج و معالجہ کرے لیکن شافی مطلق صرف خدا تعالیٰ کو جانے اور اسی پر توکل کرے۔ دوا (یا طبیب) پر اتکال اور بھروسہ نہ کرے اور یہ سمجھو کہ دوا علاج کرنا توکل کے منافی نہیں ہے۔ اس لئے کہ دوا بھی اللہ تعالیٰ ہی کی پیدا کی ہوئی ہے (اور خدا تعالیٰ کے حکم سے وہ فائدہ کرتی ہے)۔

روایت میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ کی عیادت کو تشریف لے گئے فرمایا کہ اے علیؓ یوں دعا کرو اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْئَلُكَ تَعْجِيْلَ عَافِيَتِكَ أَوْ صَبْرًا عَلٰى بَلِيَّتِكَ أَوْ خُرُوْجًا مِنَ الدُّنْيَا إِلٰى رَحْمَتِكَ وَإِنَّكَ سَتُعْطٰى إِحْدَاهُنَّ

یعنی اے اللہ میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھے فوری عافیت عطا فرما یا اپنی آزمائش پر صبر دے یا دنیا سے آپ کی رحمت کی جانب نکلوں۔ تو تم عنقریب ان تین چیزوں میں سے ایک دیئے جاؤ گے۔

(ادب) بیمار کے لئے مستحب ہے کہ یوں أَعُوْذُ بِعِزَّةِ اللّٰهِ وَقُدْرَتِهٖ مِنْ شَرِّ مَا أَجِدُ میں اللہ تعالیٰ کی بزرگی اور اس کی قدرت کے ساتھ اس (بیماری) کے برے اثرات سے پناہ مانگتا ہوں جس کو کہ پا رہا ہوں۔ وأُحَاذِرُ

(فائدہ) حضرت عثمانؓ بن ابی العاص سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک بار رسول صلی اللہ

علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے بدن کے درد کی شکایت کی۔ آپ نے فرمایا کہ تم اپنا ہاتھ درد کی جگہ رکھو اور تین بار بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہہ کر یہ دعا سات بار پڑھ لو اَعُوْذُ بِعِزَّةِ اللّٰہِ وَ قُدْرَتِہٖ مِنْ شَرِّ مَا اَجِدُ وَ اُحَاذِرُ (ترجمہ بلا اس میں اتنا زائد ہے کہ جس کو میں فی الحال پا رہا ہوں یا جس کا آئندہ کے متعلق اندیشہ کرتا ہوں) حضرت عثمانؓ بن ابی العاص کہتے ہیں کہ میں نے اسی طرح کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فی الفور اس تکلیف کو میرے بدن سے دور فرمادیا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو اپنے بدن پر قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ پڑھ کر دم فرماتے تھے یعنی اپنے ہاتھ اور بدن کے کسی حصہ پر دم فرما کر ہاتھ کو پورے بدن پر جہاں تک پہونچ سکتا پھیر لیتے تھے۔ پس جب آپ کو وہ بیماری ہوئی جس سے آپ روبہ صحت نہ ہو سکے تو اس میں انہیں دونوں کو پڑھ کر آپ پر دم کرتی تھیں جس کی صورت یہ ہوتی کہ آپ کے دونوں دست مبارک کو لیکر اس پر دم کردیتی اور پھر اسی کو آپ کے بدن پر پھیر دیتی تھی اور حضرت کے اہل بیت میں سے کوئی بیمار ہوتا تو اس پر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان ہی سورتوں کو پڑھ کر دم فرماتے تھے۔ یہ سب روایتیں مشکوٰۃ میں ہیں۔

اسی طرح سے منجملہ حقوق مسلم کے ایک یہ ہے کہ اپنے بھائی مسلمان کی تعزیت کرے اور اس کے جنازے میں شرکت کرے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو شخص کسی مسلمان کے جنازہ پر حاضر ہو اس کو ایک قیراط کے برابر ثواب ملتا ہے (قیراط دینار کے بیسویں حصہ کو کہتے ہیں اس کو دینار سے وہی نسبت ہے جو قرش کو ریال سے ہے) اور حدیث شریف میں آتا ہے کہ یہ قیراط مانند احد پہاڑ کے ہے۔ اور چاہئے کہ جنازہ میں شرکت سے مقصد میت کا حق ادا کرنا اور موت سے عبرت حاصل کرنا ہو۔ منقول ہے کہ حضرت مالک بن دینارؒ ایک جنازہ کے پیچھے روتے ہوئے جارہے تھے اور یہ کہتے جاتے تھے کہ خدا کی قسم مجھے نہیں معلوم کہ میں یہاں سے (یعنی دنیا سے) کس چیز کے ساتھ جاؤں گا۔ یعنی دیکھئے موت کس عمل پر ہوتی ہے۔ اچھے پر یا برے پر۔ اور نہیں معلوم کہ میرا قیام یہاں کب تک ہے (یہ ہے عبرت اور تفکر' افسوس کہ ہم آج اس سے کس قدر دور ہو چکے ہیں) حدیث شریف میں آتا ہے کہ میت سے تعلق رکھنے والی تین چیزیں ہیں بعد موت کے دو ان میں سے اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہیں اور تیسری چیز اس کے ساتھ جاتی ہے۔ وہ دو چیزیں جو چھوٹ جاتی ہیں اس کا مال اور اس کے اہل ہیں اور جو چیز اس کے ہمراہ جاتی ہے وہ اس کا عمل ہے۔

تعزیت کے آداب یہ ہیں: غمگین ہو اور بات کم کرے اور ہنسے نہیں مصیبت زدہ کو تسلی دے اور اگر وہ جاہل ہو یا حد سے زیادہ بے صبرا ہو تو اس کو صبر دلانے میں مبالغہ نہ کرے کہ بعضے جاہل ایسے موقعوں پر کفر بک دیتے ہیں۔ نعوذ باللہ من ذلک (لہٰذا اس کا سبب تم نہ بنو)۔

منجملہ حقوق مسلم کے ایک یہ بھی ہے کہ کبھی کبھی زیارت قبور کو جایا کرے اور اس سے

مقصود صاحب قبر کے لئے دعاء کرنی اور اپنے قلب کو نرم کرنا ہو (یعنی یہ کہ دنیا سے دل سرد ہو اور آخرت یاد آوے)۔

منقول ہے کہ حضرت عمرؓ جب قبرستان تشریف لے جاتے تھے تو اتنا روتے کہ آپ کی ریش مبارک تر ہو جاتی تھی اور یہ فرماتے تھے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپ فرماتے تھے کہ قبر آخرت کی منزلوں میں سے سب سے پہلی منزل ہے اگر اس سے نجات ہو گئی تو آگے کا معاملہ آسان ہی ہوتا چلا جائے گا اور اگر اسی میں دشواری پیش آگئی تو پھر معاملہ مشکل ہے۔

حضرت ابو الدرداؓ کبھی کبھی قبرستان تشریف لے جاتے اور قبروں کے درمیان بیٹھ جاتے لوگوں نے اس کا سبب پوچھا تو فرمایا کہ کیوں ہم نشینی نہ اختیار کروں ایسے قوم کی جن کے پاس بیٹھنا مذکر آخرت بنتا ہے اور جب یہاں سے اٹھتا ہوں تو یہ لوگ مجھ کو غیبت سے امن میں رکھتے ہیں یعنی جب ان کی صحبت سے موت کا دھیان ہو گیا تو پھر یہاں سے ہٹ کر بھی وہی قائم رہتا ہے اور جسے اپنی موت کا استحضار ہو جائے اس کو کسی کی غیبت کی فرصت کہاں؟

(ایک معنی تو یہ ہوئے جس کا حاصل یہ ہے کہ میں غیبت سے ان کی برکت سے بچ جاتا ہوں باقی اس کا ایک اور مطلب بھی علماء سے سنا گیا ہے وہ یہ کہ یہ ایسے ہم نشین ہیں کہ ان کی صحبت میں رہو تو نفع اور ان کے پاس سے غائب ہو جاؤ تو ضرر سے حفاظت۔ اس سے ان کا صالح ہمنشیں ہونا بتلانا مقصود ہے کیونکہ ایسا دوست جو غائبانہ بھی ناصح رہے اور غیبت نہ کرے ملنا بہت دشوار ہوتا ہے اس لئے کہ عام حالت تو یہی ہیں کہ۔

در برابر چو گو سفندِ سلیم
در قفا ہمچو گرگِ مردم خوار

یعنی سامنے تو معصوم بھیڑوں کی طرح رہتے ہیں اور پس پشت خونخوار بھیڑیا ہو جاتے ہیں اور یہ حال یہ کہ "در پیشت بمیرند و در پسِت عیبب گیرند" سامنے تو اس طرح ملتے ہیں کہ مرے جاتے ہیں اور جہاں نظروں سے غائب ہوئے، غیبت شروع کر دی۔ ان حالات سے گھبرا کر فرمایا کہ یہ لوگ ایسے نہیں ہیں بلکہ ایسے مصاحب ہیں کہ صحبت بھی ان کی بھلی اور غیبوبتہ بھی غیبت سے خالی۔ (واللہ تعالیٰ اعلم)۔

حضرت حاتم اصمؒ نے فرمایا کہ جو شخص قبرستان میں سے گذرے اور اپنے حال میں تفکر نہ کرے تو اس نے ان کے حق میں بھی خیانت کی اور اپنے حق میں بھی یعنی ان کی زیارت سے اپنے اندر جو فکر پیدا ہوتی اور موت کا دھیان ہوتا جب وہ نہ ہو تو گویا یہ خیانت ہی ہوئی اپنے حق میں بھی (کہ بھلائی سے محروم رہا) اور ان کے حق میں بھی (کہ ان کو نیکی کا واسطہ نہ بنایا)۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی جگہ سے سواری

پر گذرے اچانک وہ سواری بڑی زور سے کودی آپ نے فرمایا یہاں کفار کا مقبرہ ہے کیا؟ صحابہؓ نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہؐ۔ آپ نے فرمایا کہ ان اہل قبور کو جو عذاب ہو رہا ہے اور میں اس کو سن رہا ہوں اگر تم لوگ سن لو تو کھانا پانی چھوڑ دو۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے' فرمایا کہ ایک دن ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ بستی سے باہر مقبرہ کی جانب گئے آپ ایک قبر کے نزدیک بیٹھ گئے اور رونے لگے ہم بھی رونے لگے آپؐ نے فرمایا تم کو کس چیز نے رلایا؟ ہم نے عرض کیا کہ آپؐ کے رونے نے آپؐ نے فرمایا کہ یہ قبر ہے آمنہ بنت وھب کی (یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ ماجدہ کا نام ہے) میں نے اللہ تعالیٰ سے اجازت چاہی کہ اپنی والدہ کی زیارت کرلوں۔ چنانچہ اجازت ہو گئی اس کے بعد میں نے ان کے لئے مغفرت کی دعا کرنے کی اجازت چاہی' اس کی اجازت نہیں دی گئی۔ اس پر شفقت مادری کا غلبہ ہوا اور والدہ کو یاد کر کے میں رونے لگا۔ (میرے رونے کا یہ سبب تھا) متقدمین علماء کا قول یہی ہے کہ آپ کے والدین کی مغفرت نہیں ہوئی' موت علی الکفر کی وجہ سے لیکن بعض متاخرین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کو کافر کہنے سے منع کیا ہے۔ ان کا یہ قول ہے کہ آنحضرت کے تمام باپ دادا با ایمان گئے ہیں۔ اور بعض نے اس مسئلہ میں توقف کیا ہے۔ یعنی گفتگو کرنے کو منع فرمایا ہے۔

زیارت قبور کے آداب یہ ہیں کہ مکان سے چلتے وقت دو رکعت نماز ادا کرے اور ہر رکعت میں سورہ فاتحہ اور آیتہ الکرسی اور تین بار سورہ اخلاص پڑھے اور اس کا ثواب میت کو بخشے پھر قبرستان کی جانب چلے اور راستہ میں کوئی لایعنی بات یا حرکت نہ کرے اور قبرستان کو پہونچ کر جوتا اتار لے کہ حدیث میں ایسا ہی آتا ہے۔ اور جب قبر پر پہونچے تو میت کے منہ کی جانب کھڑا ہو اور سلام کرے جس طرح سے کہ زندوں کو سلام کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد قبلہ رو ہو کر کھڑا ہو اور پست جگہ کھڑا ہونا بہتر ہے' ٹیلہ وغیرہ پر کھڑا ہونے سے۔ اور کچھ قرآن پڑھے اور پھر اللہ سے نہایت تضرع وزاری کے ساتھ دعا کرے۔ (میت کی نجات' رفع درجات اور ان کے واسطہ سے اپنی حاجات کے لئے) قبر کو نہ تو بوسہ دے اور نہ اس کو ہاتھ لگائے کہ یہ سب کفار کی عادت اور ان کا طریقہ ہے۔ قبرستان جا کر یہ دعا پڑھے۔

اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُسْلِمِيْنَ يَرْحَمُ اللّٰهُ لَنَا وَلَكُمْ وَلِلْمُتَقَدِّمِيْنَ مِنْكُمْ وَ الْمُتَاخِرِيْنَ وَ اِنَّا اِنْ شَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَاحِقُوْنَ اَسْأَلُ اللّٰهَ لَنَا وَلَكُمُ الْعَافِيَةَ

؎ سلام ہو تم پر اے قبر والو جو کہ مومن اور مسلم ہو۔ اللہ تعالیٰ ہم پر بھی اپنا رحم فرمائے اور تم پر بھی اور تمہارے اگلے پچھلوں پر اور اگر خدا کو منظور ہوا تو ہم بھی تم سے ملنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے اپنے لئے اور تمہارے لئے عافیت طلب کرتا ہوں۔

اور اگر مقبرہ شہداء کا ہو تو یہ کلمات بھی کہے
سَلَامٌ عَلَیْکُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَی الدَّارِ اس کے بعد بیٹھ جائے اور کہے
بِسْمِ اللّٰہِ وَ عَلٰی مِلَّۃِ رَسُوْلِ اللّٰہِ اس کے بعد کہے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ یُحْیِیْ وَ یُمِیْتُ وَھُوَ حَیٌّ لَا یَمُوْتُ بِیَدِہِ الْخَیْرُ وَ ھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ اس کے بعد سورۂ فاتحہ اور آیتہ الکرسی پڑھے پھر سات بار یا دس بار قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ پڑھے کہ حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے میت کی قبر میں ایک نور پیدا فرماتا ہے اور زیارت کرنے والے کے گناہ بخش دیتا ہے۔ اور تمام مردوں کے لئے دعا کرے اور یوں کہے:

اَللّٰھُمَّ اٰنِسْ وَ حْشَتَھُمْ وَ اٰمِنْ رَوْعَتَھُمْ وَ لَقِّنْ حُجَّتَھُمْ وَ بَیِّضْ غُرَّتَھُمْ وَنَوِّرْ تُرْبَتَھُمْ وَ ارْحَمْ غُرْبَتَھُمْ وَ تَقَبَّلْ حَسَنَاتِھِمْ وَ کَفِّرْ سَیِّاٰتِھِمْ وَ صَلَّی اللّٰہُ عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِہٖ وَ اَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ بِرَحْمَتِکَ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ۔

زیارت قبور کے اوقات میں سے بہترین وقت دو شنبہ۔ پنج شنبہ۔ جمعہ اور شنبہ کا دن ہے اور جمعہ کے دن نماز جمعہ کے بعد زیارت قبور کرنا بہتر ہے۔ اسی طرح سے متبرک راتیں زیارت قبور کے لئے بہتر اور افضل زمانہ ہے۔ بالخصوص شب برات۔ یوں ہر وقت ہی زیارت کی جا سکتی ہے، جب چاہے کرے۔

یہاں تک جو آداب مذکور ہوئے وہ جملہ مخلوق کے ساتھ حسن معاشرت کے آداب تھے۔ باقی ان تمام اخلاق کا مرجع اور حاصل یہ ہے کہ جو اپنے لئے پسند کرے وہی تمام مسلمانوں کے لئے پسند کرے کہ یہی کمال ایمان ہے۔ اور مسلم کو لازم ہے کہ کسی مسلمان کو بنظر حقارت نہ دیکھے اگرچہ وہ فاسق ہی کیوں نہ ہو، مبادا اس کا خاتمہ بالخیر ہو جائے اور تم کو آج اس سے اچھے ہو مگر انجام کار تمہارا

ـہ تم پر سلام ہو بسبب اس کے کہ تم نے صبر کیا (اور مشقت جھیلی) پس دار آخرت کیا ہی عمدہ ہے۔ نہیں ہے کوئی معبود سوا اللہ تعالیٰ کے۔ وہ تنہا ہے اس کا کوئی شریک نہیں، اس کے لئے ملک ہے، اس کے لئے حمد ہے۔ وہی زندہ کرتا ہے اور وہی موت دیتا ہے اور وہ خود زندہ ہے اس کو کبھی موت نہیں۔ اسی کے قبضہ میں ہر قسم کی خیر ہے۔ اور وہ ہر شے پر قدرت کامل رکھتا ہے۔

ـہ اے اللہ! انس عطا فرما ان کی وحشت میں۔ امن دے ان کے خوف میں۔ اور جس دلیل سے یہ کامیاب ہو جائیں وہ ان کو تلقین کر۔ روشن کر دے چہرے ان کے۔ اور منور کر تربت ان کی رحم فرما ان کی غربت پر اور قبول فرما نیکیاں ان کی اور دور فرما دے گناہ ان کے۔ اور رحمت نازل فرمائے اللہ تعالیٰ اپنی بہترین مخلوق (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر اور ان کی اولاد پر اور ان کے اصحاب پر سب پر۔ اپنی رحمت کے ساتھ اے سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والے۔

فسق پر ہو اور اعتبار خاتمے ہی کا ہے۔ اسئل اللّٰہ تعالیٰ حسن الخاتمہ و نعوذ باللّٰہ من سوء الخاتمہ۔

حکم مستوری و مستی ہمہ بر خاتمہ است
کس ندانست کہ آخر بچہ حالت گذرد

مستور الحال اور کھلم کھلا شراب نوشی کرنے والے ہر دو کا اعتبار خاتمہ پر ہے اور یہ کوئی نہیں جانتا کہ اس کا آخری حال کیسا گذرے گا۔

اور دین کو دنیا کے عوض نہ دے کہ نہ دین ہی حاصل ہو اور نہ دنیا۔ اور کسی دنیادار شخص کی اس کی دنیا کی وجہ سے زیادہ تکریم و تعظیم نہ کرنا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دنیا کچھ بھی قدر کی چیز ہی نہیں ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اگر دنیا کی قدر اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو کسی کافر کو اس دنیا میں سے ایک چلو پانی پینے کو نہ دیتا باقی دنیاداروں کے ساتھ دشمنی بھی نہ کرو کہ اس کی وجہ سے بھی تم ایسے فتنہ میں پڑ جاؤ گے کہ اس سے خلاصی مدت درازہی میں ہو سکے گی۔ یوں اہل فسق کو شفقت اور رحمت کی نظر سے دیکھے تو بہتر ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا غضب جو ان پر ہے وہی ان کے لئے کافی ہے (تم ان کی جانب میلان سے بچو غضبان ہونا ضروری نہیں)۔

(ادب) اہل زمانہ کے تعلق اور محبت پر اعتماد نہ کرو اور اگر تمہارے منہ پر وہ تمہاری تعریف کریں تو اس کے دھوکہ میں نہ پڑو کیونکہ ایسے شخص کا وجود جس کا حاضر غائب یکساں ہو نا مانند عنقا کے معدوم ہے (لہٰذا یہ شخص بھی جو منھ پر تمہاری تعریف کر رہا ہے یہ ضروری نہیں کہ غائبانہ بھی تمہارا محب ہو۔ تحقیق کرو گے تو غائبانہ اس کو نہ پاؤ گے۔ پس جو شخص سامنے ایسا کہے اور غائبانہ اس کے خلاف کہے اسکی تعریف کا کیا اعتبار اور اس سے کیا خوش ہونا؟)

(ادب) جہاں تک ہو سکے تم خود نیک رہو اور یہ مت کہو کہ اور لوگ تو برائی کر رہے ہیں اب میں اکیلا ہی کیا نیک رہوں اس لئے کہ ہر شخص اپنے عمل میں گرد ہو گا (قال اللّٰہ کُلُّ نَفۡسٍۭ بِمَا كَسَبَتۡ رَهِينَةٌ) اگر تم کو کوئی احتیاج بھی ہو تو مخلوق سے اسکی طمع اور توقع نہ رکھو۔ کیونکہ اگر تمہاری غرض نہ حاصل ہوئی تو اظہار حاجت کر کے تم ذلیل و خوار ہو جاؤ گے۔ اور اگر تم دوسروں سے بے پروا ہو تب بھی کسی پر تکبر نہ کرو کہ شاید محتاج ہو جاؤ (اور جس پر آج تکبر کر رہے ہو کل اسی سے عرض حاجت کرنی پڑ جاوے)

کسی شخص سے تم نے کچھ طلب کیا اور اس نے نہ دیا تو اس کے دشمن نہ ہو جاؤ کہ دشمنی کی مصیبت نہ پانے کی مصیبت سے کہیں بڑھ کر ہے۔

ادب جس شخص کے متعلق تمہارا یہ گمان ہو کہ وہ نصیحت نہیں قبول کرے گا اسکو نصیحت

مت کرو کہ اس کی وجہ سے وہ تمہارا دشمن ہو جائے گا۔ اور مناسب ہے کہ نصیحت عام عنوان سے کی جائے کسی خاص شخص کو مخاطب نہ کیا جائے کیونکہ جس کے اندر استعداد نصیحت قبول کرنے کی ہوگی وہ اس اتنے سے بھی کر لے گا اور مقصود حاصل ہو جائے گا۔

(ادب) اس بات کی کوشش کرو کہ اہل زمانہ سے تمہاری کوئی غرض ہی نہ اٹکے کہ عزت اسی میں ہے۔ باقی یہ بات بدون قناعت کے حاصل نہیں ہوتی۔ اور اگر ابناء زمانہ تمہاری غیبت کریں یا کچھ ایذاء پہونچاویں تو صبر کرو اور اپنے معاملہ کو خدا تعالیٰ کے حوالہ کردو کہ صبر میں بڑی تاثیر ہے۔ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِیْلًا۔ (یعنی جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں اس پر صبر کئے جایئے اور ان سے خوبی سے علیحدگی اختیار کیجئے)۔

اور برائی کا بدلہ لینے کی فکر میں نہ پڑو کہ اس میں وقت کی بربادی اور شر کا ازدیاد ہے۔

(ادب) اپنی زبان سے اپنی تعریف نہ کرو کیونکہ اگر وہ بات قابل تعریف ہوئی تو خود ہی ظاہر ہو جائیگی اور اگر بالفرض ظاہر نہ بھی ہو تب بھی کچھ غم نہیں کہ اچھی بات اچھی ہی ہے۔ ظاہر ہو یا نہ ہو۔

(ادب) اور جبکہ لوگ تم کو دوست نہ رکھیں تو سمجھ لو تمہارے ہی اندر کچھ نقصان ہے اس لئے کہ قلوب میں حُب و بغض کا پیدا کرنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔

(فائدہ) یعنی اگر تم اللہ تعالیٰ کے نزدیک اچھے ہوتے تو وہ لوگوں کے قلوب کو خود ہی تمہاری جانب مائل کر دیتا اور مراد یہاں لوگوں سے نیک لوگ ہیں۔ باقی بروں کا اس میں اعتبار نہیں کیونکہ وہ تو اچھوں کو برا ہی جانتے ہیں اور بروں کو اچھا۔ یہ مضمون احادیث سے مفہوم ہوتا ہے۔

یوں اکثر لوگوں کی صحبت سے دور ہی بھاگو کیونکہ ایسے لوگ، جو مصاحبت کے اہل ہوں، بہت کم ہیں۔ امیر المومنین شاہ مرداں (حضرت علی رضی اللہ عنہ) کا ارشاد ہے کہ اِخْوَانُ الزَّمَانِ جَوَاسِیْسُ الْعُیُوْبِ یعنی زمانے والے عیوب کے جاسوس ہوتے ہیں۔

(ادب) اور جس کا تو امتحان نہ کرے، اس پر اعتماد نہ کر۔ اور وقتی ملاقات اور تھوڑی ہمنشینی پر

حاشیہ قولہ : اور جس کا تو امتحان نہ کرے احیاء العلوم میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک شخص نے آکر گواہی دی۔ آپ نے توثیق کے لئے اس سے فرمایا کہ بھائی جاؤ اپنے کسی جاننے پہچاننے والے کو لے آؤ۔ وہ گیا اور ایک شخص کو لیکر آیا اور اس نے اس شاہد کی تعدیل کی کہ میں اس کو جانتا ہوں اچھا آدمی ہے۔ حضرت عمرؓ نے اس توثیق کرنے والے سے پوچھا کہ کیا تم اس کے مکان کے پاس رہتے ہو جس سے یہ اندازہ کیا جائے کہ تم اس کے آمد و رفت حرکات

بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر

مغرور نہ ہو جب تک کہ معاملہ مکرر نہ پڑے کیونکہ کسی کے اخلاق پر اطمینان نہیں ہے اور حق امتحان کا یہ ہے کہ جمیع حالات میں بھی غربت اور فقیری میں بھی اور مالداری میں بھی غصہ کے وقت میں بھی اور خوشی کے وقت بھی۔ موجودگی اور حضوری میں بھی غائب ہونے کے وقت میں بھی۔ عیش کی حالت میں بھی اور تنگی و پریشانی کے وقت میں بھی جب سب حالتوں میں تو اس کو یکساں پاوے تب سمجھ کہ وہ قابل مصاحبت ہے۔ اب اگر ایسا شخص تجھ کو مل جاوے تو اگر تجھ سے بڑا ہے تو اس کو باپ کی طرح سمجھ اور اگر چھوٹا ہے تو اولاد کی مانند اس کو جان اور اگر برابر کا ہے تو اس کو بھائی کی طرح مان۔ ورنہ اس سے کنارہ کشی اختیار کر یعنی نہ کسی کا بھائی بن نہ باپ نہ بیٹا۔

فصل دوم

ہمسایہ' والدین' اولاد اور لونڈی و غلام کے حقوق کا بیان

جاننا چاہئے کہ ہمسایہ (یعنی پڑوسی) کا بھی بہت حق ہے اگرچہ وہ کافر اور مشرک ہی کیوں نہ ہو۔ اپنے پڑوسی کے حقوق کی رعایت کے متعلق احادیث کثیرہ وارد ہیں۔ چنانچہ آتا ہے کہ اَحْسِنْ مُجَاوَرَةَ مَنْ جَاوَرَكَ تَكُنْ مُسْلِمًا یعنی اگر تم مسلمان کہلانا چاہتے ہو تو اپنے پڑوسی کے ساتھ بھلائی کرو۔ دیکھو اپنے ہمسایہ کے ساتھ حسن سلوک کرنے کو اسلام کا سبب قرار دیا تاکہ تم سمجھو کہ انسان کے اسلام کا کتنا تعلق حقوق ہمسایہ کی ادائیگی کے ساتھ ہے۔ (ایسا کہ گویا اس کے بغیر

بقیہ حاشیہ گزشتہ

و سکنات سے واقف ہو گے۔ اس نے کہا نہیں' یہ میرا پڑوسی تو نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اچھا تو پھر کسی سفر میں شاید تمہارا اور اس کا ساتھ ہو گیا ہو گا اور سفر بھی انسان کے اخلاق کی قلعی خوب کھولتا ہے اس لئے تم نے اس کا حال جانا ہو گا کہا نہیں حضرت اس کا بھی کبھی اتفاق نہیں پڑا۔ آپ نے فرمایا کہ اچھا تو شاید تمہارا اس کے ساتھ کبھی کوئی معاملہ پڑا ہو گا روپیہ پیسہ کا' ہاں بیشک اس سے بھی انسان کا تقویٰ آشکار ہو جاتا ہے۔ اس نے کہا نہیں حضرت اس کی بھی نوبت ہمارے اور اس کے درمیان کبھی نہیں آئی ـــــ یہ سن کر آپ نے فرمایا۔ اجی ہٹو پھر میرا خیال یہ ہے کہ تم نے اس کو کسی دن مسجد میں نماز پڑھتے اور اس میں قرآن کو گنگناتے ہوئے سنا ہو گا اور یہ دیکھا ہو گا کہ وہ نماز میں کبھی اپنے سر کو جھکاتا ہے اور کبھی اوپر کو اٹھاتا ہے (بس اس اسے تم نے سمجھا ہو گا کہ بڑا اچھا آدمی ہے) اس نے کہا کہ جی ہاں بالکل صحیح ہے' یہی بات ہے۔ آپ نے فرمایا اچھا تو تم جاؤ تم اس کے پہچاننے والے نہیں ہو۔ اور اس شاہد سے فرمایا جاؤ کسی دوسرے شخص کو لے آؤ جو تم کو پہچانتا ہو۔ (احیاء العلوم صفحہ ۱۰۷ ج ۲)

وہ مسلمان ہی نہیں ہے) حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضرت جبریلؑ جب جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے تو ہمسایہ کے حق کی وصیت کرتے۔ نیز آیا ہے کہ اپنے پڑوسی کے کتے کو ڈھیلا مارنا بھی اس کو ایذاء دینا ہے۔

صحابہؓ نے ایک مرتبہ عرض کیا کہ رسول اللہ فلاں شخص ہمیشہ روزہ رکھتا ہے اور راتوں کو جاگتا ہے مگر ہمسایہ کو ایذاء بھی دیتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ دوزخی ہے۔ منقول ہے کہ ایک بزرگ نے لوگوں سے اپنے یہاں چوہوں کے کثرت کی شکایت کی لوگوں نے کہا حضرت ایک بلی پال لیجئے چوہے ختم ہو جائیں گے۔ فرمایا کہ مجھے ڈر لگتا ہے کہ بلی کی آواز سنکر کہیں چوہے میرے پڑوسی کے گھر نہ چلے جائیں۔ پس جو چیز کہ میں اپنے لئے پسند نہیں کرتا وہ دوسروں کے لئے کیونکر پسند کروں۔ اور پڑوسی کا حق صرف یہی نہیں ہے کہ اس کو ایذاء پہنچائے بلکہ اس کے علاوہ چاہے کہ اس کے ساتھ رحمت اور شفقت کا بھی معاملہ کرے اور اس کی ایذاء پر تحمل کرے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ کل کو قیامت میں فقیر پڑوسی اپنے امیر ہمسایہ کے ساتھ جھگڑا کرے گا کہ اس نے دنیا میں اس کے ساتھ بھی کچھ سلوک کیوں نہ کیا تھا۔

منجملہ حقوق ہمسایہ کے ایک حق یہ ہے کہ اس سے سلام میں ابتداء کرے اور اس سے لڑائی نہ کرے اور تھوڑی سی چیز پر اس سے جھگڑا نہ کرے۔ اور اس کے حال کا بہت زیادہ اس سے کھود کرید نہ کرے، خاص کر اس وقت جبکہ اس کی مدد بھی کرنا نہ ہو (کیونکہ اول تو اس کو اپنا حال ظاہر کرتے شرم آوے گی اور جب دینا دلانا بھی کچھ نہیں تو خوامخواہ اس کو رنجیدہ کرنا ہوگا)

اور جب وہ بیمار ہو تو اس کی عیادت کو جائے۔ اور اس پر کوئی مصیبت پڑے تو اس کو تسلی دے۔ اس کے غم اور خوشی میں شریک ہو۔ اس کے قصور اور خطا کو معاف کردیا کرے۔ اور اپنے بالا خانے پر سے اس کے گھر کے اندر نہ دیکھے (اسی طرح سے کسی دراز یا سوارخ میں سے اس کے گھر کے اندر نہ جھانکے) اور اگر وہ اس کی دیوار پر اپنی کڑی رکھے تو اس کو منع نہ کرے اور اس کے پرنالہ سے پانی آوے تو اس سے لڑے نہیں اس کے آنے جانے کے راستہ کو (تعمیر یا سامان کے ذریعہ) تنگ نہ کرے۔ اور اگر کوئی چیز اس کے گھر آرہی ہے تو اس کو دیکھنے اور معلوم کرنے کی فکر نہ کرے۔ ممکن ہے وہ اس کو پسند نہ کرتا ہو۔ اس کے عیب کو چھپاوے اور اس کے اہل خانہ پر نظر نہ ڈالے اور اس کی باندی کو بری (یعنی شہوت کی) نگاہ سے نہ دیکھے اور اگر وہ کہیں چلا جاوے تو اس کے گھر کی حفاظت و نگرانی کرے اس سے غافل نہ رہے۔ اور اس کی اولاد پر شفقت اور مہربانی رکھے اور دین و دنیا میں کام آنے والی باتیں ان کو سکھائے۔ ہمسایہ اگر محتاج ہو تو قرض دیدیا کرے اور اپنا مکان اتنا اونچا نہ کرے کہ اس کے گھر کی ہوا ہی رک جائے۔ ہاں اگر اس کی اجازت ہو تو پھر مضائقہ نہیں۔ اگر کبھی میوہ پھل وغیرہ کھانے کا اتفاق ہو تو اس میں سے کچھ اس کے گھر بھی بھیج دے اور

کسی وجہ سے اس کو دینا منظور نہیں تو اس سے چھپا کر کھائے اور اپنے لڑکوں کو پھل وغیرہ لیکر باہر نہ نکلنے دے تاکہ ہمسایہ کا بچہ نہ دیکھ لے کہ اپنے والدین سے ضد کرے کہ مجھے بھی فلاح چیز دو (ورنہ کم از کم للچائے ہی گا یہ بھی برا ہے) حاصل یہ کہ اسلام کے تمام حقوق جو ہمسایہ کے ساتھ ہیں بجا لاوے۔

حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس تھا' ان کے غلام نے ایک بکری ذبح کی حضرت عبداللہ نے فرمایا کہ اے غلام سب سے پہلے اس کے گوشت میں سے کچھ ہمارے پڑوسی یہودی کے یہاں بھیج دینا اور اس کو مکرر فرمایا۔

منقول ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یارسول اللہ میرے دو پڑوسی ہیں ایک کا دروازہ تو بالکل میرے دروازہ کے سامنے ہے اور دوسرا اس سے ذراہٹ کر ہے تو کبھی میرے پاس اتنی تھوڑی سی چیز ہوتی ہے کہ دونوں کو بیک وقت نہیں دی جاسکتی' پس ان دونوں میں سے کونسا پڑوسی حق کے اعتبار سے مقدم ہے۔ آپ نے فرمایا وہ جس کا دروازہ تمہارے دروازہ کے سامنے پڑتا ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یارسول اللہ کیسے معلوم ہو کہ میں نیک ہوں یا بد ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تمہارا پڑوسی تم کو نیک کہے تو تم نیک ہو اور بد کہے تو تم بد ہو۔ نیز حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو جسے بھلائی پہنچانا منظور ہوتا ہے تو اس کو شہید کرتا ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ شہید کیونکر ہوتا ہے فرمایا کہ اسطرح کہ اس کے ہمسائے اس کو دوست رکھتے ہیں۔

(والدین اور اولاد کے حقوق) جانو کہ صلہ رحمی یعنی رشتہ داروں کا لحاظ کرنا دین کے واجبات میں سے ایک واجب ہے یعنی اگر اقرباء محتاج ہوں اور ان کو وسعت ہو تو واجب ہے کہ ان کی خبر گیری رکھے یعنی ان کے نان ونفقہ کا خیال رکھے۔ اور رحم اس قرابت اور رشتہ کو کہتے ہیں جو خون اور پیٹ کے واسطہ سے ہو اگرچہ دور کا ہو اور اگر کسی سے نسبی رشتہ ایسا ہو کہ اس کی وجہ سے باہم نکاح حرام ہو تو اس رشتہ دار کو ذی رحم محرم کہتے ہیں۔ پس ہو سکتا ہے کہ ایک شخص ذی رحم بھی ہو اور محرم بھی ہو' جیسے باپ' ماں' بھائی' بہن اور اسی طرح کے اور رشتہ دار۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک شخص محرم تو ہو مگر ذی رحم نہ ہو یعنی نکاح تو اس سے حرام ہو مگر پیٹ اور نسبت کا اس سے کوئی رشتہ نہیں۔ جیسے دودھ شریکی بہن بھائی۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص کسی کا ذی رحم ہو اور محرم نہ ہو جیسے چچازاد بھائی اور خالہ زاد بھائی (کہ اول دادا میں اور دوسرا نانی میں شریک ہے اس لئے دونوں ذی رحم تو ہیں مگر ان سے چونکہ نکاح جائز ہے اس لئے محرم نہیں ہوں گے)

اقرباء اور رحم کے حقوق کے بارے میں احادیث بہت وارد ہیں چنانچہ حدیث قدسی میں آیا

ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ رحم میرے نام رحمٰن سے مشتق ہے پس جو شخص اس کو ملادے گا (یعنی رشتے ناتے داروں کے ساتھ حسن سلوک کرے گا) تو میں اس کو ملاؤں گا یعنی اس پر رحمت کروں گا۔ اور جو شخص اس رحم کو قطع کرے گا یعنی ناتے کو توڑے گا میں اس سے اپنی رحمت کو قطع کرلوں گا یعنی اپنی رحمت سے اس کو محروم کردوں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص چاہتا ہو کہ میری عمر دراز ہو اور رزق میں وسعت ہو تو اس کو چاہیئے کہ خدا سے ڈرے اور ناتے داروں کے ساتھ سلوک کرے۔ حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ مجھ کو میرے خلیل محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے قرابت داروں کے ساتھ سلوک کرنے کی وصیت فرمائی ہے اگرچہ میں فقیر ہو جاؤں۔ اور یہ وصیت فرمائی ہے کہ حق بات کہوں اگرچہ تلخ ہو اور حدیث شریف میں یہ بھی آتا ہے کہ مسکینوں اور فقیروں کو صدقہ دینا ایک صدقہ ہے اور اپنے کسی غریب ذی رحم کو دینا دو صدقہ کے برابر ہے۔ یعنی دوگنا ثواب ہوتا ہے (ایک تو صدقہ کا دوسرا صلہ رحمی کا) اور یہ بھی فرمایا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ بہترین صدقہ ان اقرباء پر خیرات کرنا ہے جو کہ اس سے دشمنی رکھتے ہوں اور اس کا یہ فعل اس کے حسن خلق میں شمار ہوگا اور یہ صدیقین کے درجہ کا کام ہے۔

(والدین کے حقوق) چونکہ ماں اور باپ اور اولاد دوسرے سب رشتہ داروں سے قریب تر ہوتے ہیں اس لئے قرابت اور رحم کے حقوق بھی ان کے بارے میں سب زیادہ ہیں چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اپنے والدین کے ساتھ نیکی کرنا نماز و روزہ اور حج اور عمرہ اور جہاد سے بھی بڑھ کر ہے۔ نیز حدیث شریف میں ہے کہ ہے کہ جنت کی خوشبو پانچ سو سال کی مسافت سے آتی ہے مگر اس سے وہ شخص محروم رہے گا جو اپنے والدین کا نافرمان اور قاطع رحم ہو۔

ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کے درمیان تشریف فرما تھے ایک شخص آیا اور عرض کیا یا رسول اللہ کیا ماں باپ کا کچھ حق ان کے مرنے کے بعد بھی باقی رہتا ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں ان کے لئے دعا کرنا اور مغفرت طلب کرنا اور ان کے کیے ہوئے عہدوں کو بجالانا اور ان کے ملنے جلنے والوں کے ساتھ ادب و احترام کا معاملہ کرنا۔ حدیث شریف میں ہے کہ سب نیکوں سے بڑھ کر نیک وہ شخص ہے کہ اپنے باپ کے دوستوں کے ساتھ اچھا برتاؤ رکھے۔

نیز حدیث میں آتا ہے کہ جب حضرت جبرئیلؑ کے ہمراہ ملائکہ زمین پر آتے ہیں تو اول مکہ مکرمہ میں اترتے ہیں اس کے بعد وہاں سے ہر جگہ کے لئے منتشر ہو جاتے ہیں پھر جب آسمان پر واپس جانا ہوتا ہے تو پھر مکہ میں جمع ہوتے ہیں اور جبرئیلؑ ان سے پوچھتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے اس شب امت محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا؟ ملائکہ کہتے ہیں کہ سب کو بخشا سوا تین جماعتوں کے' ایک تو ماں باپ کو ایذاء دینے والوں کو دوسرے شراب پینے والوں کو۔ تیسرے ان لوگوں کو جو مسلمانوں سے کینہ رکھتے ہیں۔ یعنی یہ لوگ بخشش سے محروم رہتے ہیں۔

اللّٰھم احفظنا منہ

جانو کہ سلوک اور خبر گیری کے باب میں ماں کے حقوق باپ سے زیادہ ہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ یہ اس وجہ سے ہے کہ والدہ اولاد پر بہ نسبت باپ کے زیادہ شفیق و مہربان ہوتی ہے اور مشفق کی دعاء رد نہیں ہوتی۔ پس ماں کی شفقت چونکہ زیادہ ہوئی اس لئے اس کا حق بھی زیادہ ہے۔ ایک دن حضرت اسماؓ حضرت ابوبکرؓ صدیق کی صاحبزادی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ میری والدہ آئی ہیں لیکن وہ مشرک ہیں، آیا میں ان کے ساتھ حق صلہ رحم بجالاؤں؟ آپ نے فرمایا ہاں ہاں ضرور۔

اور جس طرح سے کہ والدین کے حقوق کی رعایت کے متعلق احادیث وارد ہیں اسی طرح سے اولاد کے حقوق کے بارے میں بھی روایات آئی ہیں۔ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ کونسی نیکی بہتر ہے آپ نے فرمایا کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا۔ اس نے کہا کہ میرے ماں باپ زندہ نہیں رہے۔ آپ نے فرمایا کہ پھر اپنی اولاد کے ساتھ، اس لئے کہ جس طرح تیرے ماں باپ کا حق تجھ پر ہے اس طرح تیری اولاد کا بھی تجھ پر حق ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے نوازے اس باپ کو جو اپنے بیٹے کا اس کی نیکی پر معین ہو۔ مطلب یہ کہ اس کے سبب لڑکے میں نیکی کی عادت پڑی ہو اور اگر وہ بد ہو تو اس کی نا فرمانی کا سبب اس کا باپ نہ بنا ہو حدیث شریف میں ہے کہ جب بیٹا چھ برس کا ہو جائے تو اس کو ادب دے اور جب نو برس کا ہو جائے تو اس کو علیحدہ بستر پر سلائے اور جب تیرہ برس کا ہو جائے تو نماز نہ پڑھنے پر اس کو مارے اور سزا دے۔ اور جب سولہ سال کا ہو جائے تو اس کا نکاح کردے۔ اس کے بعد اس کو خدا کے سپرد کردے کیونکہ اس کے ذمہ جتنا حق تھا اولاد کا اس نے اس کو پورا کردیا اب آگے جو اس کے مقدر اور نصیب میں ہوگا وہی راہ اختیار کرے گا جس کا ذمہ دار وہ خود ہوگا۔ ایک اور روایت میں آیا ہے کہ اولاد جب سات برس کی ہو جائے تو اس کو نماز کا حکم کرو اور جب دس برس کی ہو جائے تو اس کو ترک نماز پر مارو۔ ایک دن اقرع بن حابسؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ نے حضرت حسنؓ کا بوسہ لیا انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے دس بیٹے ہیں لیکن میں نے آج تک کسی کا بوسہ نہیں لیا آپ نے فرمایا کہ مَنْ لَا یَرْحَمْ لَا یُرْحَمْ جو شخص رحم نہیں کرے گا وہ رحم نہیں کیا جاوے گا یعنی اللہ تعالیٰ اس پر رحم نہ فرمائیں گے جو خلق اللہ پر رحم نہیں کرے گا۔ اور حدیث شریف میں یہ بھی آتا ہے کہ رِیْحُ الْوَلَدِ مِنْ رِیْحِ الْجَنَّةِ یعنی اولاد کی بو جنت کی خوشبو ہے۔ (اس کا مطلب واللہ تعالیٰ اعلم شائد یہ ہو کہ چھوٹے بچے بالعموم گندے اور میلے کچیلے ہی رہتے ہیں پیشاب، پاخانہ، قے، رال، ناک اور تھوک میں اکثر ملوث رہتے ہیں۔ انسان ان کی اس حالت کو گوارا کرے اور ان کی بو وغیرہ برداشت کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے عوض

اس کو جنت کی خوشبو مرحمت فرمائیں گے۔ اس میں تحریض ہے ان کی جانب توجہ اور رغبت کرنے کی ورنہ تو اگر ان کو گندہ دیکھ کر بڑے لوگ بھی نفرت کرنے لگیں تو پھر تو ان کی صفائی اور ظاہری اصلاح کی کوئی صورت ہی نہ ہوگی اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ خود چھوٹے بچوں کے اندر ایک قسم کی خوشبو بھی ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ آدمی منہ سے ان کو چوم کرناک سے بھی سونگھتا ہے اور اس کو اس میں خاص لطف آتا ہے بالخصوص والدین کو' تو اس خوشبو کو فرمایا کہ یہ جنت کی خوشبو کا ایک ادنیٰ نمونہ ہے) ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ممبر پر تشریف فرما تھے اتنے میں سامنے سے حضرت حسنؓ روتے ہوئے آگئے' آپ ممبر پر سے اتر آئے اور ان کو گود میں اٹھالیا اور یہ آیت پڑھی اِنَّمَا اَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ (یعنی بلاشبہ تمہارا مال اور تمہاری اولاد تمہارے حق میں فتنہ ہی ہیں) اس طرح سے حدیث میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو نماز پڑھا رہے تھے آپ سجدے میں تھے کہ حضرت حسنؓ آئے اور آپ کی گردن مبارک پر سوار ہوگئے آپ نے سجدے کو طویل کر دیا یہاں تک کہ لوگوں کو سجدے کے طویل ہونے سے خیال ہوا کہ کوئی خاص بات پیش آگئی ہے۔ چنانچہ جب نماز ختم ہوگئی تو صحابہؓ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ آپ نے آج نماز کا سجدہ خلاف معمول بہت زیادہ طویل فرمایا کیا وجہ پیش آگئی تھی؟ آپ نے فرمایا کہ میرے بیٹے (یعنی حضرت حسنؓ) نے مجھے اپنی سواری بنالی تھی اس لئے میں نے پسند نہ کیا کہ ان کا مقصد پورا ہونے سے پہلے سجدے سے سر اٹھاؤں۔ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم۔

الحاصل جملہ وہ حقوق جو دوستی اور بھائی چارہ کے حقوق میں مذکور ہوئے وہ سب والدین کے لئے بدرجہ اولیٰ ہیں کیونکہ یہ تعلق بھائی چارگی کے تعلق سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اور یہاں دو چیزیں ان سے زیادہ ہیں یعنی یہاں ان کا لحاظ ضروری ہے اور اخوت میں لازم نہیں۔ ایک تو یہ کہ اکثر علماء اس طرف گئے ہیں کہ والدین کی فرمانبرداری شبہات میں بھی واجب ہے اگرچہ حرام محض میں واجب نہیں چنانچہ اگر کوئی کھانے پینے کی چیز ہے اور ہے وہ مشتبہ (یعنی صریح حرام نہیں) اور اس کو نہ استعمال کرنے سے تمہارے والدین کو ایذاء ہوتی ہے تو اطاعت واجب ہے یعنی باوجود مشتبہ ہونے کے اس کو کھالو کیونکہ مشتبہات کا ترک زیادہ سے زیادہ ورع اور تقویٰ کی بات ہے۔ اور والدین کی رضا اور خوشی منجملہ واجبات کے ہے۔ جس ورع پر ان کی رضا مقدم ہوئی۔

دوسرے یہ کہ نفل حج کے لئے بدون والدین کی اجازت کے سفر کرنا جائز نہیں۔ اور دوسرے علماء نے فرمایا ہے کہ حج فرض کے لئے بھی بدون اجازت والدین اول ہی سال جانا لازم نہیں ہے' یعنی اگر وہ منع کر دیں کہ اس سال نہ جاؤ آئندہ چلے جانا تو اس تاخیر میں ان کی اطاعت واجب ہے۔ اسی طرح تحصیل علم دین جو کہ نفل کے طور پر ہو اس کے لئے باہر جانا بدون اذن والدین کے جائز نہیں ہاں فرض علم اس سے مستثنیٰ ہے مثلاً نماز روزہ کا علم ہے کہ اگر بستی میں کوئی اور عالم نہیں

ہے تو اس کے سیکھنے کے لئے بدون اذن چلا جانا جائز ہے۔ روایت میں آتا ہے کہ ایک شخص یمن سے ہجرت کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور شرکت جہاد کا خیال ظاہر کیا آپ نے ان سے دریافت فرمایا کہ تمہارے ماں باپ زندہ ہیں؟ انہوں نے کہا جی ہاں۔ آپ نے فرمایا کہ انہوں نے اس کی اجازت تم کو دیدی ہے؟ عرض کیا نہیں۔ آپ نے فرمایا پھر واپس جاؤ اور ان سے اجازت لو اگر وہ اجازت دیں تو جہاد کے لئے آؤ ورنہ جہاں تک تم سے ہو سکے ان کے ساتھ نیکی اور سلوک کرو یہ چیز توحید خداوندی کے بعد ان تمام چیزوں سے بہتر ہے جن کا ہم کو حکم دیا گیا ہے۔ (مطلب یہ کہ توحید اور ضروریات دین کے بعد اور دوسرے امور خیر سے بہتر ہے۔ باقی نماز اور دیگر فرائض یہ سب توحید ہی میں داخل ہیں جیسا کہ احادیث سے سمجھا جاتا ہے۔ پس اسکا ان سب سے بھی بڑھ کر ہونا لازم نہیں آتا)

اسی طرح سے ایک اور شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تاکہ آپ سے جہاد میں جانے کے بارے میں مشورہ لے آپ نے اس سے بھی یہی فرمایا کہ تیری ماں زندہ ہے اس نے کہا ہاں۔ آپ نے فرمایا جاؤ ان ہی کے پاس رہو ان کے پاؤں کے نیچے جنت ہے (مطلب یہ کہ جس طرح سے حصول جنت کا سبب جہاد ہے اسی طرح سے ماں کی خدمت بھی ہے اس وقت تمہارے لئے یہی متعین ہے) حدیث شریف میں ہے کہ بڑے بھائی کا حق مانند باپ کے ہے۔

فائدہ کتاب شرعۃ الاسلام میں لکھا ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ ملائکہ رحمت کے نہیں اترتے اس قوم پر جن میں رشتہ کا قطع کرنے والا ہو۔ اور علماء نے لکھا ہے کہ سلوک کرنیوالا رشتہ داروں کے ساتھ وہ شخص کہلائیگا کہ لوگ تو اس سے رشتہ قطع کرتے جاویں اور وہ ان کے ساتھ سلوک ہی کے ساتھ پیش آتا رہے۔ غرض صلہ رحم یعنی ناتہ داروں کے ساتھ سلوک کرنا واجب ہے اگرچہ صرف سلام و دعاء اور ہدیہ دینے کے ساتھ ہو اسی لئے بعض بزرگوں نے قرابت داروں کا پڑوسی بننے کو مکروہ جانا ہے کہ اس کی وجہ سے حرمت اور ہیبت باقی نہیں رہ جاتی جس کے باعث باہم فرقت اور انقطاع کا اندیشہ ہو جاتا ہے)

(ادب) اہل قرابت سے کبھی کبھی ملاقات کرتا رہے اس سے الفت و محبت میں زیادتی ہوتی ہے بلکہ مناسب ہے کہ ان سے ہر ہفتہ یا ہر ماہ ملتا رہے۔ اور چاہئے کہ تمام قبیلہ کے لوگ اور یک جدّی لوگ باہم ایک دوسرے کے معین و مددگار رہیں بلکہ یک تن ہو کر رہیں دوسروں کے مقابلہ میں۔ اگر بعض ان میں سے اپنی حاجت دوسرے پر ظاہر کرے تو اس کو رد نہ کرے کہ یہ بھی قطع رحم میں داخل ہے۔ اور چاہئے کہ عزت کرنے خدمت کرنے اور اطاعت کرنے میں اپنے بڑے بھائی کو ماموں کو اور چچا کو بمنزلہ باپ کے جانے اور خالہ اور پھوپی کو بمنزلہ ماں کے جانے۔

یاد رکھو کہ نیکی کرنا اپنے ماں باپ کے ساتھ ان تمام چیزوں سے بڑھ کر ہے جو اللہ تعالیٰ کا

مقرب بناتی ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ احسان کرنے کو اپنی عبادت کے ساتھ ذکر فرمایا ہے اور یہ اسی لئے کہ اس کی شان بڑی ہے۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں کہ وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِیَّاہُ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا (آپ کے رب نے حکم فرمایا ہے کہ سوااس کے کسی کی عبادت نہ کرو اور حکم فرمایا ہے کہ والدین کے ساتھ احسان اور سلوک کیا کرو) اور حدیث شریف میں آتا ہے کہ اپنے والد کے ساتھ نیکی کرو (اس کا دنیوی نفع یہ ہوگا کہ) تمہارے لڑکے تمہارے ساتھ نیکی سے پیش آئیں گے۔ اور ماں کا حق تو باپ کے حق سے کہیں زیادہ ہے اس لئے ماں کے ساتھ نیکی کرنے کا وجوب اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اَلْجَنَّۃُ تَحْتَ اَقْدَامِ الْاُمَّھَاتِ یعنی جنت ماؤں کے قدموں کے تلے ہے۔ لہٰذا والدین کے حقوق میں یہ ہے کہ ان کے ساتھ تملق اور چاپلوسی سے پیش آئے اور جب تک وہ رہیں ان کی اتنی خدمت کرے کہ وہ خوش ہو جائیں۔ اور ان کو رنج نہ پہنچائے اگرچہ تھوڑا سا ہی ہو۔ اور ان کی آواز پر اپنی آواز کو بلند نہ کرے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَلَا تَقُلْ لَّھُمَا اُفٍّ ان سے اف تک مت کہو اور ان سے بگاڑ کر کلام کیا کرو یعنی جھڑک کر اور سختی کے ساتھ ڈانٹ کر گفتگو نہ کرو اور مباح امور میں ان کی اطاعت کرو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا ان کی رضا میں ہے اور اللہ تعالیٰ کی خفگی ان کی ناراضگی میں ہے۔

(ادب) اپنے کو غیر ماں باپ کی جانب ان کو حقیر اور کم مرتبہ سمجھتے ہوئے منسوب نہ کرو۔ یعنی جس طرح سے بہت سے لوگ اپنے آپ کو سید یا کسی بزرگ کی جانب منسوب کرتے ہیں۔ تھے کسی کی اولاد میں اور مشہور کر دیا اپنے کو دوسرے کی اولاد میں، یہ چیز باعث لعنت ہے۔ (یعنی بڑی ہی بے غیرتی اور بے حیائی کی بات ہے کہ اپنے کو غیر باپ کی جانب منسوب کرے)

(ادب) اپنے والدین پر اپنے مال میں سے خوب جی کھول کر خرچ کرو کیونکہ ماں باپ پر خرچ کئے ہوئے کا حساب نہیں ہوگا خواہ کتنا ہی خرچ کر دے۔ اس ادب واحترام کی وجہ سے بعض بزرگوں نے ماں باپ کے ساتھ کبھی کھانا نہیں کھایا کہ مبادا کوئی بے ادبی ہو جائے۔

(ادب) اور اولاد کو چاہئے کہ والدین کی جانب پیار و محبت ادب اور شفقت کے ساتھ دیکھے تاکہ اس کو ہر نظر کے عوض حج مقبول کا ثواب ملے۔ کیونکہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو شخص اپنے ماں باپ کی جانب شفقت اور محبت کی نظر سے دیکھتا ہے تو اس کو ہر نظر کے بدلے حج مبرور کا ثواب ملتا ہے۔

(ادب) ماں باپ کو جہاد، حج، طلب علم یا طلب مال کے لئے چھوڑے نہیں اس لئے کہ ان کی خدمت ان تمام چیزوں سے بڑھ کر ہے۔ چنانچہ روایت میں آتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے اپنی والدہ کی حیات میں ان سے جدائی کے خیال سے حج نہیں کیا جب ان کا انتقال ہو گیا تب کیا۔ نیز حضرت

ابو ہریرہؓ کا معمول تھا کہ علی الصباح والدہ کے دروازہ پر جاتے تھے اور کہتے تھے اے میری میری والدہ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ' اللہ تعالیٰ تم کو میری جانب سے نیک بدلہ اس کا عطا فرمائے کہ تم نے بچپنے میں مجھے پالا ہے چنانچہ وہ جواب میں کہتیں کہ بیٹا تجھ کو بھی اللہ تعالیٰ ایسی ہی جزا عطا فرماوے اس پر کہ تم نے بڑے ہو کر میرے ساتھ حسن سلوک کیا ہے۔ یہ کہہ کر ابو ہریرہؓ واپس چلے آتے اور پھر جاتے اور یہی کہتے۔

(ادب) منجملہ حقوق والدین کے ایک یہ ہے کہ ان کے حکم کو بڑا مانے اور ان کے ساتھ تواضع سے پیش آئے اور خود ان کی خدمت کرے' دوسرے سے نہ کہدے اور ان کی خدمت میں عار نہ کرے اگرچہ وہ مشرک ہوں۔ اور دنیا میں ان کے ساتھ اچھا سلوک کرے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا (اور والدین سے دنیوی امور میں نیک برتاؤ کرو)

اسی طرح سے والدین کے حقوق کی رعایت ان کے انتقال کے بعد بھی کرے یعنی اچھی طرح سے کفن دفن کا انتظام کرے۔ اور اگر وہ کافر ہوں تو ان کے لئے بددعا نہ کرے۔ اگر وہ زندہ ہوں تو ان کی ہدایت کے لئے دعا کرے اور اس کے بعد ان کا معاملہ خدا کے حوالہ کردے جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں آتا ہے۔

(ادب) راستہ چلنے میں ان کے آگے آگے نہ چلے اور نہ ان کے ساتھ ہوتے ہوئے صدر نشینی اختیار کرے اور ان کا نام لیکر نہ پکارے بلکہ اے میری ماں اور اے میرے والد وغیرہ الفاظ سے بلائے جیسا کہ قرآن شریف میں آتا ہے يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ (اے میرے والد آپ کر ڈالئے وہ کام جس کا آپ کو حکم دیا گیا ہے)

(ادب) کسی دوسرے کی ماں یا باپ کو بھی برا نہ کہے کہ اس کے بدلہ میں وہ اس کے ماں باپ کو برا کہے گا۔ ان پر کسی چیز پر سبقت نہ کرے اور ان کی جانب گھور کر اور انکو ترچھی نظر سے نہ دیکھے۔

(ادب) ان کے مرنے کے بعد کے حقوق میں سے یہ بھی ہے کہ اگر وہ مسلمان ہے تو ان پر نماز (جنازہ) پڑھے اور ان کے اللہ تعالیٰ سے استغفار کرے اور ان کے عہدوں اور وصیتوں کو پورا کرے اور ان کے دوستوں اور ملنے جلنے والوں کا احترام کرے اور ان کے رشتہ داروں کے ساتھ سلوک واحسان کرے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اپنے والدین کے ساتھ انکے مرے پیچھے ان کے قبر میں بھی سلوک کرے تو اس کو چاہئے کہ انکے بعد انکے بھائیوں کے ساتھ سلوک واحسان کرے۔

(ادب) جسکے والدین کا انتقال ہو جائے تو اس کو چاہئے کہ انکے لئے دعا مغفرت کرے اور انکے ایصال ثواب کے لئے کچھ خیر خیرات کرے تا کہ اپنے والدین کا بار یعنی نیکو کار لکھا جائے۔

حدیث شریف میں آیا ہے جو شخص اپنے والدین کی قبر کی ہر ہفتہ زیارت کرے وہ بار لکھا جائے گا۔

(ادب) ایک صورت والدین کو ایصال ثواب کی یہ ہے کہ جو مال تم صدقہ کرو اس میں والدین کی جانب سے بھی صدقہ کی نیت کرلو اس سے تمہارا اجر تو کم ہوگا نہیں انکو بھی اسی قدر ثواب مل جائیگا۔ چنانچہ بعض بزرگوں کا معمول تھا کہ راستہ میں سے ایک پتھر ہٹا کر دائیں جانب پھینکتے اور اپنے باپ کی طرف سے نیت کرتے اور اس طرح بائیں طرف پھینکتے تو اپنی ماں کی طرف سے نیت کرتے۔ کیونکہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ راستہ سے ایذاء کی چیزوں کو دور کرنا ایمان کے شعبوں میں سے ایک شعبہ ہے لہٰذا یہ فعل اپنے والدین کی طرف سے کرتے تھے کہ انکو اسکا ثواب پہونچے۔ اور بعضے بزرگ اپنے غصہ کو ضبط فرماتے تھے اور نیت یہ کرتے تھے کہ والدین کو اسکا اجر ملے اور ہم ان پر احسان کرنے والوں میں سے ہو جائیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ بندہ جو نیکی بھی اپنے والدین کو ثواب پہونچانے کی نیت سے کرتا ہے اسکی وجہ سے وہ ماں باپ کے ساتھ سلوک کرنے والا شمار ہوتا ہے اس لئے کہ انکو اس کے فعل کا اجر ملتا ہے۔ اور اس سے بڑھکر اور کونسی بھلائی ہو سکتی ہے۔ مناسب ہے کہ دن کے اول حصہ میں کھانا کھانے سے قبل دو رکعت نماز پڑھے اور اسکا ثواب اپنے والدین کو پہونچاوے (انشاء اللہ تعالیٰ اس احسان کی برکت سارے دن محسوس کرے گا)۔ اور اپنے کو والدین کے حق کی ادائیگی سے قاصر جانے اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کوئی شخص اپنے ماں باپ کا حق ادا نہیں کر سکتا اور نہ انکے احسان کا بدلہ اتار سکتا ہے مگر یہ کہ والدین اس کے کسی کی غلامی میں ہوں اور یہ اس سے انکو آزاد کرادے۔ شرعۃ الاسلام کا مضمون ختم ہوا۔ ہر شخص کو چاہئے کہ ان مضامین میں غور کرے اور اپنے والدین کی اطاعت کرے اور انکے حقوق ادا کرے اور انکی نافرمانی سے بچے کہ والدین کی ایذاء بہت بری چیز اور بد نصیبی کی بات ہے۔

کتاب درالمجالس میں چند حکایات ماں باپ کے ایذاء دینے کے وبال میں نقل ہیں عبرت کے لئے اس کو یہاں بیان کیا جاتا ہے:۔

حکایت اول۔ ایک نوجوان کو حج کا شوق ہوا اسکی ماں اس کو سفر کی اجازت نہ دیتی تھی چنانچہ وہ بدون اجازت ہی کے حج کو چلا گیا۔ راستہ میں چوروں نے اسے پکڑا اور سارا مال اور اسکا زادو راحلہ سب چھین لیا اور اس کے دونوں ہاتھ پاؤں کاٹ کر وہیں راستہ پر چھوڑ دیا۔ بیت اللہ کے مؤذن کو خواب میں اشارہ غیبی ہوا کہ اٹھو اور فلاں جنگل میں جاکر فلاں جوان کی خبر لو کہ مجھ کو اس پر رحم آتا ہے (یعنی اس نے گو ایک بڑی غلطی کی ہے مگر چونکہ میرے ہی دربار میں آرہا تھا اسلئے مجھے بھی اسکی خاطر منظور ہے) چنانچہ وہ مؤذن نیند سے بیدار ہوا اور بتائے ہوئے جنگل کی جانب روانہ ہو گیا وہاں پہونچا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک نوجوان پڑا ہوا اور اس کے ہاتھ و پیر کٹے ہوئے ہیں اس نے پوچھا کہ

اے شخص یہ تیرا کیا حال ہے؟ اس نے کہا میں نے والدین سے اجازت لئے بغیر راہِ کعبہ میں قدم رکھا اسلئے میرا حال یہ ہوا جو تیرے سامنے ہے تاکہ بندگان خدا کو عبرت ہو کہ والدین کا بڑا حق ہے انکی اجازت کے بغیر حج کے لئے بھی جانے میں ایسا معاملہ پیش آتا ہے چہ جائیکہ ان کو ناحق ایذاء دینا اور برا بھلا کہنا اسکا تو انجام کار بہت ہی برا ہے۔ یہ سن کر اس مؤذن نے کہا کہ خیر جو ہوا سو ہوا اب سے توبہ کرو۔ اس نے صدق دل سے توبہ کی اور مؤذن سے درخواست کی کہ مجھکو میرے ماں کے پاس پہونچادے تاکہ اس کو راضی کروں اور جس طرح سے ایک بار حماقت کر کے اپنے سفر حج کو کھوٹا کیا ہے اور ہاتھ پاؤں سے محروم ہو گیا ہوں ایسا نہ ہو کہ دم آخر ایمان سے ہی محروم ہو جاؤں اور سفر آخرت کو کھوٹا کرلوں مؤذن نے یہ سنکر اس کو اٹھایا اور اس کے وطن لیجا کر اس کے ماں کے دروازہ کے پاس اس کو بٹھادیا اور خود واپس ہو گیا۔ اسکی ماں اندر بیٹھی تھی جوان نے سنا کہ وہ یوں دعاء کر رہی تھی کہ الٰہی میں نہیں جانتی کہ اس سفر میں میرے بچے کے ساتھ کیا معاملہ پیش آیا کیونکہ وہ بغیر میری اجازت کے چلا گیا ہے۔ اب تو' اس کو مجھ تک پہونچادے کہ میرا دل اس کے لئے بیقرار ہے۔ جوان بھی ماں کے ان کلمات کو سنکر بلبلا گیا' اور اپنے کٹے ہاتھ سے دروازہ کھٹکھٹایا ماں اندر سے بولی ارے یہ کون ہے جو بیوہ اور غمزدہ کے دروازہ کو کھٹکھٹا رہا ہے' پھر خیال کیا کہ شاید کوئی میرے مسافر بچے کی خبر ہی لایا ہو یہ خیال کر کے اٹھکر باہر آئی دیکھا کہ ایک غریب فقیر سا آدمی بیٹھا ہوا ہے کہا کہ اے مسافر غریب آگے آ! اگر تجھ کو روٹی کی ضرورت ہو تو میں روٹی دوں۔ اس نے کہا میں روٹی کیسے لوں میرے تو ہاتھ ہی نہیں ہیں اس نے کہا اچھا ذرا آگے آ! کہا آؤں کس طرح میرے تو پاؤں بھی نہیں ہیں۔ اس غریب کی یہ بات سنکر بیوہ کو اس پر بہت ترس آیا کہا اے جوان غریب تیری آواز تو میرے بیٹے سے بہت ملتی جلتی ہے چنانچہ وہ دوڑ کر چراغ لائی اور آگے پیچھے سے اس کا منھ دیکھنے لگی۔ اس کو دیکھ کر اسکی آنکھ ٹھنڈی ہوئی' وہ کہتی جاتی تھی کہ تیرے ہی طرح میرا بھی ایک بچہ تھا بغیر میری اجازت کے وہ حج کے لئے چلا گیا ہے میں نہیں کہہ سکتی کہ سفر میں اسکا کیا حال ہوا۔ ماں کے منہ سے یہ کلمات سنکر وہ جوان صبر نہ کر سکا اور پھوٹ کر رونے لگا اور کہا اے ماں وہ بیٹا تیرا میں ہی ہوں' تیری حق تلفی میں نے کی اسکا یہ انجام ہوا۔ ماں نے جب یہ سنا تو ایک ہائے کی اور بیہوش ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب ہوش آیا تو آسمان کی جانب منھ کیا اور دعا کی کہ الٰہی! تو نے اس کو کیسے کی سزا دی اور ادب دیا لیکن پروردگار اس کو ہلاک نہ کیجیو اور ایمان کی سعادت سے اسے محروم نہ رکھیو۔

غرض اس واقعہ کے بیان سے یہ ہے کہ تم سمجھو کہ ماں باپ کی خوشی عجیب چیز ہے اور انکی نافرمانی بہت ہی وبال کی چیز ہے۔

حکایت دوم: ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے قبرستان جنۃ البقیع کی جانب

تشریف لے گئے ایک قبر سے نالہ و فریاد اور چیخ و پکار حضرت اقدسؐ کے سمع مبارک میں پہونچی کہ کوئی یہ کہہ رہا ہے کہ اَلنَّارُ فَوْقِیْ وَالنَّارُ مِنْ تَحْتِیْ وَ النَّارُ عَنْ یَمِیْنِیْ وَالنَّارُ عَنْ شِمَالِیْ (یعنی ہائے کیا کروں میرے اوپر سے آگ ہے' نیچے آگے ہے' داہنی جانب آگ ہے' بائیں جانب آگ ہے' ہر چار طرف آگ ہی آگ) یہ سنکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے فرمایا کہ جن جن لوگوں کے مردے اس قبرستان میں دفن ہوں وہ گھروں سے نکل کر اپنے اپنے عزیزوں کی قبر کے پاس آکر کھڑے ہو جائیں۔ سب کے بعد میں ایک بوڑھی عورت لاٹھی ہاتھ میں لئے ہوئے آئی اور ایک قبر کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی افضل البشر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا کہ اس قبر میں تیرا کون عزیز دفن ہے؟ اس نے کہا کہ میرا بیٹا ہے لیکن یا رسول اللہ میں اس سے بیزار ہوں۔ آپ نے فرمایا کیا تو اس سے خوش نہ ہو گی؟ اس نے عرض کیا یا رسول اللہ میں اس سے ہرگز خوش نہیں ہونی کی اس نے مجھ کو بہت ستایا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعاء کے لئے ہاتھ اٹھائے اور دعاء کی کہ الٰہی درمیان سے حجاب اٹھا لے تاکہ یہ بڑھیا بھی اپنے لڑکے کا عذاب دیکھ لے۔ اس وقت حجاب دور ہو گیا اور اسکی ماں نے اپنے لڑکے کی قبر کو دہکتی ہوئی آگ سے بھرا ہوا دیکھا اور یہ دیکھا کہ اسکا لڑکا اسی آگ میں جل رہا ہے۔ اپنے لڑکے کا یہ حال دیکھکر وہ گھبرا گئی اور دعاء کرنے لگی کہ یا اللہ اب میں اس سے خوش ہو گئی تو بھی خوش ہو جا اور میرے بچے سے عذاب کو اٹھا لے۔ چنانچہ جب ماں ہی خوش ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے اس عذاب کو بھی اٹھا لیا جو اسکی حق تلفی کیوجہ سے ہو رہا تھا۔ یہ معاملہ اس لئے ہوا تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ ماں کو ستانا بہت ہی برا ہے۔ اور ماں باپ کی دعاء (یا بد دعاء) اولاد کے حق میں قبول ہو جاتی ہے۔

(تنبیہ: مترجم رحمہ اللہ حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ مذکورہ بالا روایت کسی حدیث کی کتاب میں اس بیچمدان کی نظر سے نہیں گذری' باقی صاحب درالمجالس نے چونکہ اس کو نقل کیا ہے اس لئے حسن ظن یوں ہی ہے کہ کسی کتاب میں ضرور ہو گی میری نظر ہی کیا اور میرا مطالعہ ہی کیا۔ منہ ۱۲)
(راقم مترجم عرض کرتا ہے کہ مترجم رحمتہ اللہ علیہ کا یہ حسن ادب وجد آفریں ہے۔ سبحان اللہ یہ تھا ہمارے اسلاف کا تبصرہ اور انکی تنقید۔ کس قدر ادب اور تواضع میں ڈوبے ہوئے الفاظ ہیں۔ اور آج یہ حال ہے کہ کسی کی ایک نقطہ کی غلطی کو بھی اس انداز سے ظاہر کریں گے کہ مضمون کا پرخچہ اڑ جائے اور صاحب مضمون کا اعتبار ہی اٹھ جائے۔ ع۔ ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا)۔

حکایت سوم: بیان کیا جاتا ہے کہ مالک بن دینارؒ نے خواب دیکھا کہ کوئی کہنے والا کہہ رہا ہے کہ حرم شریف کے حجرہ میں ایک جوان ہے تم اس کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت میں اس کے لئے کوئی حصہ نہیں ہے۔ حضرت مالک بن دینارؒ خواب سے بیدار ہوئے اور حرم کی طرف چلے دیکھا کہ ایک جوان ایک نہایت ہی تنگ و تاریک حجرہ میں زار و قطار رو رہا ہے۔

جیسے ہی اسکی نظر مالک بن دینارؒ پر پڑی اس نے پوچھا کہ اے مالک بن دینارؒ آپ کیا پیغام لائے ہیں؟ مالک بن دینارؒ کو تعجب ہوا پوچھا کہ تجھکو کیسے معلوم ہوا کہ میں کوئی پیغام لایا ہوں۔ اس نے کہا کہ اے مالکؒ برسوں گذر گئے کہ مجھ سے برابر یہی کہا جا رہا ہے کہ خدا کی رحمت سے تیرے لئے کوئی حصہ نہیں ہے۔ مالک بن دینارؒ نے پوچھا کہ آخر کیا بات ہے؟ تجھ سے کون سا ایسا گناہ صادر ہوا ہے جس پر تجھ سے یہ کہا جا رہا ہے۔ جوان نے کہا کہ میں ایک دفعہ مست تھا اور اسی حالت میں اپنے باپ کو ایک گھونسہ مار دیا تھا جسکی وجہ سے اسکا ایک دانت ٹوٹ گیا تھا۔ اسکو پانچ برس کا عرصہ گذرتا ہے اسی وقت سے میں اپنے اس گناہ کے غم میں رو رہا ہوں کہ دیکھئے کل کو روز قیامت مجھے اس جرم کی کیا سزا بھگتنی پڑے۔ مالک بن دینارؒ نے کہا کہ اے جوان تیرا باپ کون ہے اور کہاں ہے؟ اس نے کہا کہ وہ فلاں قبیلہ کا ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ اس سال حج کے لئے آیا ہے مالکؒ اس پتہ و نشان پر تلاش کرتے ہوئے حرم میں گئے دیکھا کہ اسکا باپ کعبہ کی پشت پر کھڑا ہے۔ اپنا دانت ہتھیلی پر لئے ہوئے ہے' برہنہ سر ہے اور یوں فریاد کر رہا ہے کہ الٰہی! میرے دانت کو دیکھ۔ مالک بن دینارؒ کہتے ہیں کہ یہ منظر دیکھ کر مجھے رونا آگیا۔ میں نے اس سے کہا اے پیر مرد! اگر تیرے لڑکے نے تجھ کو طمانچہ مار دیا ہے اور تیرا دانت ٹوٹ گیا ہے اور اس کے سبب سے یہ فریاد کر رہا ہے تو ٹھیک ہے (اس نے بہت بیجا کام کیا) لیکن تجھکو بھی کچھ اپنے لڑکے کی حال کی خبر ہے؟ سن پانچ سال ہو گئے کہ وہ مارے ندامت کے گریہ وزاری کر رہا ہے۔ اور اس کا سارا حال بیان کیا۔ حال سنکر شفقت پدری کو جوش آیا اور اپنے لڑکے کے حال زار پر اسکو رحم آگیا۔ اس کے لئے دعاء کی۔ مالک بن دینارؒ خوش ہو گئے اور جوان کے پاس آکر اسکو باپ کے دعا کرنے کی خوشخبری سنائی۔ یہ سنکر وہ جوان اور زیادہ رونے لگا اور کہا کہ اے مالک تم سے میری ایک اور خواہش ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ کہو کیا ہے؟ کہا کہ آج اگر میرا باپ مجھ سے خوش نہ ہوتا تو کل کو میرے گلے میں آتشی طوق اور زنجیر ڈال کر دوزخ کی جانب کھینچ کر لے جاتے' لہٰذا تم آج یہ کرو کہ ایک رسی لاؤ اور اسکو میری گردن میں ڈالو اور مجھ کو اس میں باندھ کر کھینچتے ہوئے میرے والد کے سامنے پیش کرو اور کہو کہ گنہگار کو لائے ہیں۔ مالک بن دینارؒ کہتے ہیں کہ اسکی خواہش کے مطابق میں نے اس جوان کو اس طرح سے کھینچ کر اس کے باپ کے روبرو پیش کر دیا۔ باپ نے اپنے بیٹے کو اس حال میں دیکھا تو دوڑ کر آیا اور اپنے ہاتھ سے اس کے گلے کی رسی کھولی اور اسکو گلے سے لگالیا اور کہا کہ اے جان پدر میں تجھ سے خوش ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ بھی تجھ سعادت مند سے خوش ہو جائے۔

اس واقعہ کو بھی بہ نظر عبرت دیکھو۔ افسوس صد افسوس ہے ان لوگوں کے حال پر جنکے والدین ان سے راضی نہ ہوں اور خوش نصیب ہے وہ سعادتمند جو اپنے والدین کو اپنے سے خوش کیے ہوئے ہیں۔ یا اللہ تو اپنے فضل و کرم سے ہم کو بھی اپنے والدین کو خوش کرنے کی توفیق عطا فرماتا

کہ تو بھی ہم سے راضی ہو۔ درالمجالس کی حکایات ختم ہوئیں اب پھر کتاب کے اصل مضمون کی جانب عود کرتا ہوں۔

لونڈی اور غلام کے حقوق کا بیان:۔ جانو کہ مِلک دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک مِلک نکاح جس کا مِلک مُتعہ کہتے ہیں۔ اور دوسرے ملکِ رقبہ جس کو ملکِ یمین بھی کہتے ہیں۔ ان میں سے ملکِ نکاح کے حقوق اور مہر وغیرہ کا بیان تو پہلے ہو چکا ہے۔ مِلکِ یمین یعنی غلام کے حقوق کا بیان یہ ہے کہ جنکی ادائیگی فراغ معیشت اور صلاح آخرت کی تحصیل کے لئے ضروری ہے یعنی ان کے حقوق ادا کر کے انکو خوش رکھا جائے گا تو وہ دنیوی امور خوب انجام دینگے۔ اور اسکی وجہ سے مالک آخرت کے امور کو بفراغ انجام دے سکے گا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ وصیت تھی کہ اپنے مملوک کے حق میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ انکو وہی کھلاؤ جو خود کھاؤ، وہی پہناؤ جو خود پہنو اور انکو ایسی امور کی تکلیف نہ دو جس کا وہ سہار نہ کر سکیں۔ نیز فرمایا جو غلام پسند ہو اسکو آرام سے رکھو اور جو نہ پسند ہو اسکو فروخت کر دو۔ اور اللہ تعالیٰ کا اس بات پر شکر ادا کرو کہ اسکو تمہارا غلام بنایا اگر چاہتا تو معاملہ بر عکس بھی تو ہو سکتا تھا کہ اسکو آقا بناتا اور تم کو اسکا غلام۔

روایت میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں ہر روز اپنے غلاموں کی کتنی خطائیں معاف کیا کروں۔ آپ نے ذرا سا سکوت اختیار فرمایا پھر فرمایا کہ ہر روز ستر بار معاف کیا کرو۔ نیز آتا ہے کہ حضرت ابودرداءؓ کی لونڈی نے ان سے کہا کہ میں نے ایک سال تک مسلسل آپکو زہر دیا مگر زہر کا آپ پر کچھ اثر نہ ہوا۔ حضرت ابودرداءؓ نے پوچھا کہ یہ تو بتا کہ تو یہ زہر کیوں دیتی تھی؟ اس نے کہا کہ آپ کی غلامی سے خلاصی پانے کے لئے یہ سنکر آپ نے فرمایا کہ اچھا جا تجھ کو میں نے خدا تعالیٰ کے لئے آزاد کیا۔

اسی طرح سے آتا ہے کہ قیس بن عاصم کی باندی کے ہاتھ سے اس کے چھوٹے بچے کے سر پر کوئی گرم چیز (سالن وغیرہ کے قسم کی) گر پڑی جسکی وجہ سے وہ اسی وقت مر گیا وہ لونڈی بہت ڈر گئی کہ دیکھا چاہئے اب میرا کیا حشر ہوتا ہے۔ قیس نے اسکی پریشانی کو محسوس کیا اور سمجھا کہ بدون آزاد کئے ہوئے اس کے قلب سے یہ خوف جائے گا نہیں چنانچہ اسکو آزاد کر دیا۔ سبحان اللہ۔ یہ بات انتہائی حلم و صبر اور رضا بالقضاء کی ہے۔

اسی طرح سے ایک واقعہ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ میمون بن مہران کے پاس ایک مہمان آیا انہوں نے لونڈی سے کہا کہ جلدی سے کھانا لاؤ۔ اس جلد بازی میں اسکا پاؤں پھسلا اور سینی ہاتھ سے چھوٹ گئی اور سارا سالن میمون کے سر پر آگیا۔ میمون نے لونڈی کی جانب غضب آمیز نظر سے دیکھا، لونڈی نے کہا کہ اے خیر کے تعلیم دینے والے اور لوگوں کو ادب سکھانے والے اللہ تعالیٰ کے

ارشاد پر عمل کر۔ اس نے کہا وہ کیا ارشاد ہے باندی نے کہا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وَالْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ (یعنی نیکو کار لوگوں کے اوصاف میں شمار فرمایا ہے کہ وہ لوگ ہیں جو غصہ کو پی جانے والے ہیں) میمون نے کہا بہت اچھا میں نے اپنے غصہ کو رو کا لونڈی نے کہا اور فرماتے ہیں کہ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ یعنی لوگوں سے درگذر کرنے والے ہیں۔ میمون نے کہا بہت اچھا میں نے بھی تیرا قصور معاف کیا۔ باندی نے کہا اتنا ہی نہیں بلکہ اس پر اور زیادہ کر حق تعالیٰ فرماتا ہے وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ یعنی اللہ تعالیٰ نیکو کاروں سے محبت فرماتے ہیں۔ پس میمون نے اسکو آزاد کر دیا۔ اس حکایت کو صاحب اخلاق محسنی نے حضرت حسینؓ کا واقعہ بتایا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اسی طرح سے روایت میں آتا ہے کہ ایک صحابیؓ اپنے غلام کو مار رہے تھے اور غلام کہتا جاتا تھا کہ خدا کے لئے معاف کر دیجئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غلام کی آواز سن لی اس کے پاس تشریف لے گئے' ان صحابیؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آتے دیکھا تو تو ہاتھ روک لیا آپ نے فرمایا کہ اس نے خدا کے لئے بخشش اور معافی چاہی اور تم نے نہ معاف کیا اور مجھ کو دیکھ کر ہاتھ روک لیا وہ صحابیؓ یہ سنکر نادم ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں نے اسکو آزاد کیا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر یہ نہ کرتے تو تمہارے منھ کو دوزخ کی آگ جلاتی۔ نعوذ باللہ تعالیٰ منہ۔ اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ سب سے پہلے جنت میں تین شخص داخل ہونگے شہید اور وہ مملوک جو کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہو اور اپنے مالک کا بھی خیر خواہ ہو۔ تیسرا وہ عیال دار جو کہ متقی اور پارسا ہو۔ اسی طرح سے دوزخ میں سب سے پہلے تین شخص جائیں گے ایک وہ بادشاہ جو لوگوں پر ظلم کرے دوسرا وہ مالدار جو خدا تعالیٰ کا حق یعنی زکوٰۃ وغیرہ نہ ادا کرے تیسرا وہ شخص جو فقر کے ساتھ تکبر کرے یعنی غریب ہو اور اس پر متکبر ہو۔

الغرض غلاموں کے حقوق کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کو کھلانے پلانے میں میں کوتاہی نہ کرے اور انہیں ایذاء نہ دے اور ان کی طاقت سے زیادہ ان سے کام نہ لے' ان کو حقیر نہ جانے اور بہ نظر تکبر و حقارت ان کو نہ دیکھے اور ان کی خطائیں معاف کیا کرے اور غصہ کو برداشت کرے اور اگر اس سے اپنے حق میں یا خدا تعالیٰ کے حق میں کچھ قصور دیکھے تو حق تعالیٰ کے حقوق میں خود جو تقصیر کر رہا ہے اسے پیش نظر کرلے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ کُلُّکُمْ رَاعٍ وَّ کُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ یعنی تم سب نگہبان ہو اور تم سب اپنی رعیت کے متعلق پوچھے جاؤ گے اللہ تعالیٰ ہم سب کو نیک توفیق عطا فرمائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحابؓ کے طفیل میں۔

مقام کے مناسب دو ایک حکایتیں کتاب نافع المسلمین سے لکھی جاتی ہیں تاکہ ناظرین کو نفع ہو۔

حکایت اول ایک خواجہ نے اپنی لونڈی سے کہا میرا بستر بچھادے باندی نے کہا اے خواجہ تیرا

بھی کوئی مالک ہے اس نے کہا ہاں ہے کہا وہ سوتا بھی ہے یا نہیں خواجہ نے کہا نہیں باندی نے کہا اے خواجہ تجھ کو شرم نہیں آتی تیرا مالک تو جاگے اور تو سوئے۔ خواجہ نے یہ سن کر ایک چیخ ماری اور اور بے ہوش ہو گیا جب ہوش میں آیا تو کہا کہ اے باندی میں نے تجھ کو تیری اس بات پر اپنے مال میں سے آزاد کیا۔ بیان کرتے ہیں کہ پھر وہ شخص کبھی سویا نہیں اور اولیاء اللہ میں اس کا شمار ہوا۔

حکایت دوم حضرت رابعہ بصری سے جو کہ اولیاء کاملین میں سے تھیں کسی شخص نے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ کی طلب کا راستہ آپ کے ہاتھ کیسے لگا یعنی خدا کی طلب کی ابتداء کیونکر ہوئی؟ فرمایا کہ میں سات برس کی تھی کہ بصرہ میں قحط پڑا میرے ماں باپ کی وفات ہو گئی اور میری بہنیں متفرق ہو گئیں اور مجھے رابعہ اس لئے کہتے ہیں کہ میری تین بہنیں تھیں اور چوتھی میں تھی۔ پس میں ایک ظالم کے ہاتھ پڑی اس نے مجھ کو چھ درہم میں بیچ ڈالا۔ جس شخص نے مجھ کو خریدا تھا وہ مجھ سے سخت سخت کام لیتا تھا ایک روز میں کوٹھے پر سے گر پڑی اور میرا ہاتھ ٹوٹ گیا میں نے اپنا چہرہ زمین پر رکھا اور عرض کیا یا رخدایا میں ایک غریب یتیم ہوں ایک شخص کی قید میں پڑی ہوں مجھ پر رحم فرما۔ میں تیری رضا چاہتی ہوں اگر تو راضی ہے تو پھر مجھے کوئی فکر نہیں۔ اس کے جواب میں میں نے ایک آواز سنی کہ اے ضعیفہ غم مت کھا کہ کل کو۔ تجھے ایک ایسا مرتبہ حاصل ہو گا کہ مقربان آسمان تجھ کو اچھا جاننے لگیں گے۔ اس کے بعد میں اپنے مالک کے گھر آئی تو میں نے روزہ رکھنا شروع کیا اور شب کو ایک گوشہ میں جا کر عبادت میں مشغول ہوتی۔ ایک مرتبہ میں آدھی رات کو حق تعالیٰ سے مناجات کر رہی تھی اور یہ کہہ رہی تھی کہ الٰہی تو جانتا ہے کہ میرے دل کی خواہش تیرے فرمان کی موافقت میں ہے اور میری آنکھ کی روشنی تیری خدمت کرنے میں ہے اور تو میری نیت کو جانتا ہی ہے کہ اگر میرے ذمہ مخلوق کی خدمت نہ ہوتی تو گھڑی بھر کے لئے بھی تیری عبادت سے آسودہ نہ ہوتی۔ لیکن تو نے مجھ کو ایک مخلوق کے ہاتھ میں اسیر کر دیا ہے۔ یہ دعا کر رہی تھی کہ خواجہ نے میرے سر پر ایک قندیل نور کی بغیر زنجیر کے لٹکی ہوئی دیکھی جس کے سبب سارا گھر روشن ہو گیا تھا۔ دوسرے دن خواجہ نے مجھے بلایا اور بہت خاطر کی اور آزاد کر دیا۔ بس میں نے اس سے اجازت لی اور آبادی سے باہر نکلی اور ویرانہ کی راہ لی جہاں کوئی آدمی نہ تھا اور اپنے رب کی عبادت میں مشغول ہو گئی۔ چنانچہ ہر رات ہزار رکعت نماز پڑھتی تھی۔

پانچواں باب

عزلت یعنی تنہائی اور گوشہ نشینی کے بیان میں

جانو کہ مشائخ متقدمین کا اس میں اختلاف ہے کہ ہم نشینی افضل ہے یا گوشہ نشینی چنانچہ بعضوں نے کہا ہے کہ گوشہ نشینی بہتر ہے۔ اور بعضوں کا خیال ہے کہ مخلوق سے ملا جلا رہنا بہتر ہے۔ ہر جماعت اپنے قول پر دلیل پیش کرتی ہے اور احادیث اور آثار صحابہ دونوں جانب آئے ہیں۔ اسلاف میں سے کسی کا مقولہ ہے کہ حکمت دس اجزا میں منقسم ہے جن میں نو جز خاموشی میں ہے اور ایک جز عزلت میں ہے۔ حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں ھٰذَا وَقْتُ السُّکُوْتِ وَمُلَازَمَۃِ الْبُیُوْتِ یعنی بس اب یہ وقت خاموشی کا اور اپنے اپنے گھروں کو لازم پکڑے رہنے کا ہے۔ ایک بزرگ اپنے گھر سے نکل کر دروازے پر آئے اور باہر بیٹھ گئے اچانک کسی طرف سے ایک پتھر آکر ان کے منہ پر لگا' چنانچہ وہ رخسارے سے خون صاف کرتے جاتے تھے اور اپنے نفس سے کہتے جاتے تھے کہ دیکھ اے نفس میں تجھے نصیحت کرتا تھا کہ گھر سے مت نکل اس کے بعد خلوت میں تشریف لے گئے اور پھر آخر وقت تک گھر سے نہ نکلے۔ اسی طرح سے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اور سعیدؓ ابن زید نے کہ اجل صحابہؓ ہیں عقیق میں ایک گوشہ کو لازم پکڑلیا (یہ مدینہ کے قریب ایک جگہ ہے) پھر اس کے بعد تاحیات مدینہ میں نہ آئے نہ جمعہ کے لئے نہ اور کسی کام کے لئے۔

ایک بادشاہ حاتم اصمؒ کے پاس آیا اور کہا کہ حضرت آپ کو کوئی حاجت ہے فرمایا ہاں وہ یہ کہ نہ میں تمہاری شکل دیکھوں اور نہ تم مجھے دیکھو۔ ایک شخص نے حضرت سہل تستریؒ سے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی مصاحبت اختیار کروں۔ فرمایا کہ میرے مرنے کے بعد کس کے مصاحب بنو گے؟ پس اس وقت جس کے مصاحب ہو گے ابھی سے کیوں نہیں جاتے عبداللہ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ بہترین مجلس وہ ہے جو گھر کے کسی گوشہ میں ہو کہ نہ کوئی تجھے دیکھے اور نہ تو کسی کو دیکھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہؓ نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ لوگوں میں سے بہتر کون شخص ہے؟ آپؐ نے فرمایا جس نے راہ خدا میں جہاد کیا ہو۔ صحابہؓ نے عرض کیا اس کے بعد کون افضل ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ وہ شخص جس نے کسی پہاڑ کے دامن میں گوشہ نشینی اختیار کی ہو۔ اور اپنے کو خدا کی عبادت میں لگائے رکھے۔ اور مخلوق کو اپنے شر سے بچائے رکھے۔ حدیث شریف میں یہ بھی آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو دوست رکھتے ہیں جو کہ متقی ہو اور لوگوں کی آنکھ سے مخفی ہو

(یہ دلائل تو گوشہ نشینی کی فضیلت کے سلسلہ کے تھے) اور صحبت یعنی ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہنے کی فضیلت کے دلائل یہ ہیں۔

جانو کہ مصاحبت اور مخالطت باہم قلوب میں الفت پیدا ہونے کا سبب بنتی ہے نیز مسلمانوں کو سلام کرنے (اور ان کا سلام لینے) کا موقع اس میں ملتا ہے۔ اسی طرح سے امور دین میں ایک دوسرے کی مدد کرنے کی توفیق ہوتی ہے۔ فرمایا اللہ تعالیٰ نے تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى۔ یعنی ایک دوسرے کی مدد کرو نیکی پر اور تقویٰ پر چنانچہ جب آدمی لوگوں کے درمیان رہے گا تبھی تو اس کو اس پر عمل نصیب ہوگا۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اَلْمُؤْمِنُ مَنْ اَلِفَ وَلَا خَيْرَ فِيمَنْ لَّا يَأْلَفُ یعنی مومن تو وہی ہے جو لوگوں سے الفت کرے اور جس شخص میں الفت نہیں وہ بھلائی سے خالی ہے پس جب لوگوں میں رہے گا تو اس حدیث پر بھی عمل نصیب ہوگا۔ اسی طرح سے حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص نے عبادت کی خاطر پہاڑ میں سکونت اختیار کی لوگ اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آئے + آپ نے اسکو اس سے منع کیا اور فرمایا لوگوں میں رہ کر انکی ایذاء پر صبر کرنا چالیس برس کی عبادت سے بہتر ہے۔ نیز حدیث میں آتا ہے کہ شیطان کی مثال بھیڑئے کی سی ہے اور عام لوگ مانند بکریوں کے ہیں۔ پس جہاں کوئی بکری گلہ سے جدا ہوئی بھیڑیا اسکو اچک لیجائے گا لہٰذا دور رکھو اپنے کو گوشہ نشینی اختیار کرنے سے۔ ان روایات سے صحبت کا افضل ہونا معلوم ہوتا ہے۔ حاصل یہ کہ عزلت اور صحبت میں سے ہر ایک کے کچھ فوائد ہیں اور کچھ آفات ہیں جس طرح نکاح اور تجرد کے متعلق بیان کیا جا چکا ہے۔ لہٰذا ہر ایک کے فوائد اور آفات پر انسان کو نظر رکھنی چاہئے۔ اگر کسی کو عزلت کے فوائد حاصل ہوں تو اس کے لئے عزلت افضل ہے ورنہ صحبت بہتر ہے اور انکے فوائد و نقصانات کا بیان کرنا ضروری ہوا۔ چنانچہ اس بات میں تین فصلیں ہیں فصل اول۔ عزلت اور گوشہ نشینی کے فوائد کے بیان میں۔ فصل دوم اس کے نقصانات کے بیان میں۔ فصل سوم عزلت کے آداب کے بیان میں۔

فصلِ اوّل

عزلت یعنی گوشہ نشینی کے فوائد کے بیان

عزلت کے فوائد میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ذکر و عبادت کے لئے فراغت قلبی کا سبب بنتی ہے۔ اور اسکی وجہ سے فکر میں حضوری نصیب ہوتی ہے۔ اور حق تعالیٰ کے ساتھ مناجات میں انس

کا ذریعہ بنتی ہے کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ عبادت کا خشوع اور اس میں حضوری بدون فراغت قلبی کے متصور نہیں۔ اور صحبت اور مخالطت میں اکثر تشتت اور تشویش خاطر ہی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ابتداء حال میں غار حرا میں گوشہ نشینی اختیار فرمائی یہاں تک کہ نور نبوت آپ کا اس درجہ قوی ہو گیا کہ پھر کثرت آپ کے لئے مانع انوار وحدت نہ ہو سکی۔ اور نہ وحدت آثار کثرت کو محو کرنے والی رہی لیکن (یہ سمجھ لو کہ ہر خلوت سے یہ مقام نہ حاصل ہو جائے گا بلکہ) اس مرتبہ کے حصول کے لئے نور نبوت درکار ہے۔ بدون اس کے یہ درجہ میسر نہیں ہو سکتا اور بغیر نور نبوت اس کے تحصیل کی طلب بیکار ہے۔ رسول اللہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہر و باطن میں اتباع کی بدولت آپ کی امت ہی کے بعض اولیاء کو بھی یہ مقام حاصل ہوا ہے چنانچہ سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ کہتے ہیں کہ تیس برس سے مجھے حق تعالیٰ کے ساتھ ہم کلامی کا شرف نصیب ہے اور لوگ خیال کرتے ہیں کہ میں ان سے گفتگو کر رہا ہوں۔ اور یہ مقام ثمرہ ہے استغراق کا اور فرط محبت کا اور یہ ممکن ہے کوئی محال بات نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس کے مثل ہم عشق مجازی میں دیکھتے ہیں کہ عاشق اگرچہ ظاہر میں لوگوں سے بات چیت کرتا ہوتا ہے لیکن اس کے قلب میں اسکا محبوب ہی بسا ہوتا ہے اور دل سے وہ اسی کی جانب متوجہ ہوتا ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے۔ بیت

دل پیش توام دیدہ بجائے دگرستم تاخلق نداند کہ ترامی نگرستم

یعنی اے میرے محبوب میرا دل تیرے سامنے حاضر ہے اور نظر سے دوسروں کو دیکھتا ہوں تاکہ مخلوق یہ نہ جان سکے کہ میں تجھے دیکھ رہا ہوں۔ جب عشق مجازی میں یہ بات حاصل ہو سکتی ہے تو عشق حقیقی میں عاشق کا کیا حال ہوتا ہو گا آپ سمجھ سکتے ہیں۔

غرض سلف کی حکایات عزلت اختیار کرنے کے باب میں بیشمار ہیں۔ منجملہ فوائد عزلت کے ایک یہ بھی ہے کہ اس میں لوگوں کی غیبت سے امن رہتا ہے۔ اس لئے کہ مخالطت اور مجمع میں رہتے ہوئے غیبت سے بچ جانا صدیقوں ہی کا مرتبہ ہے۔ اور اس مقام کا حاصل ہونا ہر کسی کو میسر بھی نہیں ہے۔ اور عادت لوگوں کی یہی ہے کہ وہ مخلوق کے عیوب اور انکی خبریں ضرور بیان کرتے ہیں۔ اب اگر انکی موافقت کی جائے تو غضب خداوندی کا مستحق ہو اور اگر سکوت اختیار کرے تو گناہ میں شریک ہو اور اگر اس پر نکیر کرے تو پھر لوگ اسی کی غیبت کریں گے۔ اور عجب نہیں کہ اسکو گالیاں دیں۔ پس اسکا انکار شر و فساد میں اور اضافہ ہی کا سبب بنے گا اور عزلت میں ان تمام باتوں سے سلامتی حاصل ہے۔

نیز عزلت کے فوائد کے منجملہ ایک یہ بھی ہے کہ صحبت اور مخالطت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فوت ہونے کا اندیشہ رہتا ہے حالانکہ وہ واجبات دین میں سے ہے اور یہ اس لئے کہ

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ امر بالمعروف کرنے سے ایسا شر و فتنہ کھڑا ہو جاتا ہے کہ جس کے دفع کرنے والے کو مرتکب منہیات ہونا پڑتا ہے۔ بالخصوص اس زمانہ میں کہ حامیانِ دین اور متبعین شرع اقل قلیل ہیں۔

نیز منجملہ فوائد عزلت کے ایک یہ بھی ہے کہ اس میں ریا سے سلامتی ہے۔ اور ریاء کا یہ حال ہے کہ یہ ایک مرض لاعلاج اور درد لا دوا ہے۔ اور اس کے دفع کرنے سے ابدال اور اوتاد تک عاجز ہو جاتا ہے۔ اسکو اپنے اندر سے بالکلیہ دفع کرنا صدیقوں ہی کا کام ہے۔ اور عزلت میں اس کے مواقع کم بلکہ قریب قریب ختم ہو جاتے ہیں۔ اور صحبت اور مخالطت میں اس سے بچنا مشکل اور اسکا دفع کرنا دشوار تر ہو جاتا ہے۔

اسی طرح سے عزلت کے فوائد میں سے ایک یہ ہے کہ اس میں کذب و نفاق سے بھی سلامتی رہتی ہے۔ کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں میں باہم عداوت اور خصومت رہتی ہے۔ اب اگر جن دو شخصوں میں عداوت ہے ان میں سے کسی کی بھی موافقت نہ کرے تو دونوں کا دشمن قرار پائے۔ اور اگر ایک کے موافق ہو تو دوسرا اسکو اپنا دشمن سمجھتا ہے۔ اور حدیث شریف میں آتا ہے کہ لوگوں میں سے بدترین شخص وہ ہے جو کہ دورویہ ہو۔ مطلب یہ کہ ایک صورت یہ بھی تھی کہ دونوں سے موافقت کرتا تو اس کے لئے یہ حدیث اور اسکی وعید مانع ہے۔ اور یہ بھی ہے کہ لوگوں کے عام حالات ایسے ہیں کہ ملاقات کے وقت بہت زیادہ شوق کا اظہار کرتے ہیں، اسکی یاد کو مبالغہ کے ساتھ بیان کرتے ہیں، حالانکہ قلب میں ان چیزوں میں سے کسی چیز کا مطلق اثر نہیں ہوتا یہ کھلا ہوا نفاق ہے۔ حضرت سری سقطی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر میرے پاس میرا کوئی مسلمان بھائی آوے اور اس کے آنے کیوجہ سے میں اپنی ڈارھی سنوارنے کے لئے اس پر ہاتھ پھیروں تو ڈرتا ہوں کہ کہیں میرا نام منافقین اور ریاکاروں کے دفتر میں نہ لکھ لیا جائے۔ اسی طرح حضرت طاؤس رحمتہ اللہ علیہ ایک بار خلیفہ ہشام کے پاس آئے اور فرمایا کہ ہشام تمھارا مزاج کیسا ہے؟ ہشام کو غصہ آیا اس نے کہا تم نے امیر المومنین کیوں نہیں کہا۔ حضرت طاؤسؒ نے فرمایا کہ مجھکو اب تک یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ سب مسلمان تمہاری خلافت پر متفق ہیں یا نہیں اور جب اسکا علم نہیں تو پھر امیر المومنین (یعنی سب مسلمانوں کے امیر) کہنے میں کذب کا احتمال ہے اس لئے میں نے نہیں کہا۔

اے مخاطب دیکھ! اگر کسی کو یہ قدرت ہو کہ ایسے جھوٹ اور ایسی ریاء سے بھی احتراز کر سکے تو بلاشبہ اس کے لئے مصاحبت اور مخالطت جائز ہے۔ لیکن اس زمانہ میں کون ہے جو ایسا کر سکے؟ (اس لئے امن اور اطمینان عزلت ہی میں ہے)۔

اسلاف لوگوں کے حالات پوچھنے میں بہت زیادہ اسکا لحاظ کرتے تھے کہ بلا ضرورت بات زبان

سے نہ نکل جائے۔ ایک دفعہ ابن سیرینؒ نے ایک شخص سے پوچھ لیا کہ بھائی تمہارا کیا حال ہے؟ اس نے جواب دیا اس شخص کا حال کیا پوچھتے ہو کہ جس پر پانچ سو درہم قرض ہو اور وہ عیال دار بھی ہو۔ یہ سن کر حضرت ابن سیرینؒ گھر میں تشریف لے گئے اور ایک ہزار درہم لیکر نکلے اور اس شخص کو عطا فرمایا اور کہا کہ پانچ سو درہم قرضہ میں دیدو اور پانچ سو کو اپنے اہل و عیال کے نفقہ میں خرچ کرو۔ لیکن اس کے بعد ابن سیرینؒ نے قسم بھی کھائی کہ اب سے کسی کا حال نہیں پوچھوں گا کیونکہ کسی کا صرف حال پوچھنا بغیر درستی کے قصد کے ریاء اور نفاق ہے۔ اور بلاوجہ ایک مسلمان کو شرمندہ کرنا ہے۔

اور منجملہ فوائد گوشہ نشینی کے ایک یہ ہے کہ اس میں فاسقوں کی صحبت اور غافلوں کی ہمنشینی سے حفاظت رہتی ہے۔ اور اسکا مطلوب ہونا ظاہر ہے کیونکہ صحبت میں بری تاثیر ہے اور طبیعت کے اندر اخلاق چرانے کا مادہ ہوتا ہے۔ اس لئے جب بُروں کے پاس بیٹھے گا تو طبیعت میں برائی پیدا ہونا لازمی ہے اور اسکا اثر ایسا خفی ہوتا ہے کہ قبول کرنے والے کو اسکی خبر بھی نہیں ہوتی۔ نیز فسق و فجور کے افعال کو دیکھنا قساوت قلبی کا سبب بنتا ہے اور دین کی حمیت اور حمایت قلب سے نکل جاتی ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص کسی فعل کا منکر اور اس سے متنفر ہو مگر کچھ دنوں برابر اس کو دیکھتا رہے تو اس کا انکار مبدل باصرار ہو جائے گا۔ یعنی جس کام سے اب تک نفرت کرتا تھا اسی کو کرنے لگے گا یہی وجہ ہے کہ امیروں کی صحبت سبب بن جاتی ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو حقیر جاننے لگے اور اسکی وجہ سے وہ ان کپڑوں اور کھانوں میں عیب لگاتا ہے کہ اگر انہیں کوئی فقیر پاجاوے تو اس پہ ہزار شکر ادا کرے۔ بلکہ اور ترقی کر کے کہتا ہوں کہ فاسقوں کی خبروں اور واقعات کا صرف سننا خالی از تاثیر نہیں ہوتا۔ نہیں دیکھتے ہو کہ اسلاف اور بزرگان دین کے واقعات انکی عبادات اور انکے نیک امور کے متعلق جب سنتے ہو تو کس قدر اپنی تقصیرات پیش نظر ہو جاتی ہیں۔ طاعات کا شوق پیدا ہو جاتا ہے۔ قلب میں صلاح کا داعیہ ابھرتا ہے اور خیر و بھلائی سے رابطہ قوی ہو جاتا ہے۔ برخلاف اس کے اگر کسی اہل معصیت یعنی فساق و فجار اور اہل دنیا کے حالات سنو تو شہوت کا ابھار ہوتا ہے اور جذبہ معصیت حرکت میں آجاتا ہے۔ غرض جب قلب میں بھلائی برائی صرف ان لوگوں کے خبروں کے سننے سے پیدا ہو جاتی ہے تو جب انکے حالات کو اپنی آنکھوں سے دیکھے گا تو کیا کچھ اثر نہ ہو گا۔ اور جس چیز کی عادت ہو جاتی ہے اور آدمی جس عمل کو بار بار کرتا ہے تو اسکی وجہ سے وہ اس گناہ کو معمولی بھی سمجھنے لگتا ہے۔ چنانچہ دیکھو اگر کسی عالم کو لوگ ریشم پہنے دیکھ لیں تو تا عیب کریں کہ حد سے گذر جائیں اور اگر وہی عالم کسی کی غیبت کردے تو کسی کو اسکی برائی کی طرف التفات تک نہ ہو گا۔ حالانکہ غیبت کے متعلق آتا ہے کہ وہ بدتر از زنا ہے (بات یہ ہے کہ ریشم پہننے کی عادت سب کو نہیں ہے۔ اس لئے ہر شخص اسکو برا سمجھتا ہے اور غیبت کو نقل مجلس سمجھا جاتا

ہے) یہی وجہ ہے کہ جو بری رسمیں اور بری عادتیں لوگوں میں رائج ہیں انکی برائی ختم ہو جاتی ہے۔ اس سے حیاء اور حجاب بھی جاتا رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ علماء فرماتے ہیں کہ اگر کسی عالم سے لغزش اور گناہ دیکھا جائے تو مصلحت اسی میں ہے کہ اسکو عوام سے نہ بیان کیا جائے تاکہ ان کا عقیدہ درست رہے اور وہ اسکو اپنی معصیت کی دلیل گناہ پر حجت اور ترک طاعت کا بہانہ نہ بنا سکیں۔ دیکھا جاتا ہے کہ بہت سے ایسے لوگ ہیں کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے مشاجرات اوران کے اختلافات کے واقعات سنتے ہیں تو یہ خیال کرتے ہیں کہ ان میں بھی معاذ اللہ طلب ریاست اور حب دنیا تھی اور اسکو اپنی دنیاداری کی دلیل بناتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اجی بس اسی طرح سے ہوتا چلا آیا ہے۔ کوئی شخص ایسا نہیں ہے کہ جس نے قید دنیا سے خلاصی پائی ہو۔ معاذ اللہ۔ انکا یہ خیال منجملہ فریب نفسانی اور وساوس شیطانی کے ہے۔ بات یہ ہے کہ جیسی طبیعت ہوتی ہے ویسی ہی بات سمجھ میں آتی ہے۔ بری طبیعت ہمیشہ برائی کیطرف مائل ہوتی ہے۔ اللّٰھُمَّ احْفِظْنا وو فقنا لما تحب و ترضٰی۔

نیز منجملہ فوائد عزلت کے ایک یہ ہے کہ اس میں فتنوں اور جھگڑوں سے خلاصی رہتی ہے اور اپنے نفس کو بھی مصائب اور بلاؤں میں گھسانے سے حفاظت رہتی ہے۔ اور اکثر یہی ہوتا ہے کہ شہر اور بستی والے ان قصوں سے خالی نہیں ہوا کرتے۔ خاص کر بڑے بڑے واقعات اور حادثات کے موقع پر (جسکی مثال ہمارے زمانے میں ایک الیکشن بھی ہے) اور جو شخص گوشہ نشین رہتا ہے وہ ان سب چیزوں سے محفوظ رہتا ہے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایام فتن اور وقت فساد کا تذکرہ فرمایا' میں نے عرض کیا یا رسول اللہ وہ زمانہ کیسا ہوگا؟ فرمایا وہ زمانہ ایسا ہوگا کہ کسی انسان کو جو کسی کی ہم نشینی اختیار کیے ہوگا اپنے سے امن نہ ہوگا۔ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اگر میں اس زمانے کو پاؤں تو میرے بارے میں کیا ارشاد فرماتے ہیں؟ فرمایا کہ بس اپنے مکان میں رہنا۔ میں نے کہا کہ اگر کوئی میرے مکان میں آجائے تو میں کیا کروں گا۔ فرمایا کہ گھر کے اندرونی حصہ میں چلے جانا۔ میں نے عرض کیا اگر اندر بھی چلا آوے تب؟ آپؐ نے فرمایا کہ مسجد چلے جانا اور خدا کی یاد میں مشغول ہو جانا بس اسی حال پر رہنا یہاں تک کہ تم کو موت آجائے منقول ہے کہ جب حضرت سعدؓ ابن ابی وقاص کو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں خروج (بغاوت) کے لئے بلایا گیا تو آپ نے فرمایا کہ میں تو اپنے ہاتھ میں تلوار نہیں پکڑونگا مگر یہ کہ مجھ کو ایسی تلوار دو جو آنکھ اور زبان رکھتی ہو کہ آنکھ سے دیکھ کر اور زبان سے مجھ سے کہے کہ میرا یہ مقابل مسلمان ہے تاکہ میں اسے چھوڑوں یا کافر ہے تاکہ اسے ماروں۔ اور فرمایا ہماری تمہاری مثال ایسی ہے جیسے کوئی جماعت دن کے اجالے میں روشن میدان میں جارہی ہو کہ اچانک آندھی آئی اور اس کے غبار سے سارا عالم تاریک ہو گیا اور لوگ راستہ بھول گئے

حیران اور پریشان ہو کر کوئی ادھر کو بھاگ رہا ہے کوئی ادھر کو مگر راستہ کسی کو نہیں مل رہا ہے اور اسی جماعت میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنہوں نے یہ کیا کہ کسی طرف کو نہیں بھاگے بلکہ ایک جگہ سکون سے کھڑے ہو گئے یہاں تک کہ آندھی تھمی' اور غبار چھٹا اور راستہ روشن ہو گیا تب انہوں نے اپنی راہ لی یہی وہ جماعت ہے جو فتنوں اور فساد سے یکسو رہی اور گوشہ نشینی اختیار کر کے شر سے محفوظ رہی۔

روایتوں میں آتا ہے کہ جب حضرت حسینؓ نے عراق کا قصد کیا اور حضرت ابن عمرؓ نے سنا تو انکے پیچھے دوڑے تین دن کی مسافت طے کرنے کے بعد ملاقات ہوئی حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا اے ابن رسول اللہ کہاں کا ارادہ ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ عراق جا رہا ہوں وہاں کے لوگوں نے عہد و پیمان کیا ہے اور خط بھیجا ہے۔ ابن عمرؓ نے فرمایا کہ اے حسینؓ کبھی انکے عہد و پیمان پر بھروسہ نہ کرنا اور انکے لکھنے کی جانب التفات نہ کرنا۔ میں تم سے ایک حدیث بیان کرتا ہوں سنو! ایک بار حضرت جبریل علیہ السلام تمہارے نانا (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس آئے اور انکو دنیا اور آخرت (ان دونوں) میں سے کسی ایک کو لے لینے کا اختیار دیا آپ نے آخرت کو دنیا پر اختیار فرمایا۔ تم بھی جگر گوشہ رسول ہو وہی کرو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا۔ یعنی دنیا کو چھوڑو اور آخرت کو اختیار کرو۔ آپ کو دنیاوی فتوحات کی جانب توجہ نہ کرنی چاہئے۔ حضرت ابن عمرؓ نے حضرت حسین کو انتہائی خیر خواہی کے ساتھ نصیحت فرمائی لیکن خدا تعالیٰ نے جو لکھ دیا تھا اسکا تقاضہ غالب آیا اور حضرت حسین نے ابن عمرؓ کی نصیحت قبول نہیں فرمائی۔ بالآخر حضرت ابن عمرؓ نے رخصت کرنے کے لئے آپکو گلے سے لگایا اور بہت روئے اور فرمایا کہ نہیں مانتے ہو تو جاؤ خدا حافظ اللہ تعالیٰ تم کو قتل سے محفوظ رکھیں یہ کہہ کر حضرت ابن عمرؓ واپس چلے آئے۔

اور حضرت سفیان ثوریؒ نے فرمایا کہ یہ وہ زمانہ ہے کہ اس میں ترک نکاح جائز ہو گیا یعنی (انسان اگر فساد و فتن سے بچنے کے لئے گوشہ نشینی اختیار کر لے حتیٰ کہ نکاح جیسے مسنون تعلق سے بھی اپنے کو الگ رکھنا چاہے تو لوگوں کے حالات کے تحت علماء نے اس کی بھی اجازت دے دی تھی) مترجم فرماتے ہیں کہ جب حال اس زمانہ کا یہ تھا تو اسی پر اپنے زمانہ کے حالات کو قیاس کرنا چاہئے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ سب زمانوں سے بہتر میرا زمانہ ہے (مراد اس سے حضرات صحابہ کرام کا زمانہ ہے) اس کے بعد ان لوگوں کا زمانہ جو ان سے ملے ہوئے ہیں (یعنی تابعین کا زمانہ) اور اس کے بعد ان لوگوں کا زمانہ جو ان سے ملے ہوئے ہیں (یعنی تبع تابعین کا زمانہ) ان تینوں زمانوں کے بعد کذب کا شیوع ہو جائے گا۔ اسلاف نے فرمایا ہے کہ شیاطین حضرات صحابہ کے زمانہ میں بھی لوگوں کے پاس آتے تھے لیکن انتہائی حسرت کے ساتھ واپس چلے جاتے تھے اور اپنے سردار سے جا کر کہتے تھے کہ یہ عجیب لوگ ہیں کہ ہمارا دست قدرت ان کے دامان عصمت سے کوتاہ رہ جاتا

ہے۔ اور ان کا قدم صدق مانند پہاڑ کے قائم ہے جس میں ذرا جنبش نہیں ہوتی یعنی ان پر ہمارا کچھ بس نہیں چلتا۔ ابلیس جو شیطانوں کا سردار تھا وہ اپنے چیلوں سے کہتا تھا کہ گھبراؤ نہیں ذرا ان کا (یعنی صحابہؓ کا) زمانہ گزر جائے تو پھر تمہارے لئے آسانی ہو جائیگی۔ چنانچہ جب زمانہ تابعین کا آیا تب بھی وہ سب شیاطین ناامید پھرتے تھے کہتے تھے کہ یہ بھی بڑے ہوشیار لوگ ہیں۔ پھسلتے ہیں لیکن پھر فوراً ہی تدارک کر لیتے ہیں۔ شیطان ان سے کہتا تھا کہ تھوڑا اور ٹھہر جاؤ ان کے بعد ایک قوم آئیگی تمہاری مراد ان سے ضرور پوری ہوگی چنانچہ جب زمانہ تابعین اور تبع تابعین کا گزر گیا تو پھر شیطانوں کا تسلط انسانوں پر ہو گیا یعنی جس طرف لے گئے ادھر گئے۔ اسی طرح جوں جوں خیر القرون سے دوری ہوتی جاتی ہے حال بد سے بدتر ہی ہوتا جاتا ہے۔

اگر کوئی کہے کہ شیاطین کا یہ دور دورہ اور مایوس ہو کر ابلیس کے پاس جانا اور اس کا ان کو جواب اور تسلی دینا یہ کیسے ہوا آیا کسی نے مشاہدہ کیا ہے یا کوئی دلیل اس پر قائم ہے جواب اس کا یہ ہے کہ یہ امور مشائخ کاملین کے مکاشفات سے معلوم ہوئے کیونکہ یہ حضرات بعض اوقات ایسی چیزوں کو دیکھ لیتے ہیں کہ اور لوگ ان کے جاننے سے قاصر رہتے ہیں۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ قیاس کے ذریعہ سے یہ بات کہی گئی ہو جس طرح سے کہ بہت سے مقاصد کا علم چیزوں کے زبان حال سے ہو جایا کرتا ہے اسی طرح یہاں ہوا ہو۔ کیونکہ نص سے یہ تو معلوم ہوا کہ انسان کے بہکانے اور گمراہ کرنے کا سبب شیطان ہوتا ہے۔ اجس زمانہ میں گمراہی زیادہ ہو تو سمجھ لینا چاہئے کہ شیطان کا تسلط لوگوں پر غالب ہو گیا ہے مگر یہ آخری دلیل ان لوگوں کے لئے ہے جن کا ایمان ضعیف ہے کیونکہ یہ فہم کے زیادہ قریب ہے اور جو قوی الایمان لوگ ہیں وہ چونکہ مکاشفات اولیاء کو حق جانتے ہیں اس لئے ان کے لئے وہی کافی ہے۔ اسس کے بعد ان کو کسی دلیل کی حاجت نہیں۔

منجملہ فوائد عزلت کے ایک یہ بھی ہے کہ اس میں لوگوں کے شر اور ان کی ایذا سے خلاصی اور بچاؤ ہے۔ کیونکہ عام لوگوں کے محبوب مشاغل تو یہی ہیں کہ کبھی غیبت کر کے ایذاء پہنچادی کبھی کسی کو تہمت لگا دی اور اس سے بدگمانی کا شکار ہو گئے۔ کبھی کسی کی چغلی کھائی اور غلط بات اس کی جانب منسوب کر دی۔ کبھی بیکار اور دور از کار سوالات ہی کا سلسلہ شروع کر دیا۔ کبھی جھوٹی طمع قائم کر لی اور کبھی ایسی تکالیف کا مکلف کسی کو بنا دیا کہ جن کا بجالانا نہایت ہی مشکل اور دشوار ہوتا ہے۔ اور اکثر و بیشتر یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی کی ایک بات اور عمل کو دیکھا اور اس کی حقیقت اور تہ اور مضمون کو سمجھے بغیر اسے اپنے ذہن میں رکھ لیا اور پھر فرصت کے وقت اسے ظاہر کیا جس پر بہت سے ضرر دینی اور دنیوی مرتب ہوتے ہیں۔ اور یہ تمام امور اسی لئے پیش آتے ہیں کہ لوگوں سے مخالطت رکھی اور جب ان کی مصاحبت ترک کر دی تو ان سب چیزوں سے محافظت ہو گئی اور جو شخص کہ لوگوں کے ساتھ رہتا سہتا ہو گا وہ دشمنوں حاسدوں اور اپنے ساتھ بدگمانی رکھنے والوں سے

خالی نہیں ہو گا یعنی یہ ناممکن ہے کہ اس کے دشمن اور حاسد نہ ہوں۔ بلکہ لوگوں کا تو یہ حال ہے کہ اکثر دوسروں کو بھی حالات اور اعتقاد میں اپنے ہی جیسا سمجھتے ہیں یعنی خود برے ہوتے ہیں تو نیکوں کو بھی برا ہی سمجھتے چنانچہ مشہور ہے کہ۔

کافر همه را بکیش خود پندارد

یعنی کافر شخص دوسرے کو بھی اپنے ہی مذہب پر سمجھتا ہے۔

مذکورہ بالا وجوہ کی بنا پر اگر عزلت اور گوشہ نشینی اختیار کی جائے تو دو امور کا لحاظ کرنا مناسب ہے ایک تو یہ نیت کرے کہ خود کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھونگا۔ دوسرے یہ کہ دوسرے لوگوں کو اپنے شر سے محفوظ رکھ سکونگا اور یہی دوسری نیت لحاظ میں رکھنا مناسب ہے (کہ اس میں شر کی نسبت اپنی جانب کی گئی ہے جس میں تواضع اور کسر نفسی ہے) علماء فرماتے ہیں کہ کسی کو جو بلا اور مصیبت پہنچتی ہے اس کا اکثر سبب مصاحبت اشرار ہی ہوتا ہے۔ حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ سے لوگوں نے پوچھا کہ آپ مدینے کیوں نہیں تشریف لاتے فرمایا کہ اب وہاں کوئی شخص لائق صحبت نہیں رہا اور جو ہیں بھی تو ایسے لوگ ہیں کہ اگر کوئی نعمت دیکھیں تو حسد کریں اور بلا دیکھیں تو خوش ہوں۔ اسلاف میں سے کسی کا مقولہ ہے کہ پہلے زمانہ کے لوگ مانند دوا کے تھے یعنی نافع اور کار آمد اور اب تو بمنزلہ درد اور مرض کے ہو گئے ہیں۔ یعنی تکلیف دہ اور موذی ہیں۔ ایک بدو عرب نے بستی سے باہر کسی درخت کے پاس رہنا اختیار کیا۔ کسی نے اس سے پوچھا کہ کیا درخت بھی مصاحبت کی صلاحیت رکھتا ہے؟ کہا بھائی یہ ایسا ہم نشین ہے کہ جس کے اندر تین خصلتیں نہایت پسندیدہ ہیں ایک تو یہ کہ مجھ سے کوئی بات سنتا ہے تو چغلی نہیں کرتا۔ دوسرے یہ کہ اگر میں اس پر تھوک بھی دوں تو تحمل کرتا ہے۔ تیسرے یہ کہ میں اس کے ساتھ لاکھ بے عنوانیاں کروں یہ کبھی غصہ نہیں ہوتا۔ ہارون رشید نے جب یہ بات سنی تو کہا کہ یہ نصیحت میرے ہی لئے ہے کہ ہم نشینوں کی صحبت ترک کروں۔ بعض بزرگوں نے تو قبروں کی صحبت اختیار کی تھی یعنی بستی کو چھوڑ کر قبرستان میں جا پڑے تھے۔ مصنفؒ فرماتے ہیں کہ اس زمانہ میں کتاب سے بہتر کوئی ہم نشین نہیں جیسا کہ علماء نے فرمایا ہے کہ۔

هم نشینی به از کتاب مخواه که مصاحب بود گه و بے گاه
اینچنیں ہمدمے لطیف که دید که نه رنجد وهم نه رنجانید

یعنی کتاب سے بڑھ کر اور کون ہم نشین چاہتے ہو' یہ ایسا رفیق ہے کہ ہر وقت تمہارے ساتھ رہتا ہے۔ ایسا عمدہ اور بہتر ساتھی کس نے دیکھا ہو گا جو کہ مرنج و مرنجان کا اعلیٰ مصداق ہے یعنی نہ کبھی کبیدہ خاطر ہو اور نہ دوسرے کو مکدر کرے۔ (اسی معنی میں کہا گیا ہے کہ۔

انیس کنج تنہائی کتاب است "وخیر جلیس فی الزمانِ کتابٌ" یعنی بہترین ساتھی زمانہ میں کتاب ہے۔ ونعم قیل۔

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است
صراحیٔ مے ناب وسفینۂ غزل است

یعنی اس زمانہ میں ایسا ساتھی کہ جس پر اطمینان کلی حاصل ہو اور وہ ہر قسم کی خرابی وخلل سے پاک وصاف بھی ہو وہ یا تو اہل اللہ کی محبت اور ان کی صحبت اور رفاقت ہے یا نہیں تو پھر دینی کتب ہیں جن میں حکمت، ہدایت اور معرفت کی باتیں بیان کی گئی ہوں۔ (ازناقل)

حضرت حسن بصریؒ نے حج کا ارادہ فرمایا ثابت بنانیؒ نے کہ وہ بھی اس وقت کے اولیاء اللہ میں سے تھے جب یہ سنا تو کہا کہ میں بھی چاہتا ہوں کہ آپ کی مصاحبت اختیار کروں حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا نہیں رہنے دو تاکہ ہم لوگ ستر و پردہ ہی میں زندگی گزاریں کہ اسی میں سلامتی ہے اور ایک دوسرے کے عیوب پر مطلع نہ ہوں یہی بہتر ہے کہ یہ امر دوستی کے انقطاع اور محبت کے ختم ہو جانے کا سبب ہو سکتا ہے۔ حضرت ابوالدرداءؓ نے فرمایا کہ اب سے پہلے اسلام ایک ایسا درخت تھا کہ جس میں پتے ہی پتے تھے کانٹا اس میں مطلقاً نہ تھا اور اب یہ حال ہے کہ اس میں کانٹے ہی کانٹے ہیں پتے سب برباد ہو گئے حضرت سفیان ابن عیینہؒ نے فرمایا کہ سفیان ثوریؒ جب زندہ تھے تو بیداری میں اور جب ان کا وصال ہو گیا تو خواب میں مجھ سے فرمایا کہ لوگوں سے تعلقات میں کمی کرو کیونکہ ان کے شر سے خلاصی بہت ہی دشوار ہے۔ اور دیناؒ کو دیکھا کہ تنہا بیٹھے ہوئے ہیں اور ایک کتا ان کے زانو پر سر رکھے ہوئے ہے۔ ایک شخص کتے کو ہٹانے لگا تو مالک ابن دینارؒ نے کہا کہ ارے میاں اسکو رہنے دو مجھے اس سے کچھ ضرر اور ایذاء نہیں اور برے ہم نشین سے تو یہ بہرحال بہتر ہے۔ حضرت ابوالدرداءؓ نے فرمایا خدا کا ہم نشین بن اور لوگوں کی صحبت سے پرہیز کر کیونکہ ان کا یہ حال ہے کہ جس اونٹ کی پیٹھ پر بیٹھے اسے زخمی کیا اور جس گھوڑے پر سوار ہوئے بالآخر اس کی کونچیں کاٹیں اور جس قلب کی مصاحبت اختیار کی اسکو خراب کیا۔ بعض بزرگوں نے فرمایا ہے کہ دین ودنیا کی سلامتی تعلقات کی کمی میں ہے اس لئے کہ جتنے یار آشنا زیادہ ہونگے اسی قدر اپنے ذمہ ان کے حقوق زیادہ ہونگے اور سب کی ادائیگی مشکل ہوگی۔ اب اگر حق تعالیٰ کسی کو نیک توفیق عطا فرمائے اور سب حقوق اس سے ادا ہوں تو اس کے حق میں صحبت بہتر ہوگی لیکن ایسے لوگ ہیں بہت کم۔

منجملہ فوائد عزلت کے ایک یہ بھی ہے کہ اس میں لوگوں کی طمع اپنے سے اور اپنی طمع لوگوں سے قطع کرنا ممکن ہوتا ہے اور اپنے سے لوگوں کی طمع قطع کرنے میں بہت فوائد ہیں اس لئے کہ تمام لوگوں کا راضی کرنا تو محالات میں سے ہے لہٰذا انسان کا اپنے نفس کی اصلاح میں مشغول رہنا کہیں بہتر ہے ان تشویشات میں خود کو ڈالنے سے۔ دیکھو لوگوں کے حقوق میں سے آسان ترین حقوق یہ ہیں۔

مریض کی عیادت کرنا۔ فوت ہو جائے تو جنازہ میں شریک ہونا ان کی دعوتوں اور ضیافتوں میں شریک ہونا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ان سب چیزوں میں وقت الگ ضائع ہوتا ہے اور بسا اوقات انسان قباحت میں پڑ جاتا ہے۔ (وقت کا نقصان تو اس طرح سے ہوتا ہے کہ اگرچہ ان چیزوں میں بھی ثواب پایا جاتا ہے لیکن بہ نسبت اور دوسری چیزوں کے جو کہ ان سے افضل ہیں مثلاً تحصیل علم اور شغل عبادت۔ ان کے اعتبار سے وقت کا نقصان ہی ہے ان کی وجہ سے امور خیر سے محروم ہونا پڑتا ہے اور آفت میں پڑنا یوں ہے کہ مثلاً ان امور میں ریا شامل ہو گئی یا ضیافت میں کھانا مشتبہ اور حرام ہوا۔ یا عیادت میں بیمار کو ایذاء ہو گئی تو یہ آفت ہی میں پڑنا ہوا کہ نیکی برباد گناہ لازم کا مصداق ہوا۔ ۱۲ منہ) پھر یہ کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کبھی کوئی ایسا مانع پیش آجائے کہ جس کی وجہ سے ان حقوق کو ادا کرنا مشکل ہو جائے اور کوئی عذر کرتا ہے تو وہ مقبول نہیں ہوتا۔ لوگ کہتے ہیں کہ فلاں کے یہاں تو آپ گئے تھے اور فلاں بات تو آپ نے بھی کی تھی اب ہمارے ہی ساتھ یہ عذر کیوں ہے۔ یہ شکوہ اور شکایت رد و قد باہمی نفاق اور عداوت کا باعث ہو جاتا ہے۔ اور بعض لوگوں نے تو یہ کہہ دیا ہے کہ جس نے کسی بیمار کی عیادت نہ کی تو اس کے موت کی تمنا کرے تاکہ صحت کے بعد ملاقات پر اس سے شرمندگی نہ ہو۔ مترجم فرماتے ہیں کہ اس سے ترک عیادت کی شناعت کو بکمال مبالغہ بیان کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی کے مرنے کی تمنا کرنا کس قدر شنیع امر ہے ایسا ہی ترک عیادت کو بھی جانے کیونکہ اس کے بعد جو شرمندگی لاحق ہوتی ہے اس سے بچنے کی ایک یہی صورت ہے کہ اب اس مریض سے ملاقات ہی نہ ہو اسی کو اس کے مرنے کے منانے سے تعبیر کیا ہے۔ پس جس طرح سے یہ قبیح اس طرح سے جس بات سے یہ لازم آوے وہ قبیح۔

حاصل یہ کہ اگر لوگوں کے حقوق کی ادائیگی میں اپنا سارا وقت صرف کر دے تو عمر تمام ہو جائیگی اور اپنی اصلاح کی جانب مشغول ہونے کا موقع ہی نہ ملے گا (اس کا قبیح ہونا ظاہر ہے) اور اگر ادائیگی حقوق کے لئے بعضوں کی تخصیص کرے تو یہ بات دوسروں کے لئے وحشت کا موجب بنے گی یعنی جن کے حقوق نہ ادا کئے جائیں گے وہ برا مانیں گے اور شکایت کریں گے۔ اور اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ لوگوں کی ہمنشینی اور ہمکلامی اختیار کرنے کی صورت میں ادائیگی حقوق میں تقصیر واقع ہو ہی جاتی ہے اور وہ رنجش کا سبب ہو جاتی ہے۔ ایسے لوگ کم ہونگے جو لوگوں کے ساتھ اٹھیں بیٹھیں اور لوگ ان سے ناراض نہ ہوں بالخصوص بدذات اور حاسد لوگ کہ ان کی نظر تو عیب اور تقصیر ہی پر ہوتی ہے اور جو شخص ان کے ساتھ جتنی زیادہ نیکی کرے اسی قدر وہ اس کے زیادہ دشمن ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ امام شافعی صاحبؒ نے فرمایا ہے کہ ہر عداوت کی جڑ بدذاتوں کے ساتھ نیکی کرنا ہے۔

اسی طرح سے اپنی طمع بھی لوگوں سے قطع کرنے میں بہت سے فوائد ہیں کیونکہ جو شخص دنیا

کے سازو سامان اور زیب وزینت پر نظر رکھتا ہے اس کی حرص کا نشہ قوی ہو جائے) اور حرص کی قوت کے بقدر انسان میں طمع پیدا ہو جاتی ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ طمع جہاں پہنچی نہیں کہ وہاں ناامیدی پیش آجاتی ہے جس کی وجہ سے آدمی کو بیحد ایذاء ہوتی ہے یہ سب امور تعلقات کے ثمرات ہیں اور جب عزلت اختیار کی تو ان میں سے کوئی چیز پیش نہیں آئیگی اور طمع کے جال میں بھی آدمی نہیں پڑیگا۔ اسی لئے قرآن شریف میں دنیا کے سازو سامان اور اس کی زیب وزینت کی چیزوں کی جانب نظر کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ یعنی نہ اٹھایئے اپنی آنکھ اس چیز کی جانب کہ جس کے ساتھ ہم نے کفار کی جماعتوں کو بہرہ مند کیا ہے۔ یعنی دنیاوی زندگی کی آسائش کی چیزیں۔ اور ہم نے انہیں اس سے اس لئے بہرہ مند کیا تاکہ ہم اس میں مبتلا کر کے آزمائش میں ڈالیں اور آپ کے رب کا رزق (جنت میں) کہیں بہتر اور باقی رہنے والا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اپنے سے کمتر پر نظر کرو بالا پر نظر نہ کرو اس لئے کہ یہ تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر زیادتی شکر کا سبب بنے گا۔

(فائدہ) میں کہتا ہوں یہ حکم دنیوی امور میں ہے مثلاً اپنے کو اگر دونوں وقت کھانا ملتا ہے تو اس کو دیکھو جس کو ایک ہی وقت ملتا ہے کیونکہ اس کی وجہ سے کمی پر صبر آجائے گا اور شکر نعمت نصیب ہو گا۔ اور دنیا کی چیزوں میں اپنے سے زیادہ کو نہ دیکھے کہ اس کی وجہ سے رنج وحسد پیدا ہو گا اور موجودہ نعمت کی ناشکری ہو جائیگی۔ اور امور دینی میں اپنے سے اعلیٰ کو دیکھے مثلاً خود دو پارہ کلام اللہ تلاوت کرتا ہے تو اس کو دیکھے جو اس سے زیادہ کا معمول رکھتا ہے مثلاً چار پارے پڑھتا ہے اس کی وجہ سے اپنے اعمال میں عجب نہیں پیدا ہو گا اور اگر دین کے معاملہ میں اپنے سے کم کو دیکھے گا تو اس سے عجب پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ مشکوٰۃ میں اسی مضمون کی حدیث آئی ہے۔ حضرت عون بن عبداللہؒ نے فرمایا کہ میں نے اغنیاء کی ہمنشینی اختیار کی لیکن اس کی وجہ سے ہمیشہ مغموم ہی رہتا تھا اس لئے کہ ان کے برتنوں کو اپنے برتنوں سے بہتر دیکھتا تھا ان کے گھوڑوں کو اپنے گھوڑوں سے بہتر پاتا تھا۔ اسی طرح سے اور چیزوں میں بھی خود کو کم دیکھ کر غمگین سا رہتا تھا اور جب فقراء کے ساتھ بیٹھا تو ان سب چیزوں سے راحت پا گیا۔ غرض جو شخص اہل دنیا اور ان کے اسباب کو دیکھے گا تو دو حال سے خالی نہیں یا تو صبر و تحمل کرے گا اور یہ نہایت مشکل ہے اس لئے کہ صبر کی تلخی سب تلخیوں سے بڑھ کر ہوا کرتی ہے۔ اور یا ان میں طمع و رغبت کرے گا اور حصول کے لئے سعی و تدبیر کرے گا جو اس کے لئے دنیا و آخرت میں ہلاکت کا سبب بنے گا دنیوی ہلاکت تو یوں ہو گی کہ طمع میں مبتلا ہو کر ہمیشہ ذلیل و خوار رہے گا اور مقصود نہ پا کر مایوسی کا شکار رہے گا نیز خود کو مخلوق کی نظر میں حقیر اور رسوا محسوس کرے گا اور ایسی بیماری میں مبتلا ہو جائے گا جس کی کوئی دوا نہیں یعنی صاحب مال سے اس کو

حسد ہو جائے گا جس کی آگ میں جلنا ہلاکت ہی کے مرادف ہے۔ اور آخرت کی ہلاکت یوں ہوگی کہ اسباب دنیوی کے حاصل کرنے میں سعی کرے گا اور اس کے چکر میں پڑ کر طلب دنیا کو طلب آخرت' طلب حق اور قرب خداوندی پر ترجیح دے گا اور اس کا ابدی نقصان اور دوامی بد نصیبی کا سبب ہونا ظاہر ہے۔ نعوذ باللہ منہ۔ یا اللہ ایسے امور سے ہماری حفاظت فرما جو آخرت میں سبب پریشانی بنیں۔ اور اے اللہ ہم کو ہمارے نفوس کے حوالہ نہ کر بلکہ تو ہمارا کارساز اور مددگار رہ۔ بحرمتہ محمد والہ الاطہار واصحابہ الاخیاء انت الرحم الرحمین

اور منجملہ فوائد گوشہ نشینی کے ایک یہ ہے کہ اس میں حفاظت ہوتی ہے بدوضعوں (بد شکلوں) اور احمقوں کے دیکھنے اور ان سے ملاقات سے۔ نیز ان لوگوں کی جانب سے ضرر اور تکلیف پہنچنے سے بھی نجات رہتی ہے۔ بزرگوں نے فرمایا ہے کہ کسی ثقیل اور بدشکل کو دیکھنا چھوٹے درجہ کا اندھاپن ہے۔ چنانچہ بعض بزرگوں سے منقول ہے کہ انہوں نے کسی بدوضع کو دیکھا اور بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ حکیم جالینوس نے کہا ہے کہ ہر چیز کے لئے ایک قلعہ ہے یعنی مقام تحفظ ہوتا ہے۔ اور روح کا قلعہ بدوضع شے کو نہ دیکھنا ہے یعنی ایسی شے کہ لطیف المزاج پر اس کی وضع بار ہو۔ امام شافعیؒ نے فرمایا کہ جب بھی میں کسی ثقیل یعنی بدوضع کے پاس بیٹھا تو اپنے بدن کے اس حصہ میں کچھ نہ کچھ ثقل ضرور محسوس کیا جو اس کی جانب تھا اور یہ فوائد مقاصد دنیوی سے متعلق ہیں کیونکہ ان کا نفع فی الفور حاصل ہوتا ہے لیکن اگر دیکھا جائے تو ان کا تعلق دین سے بھی ہو سکتا ہے اس لئے جب کسی بدوضع کو دیکھ کر کسی دیندار نے ایذا پائی تو بعید نہیں کہ وہ دوسروں سے بھی اس کا تذکرہ کردے اور وہ غیبت ہو جائے اور (اگر اس کی وضع کا نقص پیدائشی ہے تو) عجب نہیں کہ حق تعالیٰ کے فعل پر انکار ہو جائے اور اس کا دین میں مضر ہونا ظاہر ہے۔ پھر یہ کہ آدمی جب کسی سے ایذاء پاتا ہے خواہ وہ کسی قسم کی ہو بدگمانی یا حسد کے قبیل سے ہو یا اور کسی جہت سے ہو تو اس کا بشری ضعف اس امر کا متقاضی ہوتا ہے کہ اس سے بدلہ لے۔ چنانچہ وہ اس میں کوشش بھی شروع کر دیتا ہے اور یہ باعث ہوتا ہے فساد دین کا۔ جس کا منشا مصاحبت ہوا اور عزلت اور تنہائی میں ان تمام امور سے تحفظ اور سلامتی ہے۔

(راقم عرض کرتا ہے کہ بدوضع شخص کی ملاقات سے جس قسم کے ضرر کا اندیشہ مولفؒ نے بیان فرمایا ہے اس کی ایک مثال یہ ہو سکتی ہے کہ ایک بزرگ جو کہ کوزہ پشت یعنی کبڑے تھے ایک بادشاہ سے ملاقات کی غرض سے دربار میں گئے چونکہ کبڑا آدمی ہر وقت جھکا رہتا ہے ان کے قیام کی ہیئت کو دیکھ کر بادشاہ کو ہنسی آگئی چونکہ وہ بزرگ تھے معمولی شخص نہیں تھے اس لئے فوراً بادشاہ سے اس فعل پر مواخذہ کیا اور فرمایا کہ بادشاہ سلامت کو ہنسی کس پر آئی ہے؟ برتن پر یا کمہار پر۔ مطلب انکا یہ تھا کہ پیالہ اگر ٹیڑھا بنا ہو تو اس میں اس کا کیا قصور' اس پر ہنسنا گویا کمہار پر ہنسنا ہے۔ اسی

طرح سے صورتوں کا بنانے والا خدا ہے اسی نے جس کو جیسا چاہا بنا دیا لہٰذا آپ کا مجھے دیکھ کر ہنسنا دراصل خالق پر اعتراض کرنا ہے' آپ اس کا انجام خود سمجھ لیجئے۔ نیز اس پر تنبیہ فرمائی کہ بادشاہ کو تو نہایت مہذب اور شائستہ ہونا چاہیے اور اس موقع پر آپ کی ہنسی نہ صرف یہ کہ خلاف تہذیب بلکہ شان خالق میں عین بے ادبی ہوئی ہے۔

بادشاہ پر ان بزرگ کی اس تنبیہ کا اثر ہوا چنانچہ اپنے فعل پر نادم ہوا اللہ تعالیٰ سے توبہ کی اور ان بزرگ سے معافی مانگی۔ اب دیکھیے یہاں معاملہ ایک شفیق بزرگ سے تھا۔ انہوں نے سنبھال لیا ورنہ تو بادشاہ کی ہلاکت میں کیا کسر تھی۔ اس قسم کا ضرر ہے جو ایسے حالات میں ہو سکتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ راقم عفی عنہ)

فصل دوم

گوشہ نشینی کے نقصانات کے بیان میں

جاننا چاہیے کہ بہت سے دینی فوائد اور دنیوی مصالح ایسے بھی ہیں کہ جن کا حصول مخالطت یعنی لوگوں سے ملنے جلنے ہی پر موقوف ہوتا ہے اس لیے کہ انسان انکی تحصیل میں دوسروں کا محتاج ہوتا ہے۔ چنانچہ عزلت میں انکی تحصیل ممکن نہیں' پس حالت عزلت میں انکا فوت ہو جانا بھی آفات عزلت اور نقصانات گوشہ نشینی و تنہائی میں متصور ہوگا۔ حاصل یہ ہوا کہ جو چیزیں ہمنشینی کے فوائد قرار پائینگی وہی عزلت کی آفات میں شمار ہونگی۔ لہٰذا جب مخالطت کے فوائد معلوم ہو گئے تو اسی سے آفات عزلت کا بھی علم ہو جائیگا۔ چنانچہ مخالطت کے بھی فوائد بہت ہیں۔

منجملہ فوائد اختلاط کے ایک یہ ہے کہ وہ علم دین کے سیکھنے اور سکھلانے کا ذریعہ بنتا ہے اور علم دین کا سکھانا سب عبادات سے بڑھ کر ہے اور اسکا فائدہ بھی بہت زیادہ ہے مگر علم میں تفصیل ہے بعضے علوم ایسے ہیں جو کہ فرض عین ہیں یعنی انکے سیکھے بغیر چارہ نہیں پس عزلت کے سبب اسکا تارک گنہگار ہوگا اور بعضے علوم ایسے ہیں کہ جن کا سیکھنا ہر ایک پر فرض نہیں ہے۔ بلکہ فرض کفایہ ہے یعنی کچھ لوگ حاصل کر لیں گے تو بس کافی ہے مثلاً دینی علوم میں غور و خوض کر کے مسائل کا استنباط کرنا جسے اجتہاد کہتے ہیں کہ ہر شخص کا مجتہد ہونا ضروری نہیں۔

اور اگر فرائض کی تحصیل کے بعد گوشہ نشینی اختیار کرے اور اور عبادت اختیار کرے تو جائز ہے۔ بشرطیکہ اس کے اندر علوم میں غور و خوض کرنے کی صلاحیت نہ ہو۔ کیونکہ اگر علوم میں تبحر حاصل کرنے پر قادر ہو اور علوم شرعی اور عقلی کی مدد سے استنباط بھی کر سکتا ہے۔ تو ایسے شخص کے

لئے ترک خلوت اور تحصیل علم ہی ضروری ہے۔ علم حاصل کرنے سے پہلے خلوت اور گوشہ نشینی اختیار کرنا اسکے حق میں نہایت خسارہ کی بات ہے۔ چنانچہ جو شخص علوم ضروریہ حاصل کئے بغیر عزلت اختیار کریگا تو اس کا اکثر کام بس اوقات کا ضائع کرنا ہی ہوگا خواہ سونے میں ہو یا باطل خیال کے سوچنے میں جیساکہ بزرگوں نے فرمایا کہ۔

خیالات نادان خلوت نشیں

بہم برکند عاقبت کفر و دیں

یعنی نادان اور جاہل گوشہ نشین شخص کے خیالات کا انجام یہی ہوتا ہے کہ وہ کفر اور دین حق کو باہم گڈمڈ کرکے دکھ دیتا ہے۔ نیز گوشہ نشینی سے مقصود یہ ہے کہ انسان اپنے اوقات کو اوراد شرعیہ اور عبادات بدنیہ میں مشغول رکھے اور یہ نادان خلوت نشیں چونکہ نفس کے خطرات اور شیطان کے وسوسوں سے ناواقف ہے اس لئے نفس میں غرور اور اپنی عبادت میں فتور واقع ہوجانے سے خود کو محفوظ نہ رکھ سکے گا لامحالہ اس کا انجام یہ ہوگا کہ کبھی کوئی ایسا کام کر بیٹھے گا جس کی وجہ سے اپنی ساری عمر کی عبادت کو ضائع بلکہ دین ہی کو فاسد کریگا۔ نیز جاہل سے یہ بھی اطمینان نہیں کہ وہ حق تعالیٰ کی ذات وصفات کے متعلق غلط اعتقاد میں خود کو نہ مبتلا کرے۔ پس علم اصل دین ہوا اور انسان کی صلاح اور فساد کا مدار اسی پر ہے اسی لئے عوام اور جہال کے لئے گوشہ نشینی میں کوئی فائدہ نہیں بلکہ یہ ان کے حق میں سراسر مضر ہے اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی بیمار ہو اور علم طب سے قطعی جاہل اور ناآشنا ہو اور طبیب کے پاس بھی نہ جائے بلکہ اس سے کنارہ کش رہے اور گوشہ نشیں ہوجائے ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں اس کی گوشہ نشینی اس کے حق میں مرض اور تکلیف کی زیادتی ہی کا سبب بنے گی۔

اسی طرح سے دوسروں کو علم سکھانے میں بھی بہت ثواب ہے جبکہ سیکھنے اور سکھانے والے کی نیت درست ہو اور اگر تعلیم و تعلم سے مقصود جاہ اور افتخار ہو اور یہ نیت ہو کہ میرے بہت سے ماننے والے اور **مصاحبین** ہوجائینگے تب تو یہ ایک آفت بلکہ ہلاکت ہی ہے۔ اور عالم کے لئے اس زمانہ میں زاویہ نشینی ہی مناسب ہے کیونکہ **طالبین** میں صدق نیت کی بہت کمی ہوگئی ہے۔ ہاں اگر کوئی طالب صادق ہو تو اس وقت گوشہ نشین ہونا اور اس کی تعلیم میں بخل کرنا بیشک ایک بڑا گناہ ہوگا۔ مگر طالب مخلص اور متعلم صادق کا ملنا اس زمانہ میں بہت ہی نادر ہے۔ اور بعض بزرگوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ علم آخرکار اپنی ہی جانب کھینچ لیتا ہے اگرچہ اس کی تحصیل میں ابتداءً نیت دنیا ہی کی رہی ہو (یہ صحیح ہے) مگر اس پر مغرور نہ ہو یعنی بھروسہ نہ کرے شاید دھوکا ہوجائے یعنی عین تحصیل علم ہی کے زمانے میں اس کو موت آجائے۔ اور ان بزرگوار کی مراد اس علم سے علم دین، علم تفسیر، علم معرفت اور حضرات انبیاء علیہم السلام اور حضرات صحابہ کرام کی سیرت اور حالات کا علم

ہے کیونکہ ان میں وعدہ وعید اور پند و نصیحت بکثرت موجود ہے لہٰذا بد نیت کے لئے نیت بد سے رجوع اور ان وعدہ وعید سے اثر قبول کرنے کی قوی امید پائی جاتی ہے۔ باقی علم مناظرہ علوم منطق وفلسفہ اور علوم دعاوی وفصل خصومات یا ان کے مثل جو علوم ہیں وہ یہاں مراد نہیں ان میں تو بری نیت سے لگنے والا بس بھٹکتا ہی چلا جاتا ہے۔ کیا تم نے نہیں دیکھا ہے کہ بہت سے علماء معقول بوڑھے ہو جاتے ہیں مگر حرص دنیا اور طلب جاہ ان میں ہنوز باقی ہوتی ہے بلکہ روز افزوں ہوتی ہے اور رذائل اخلاق سے وہ خلاصی نہیں پائے ہوتے۔ البتہ علم دین اور علم معرفت کہ یہ دینی علوم ہیں۔ ہرچند کہ اس کے صاحب کے اندر کچھ تقصیر بھی ہو مگر یہ لوگ اپنی تقصیر کے معترف بھی ہوتے ہیں اور ان کا نفس ان کو ملامت کرتا رہتا ہے اور خود یہ لوگ بھی نفس پر محاسبہ اور عتاب کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ عالم جو کہ معترف تقصیر ہو جاہل مغرور سے بہرحال بہتر ہے۔ یوں توفیق دینے والے اللہ تعالیٰ ہیں۔

بزرگوں نے فرمایا کہ جس عالم کو تعلیم وتدریس کی حرص زیادہ ہو تو اس کا گرفت نفس کے مظنہ سے نیز مظنۂ جاہ طلبی اور لوگوں کے قلوب میں مقبولیت کے ارادہ سے عالی ہونا مشکل ہے۔ اور اس آفت سے خلاصی مشکل ترین امر ہے الاماشاء اللہ جسے اللہ تعالیٰ محفوظ رکھیں وہی اس آفت سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

(فائدہ) یہ جو کہا کہ جس عالم کو تعلیم وتدریس کی حرص زیادہ ہو الخ تو مطلب اس کا یہ ہے کہ اس کے متعلق گمان ان امور کا ہو سکتا ہے نہ یہ کہ یقیناً اس کے اندر یہ چیزیں موجود ہی ہونگی کیونکہ ہر شخص کی نیت الگ الگ ہوتی ہے اور تمام عالم یکساں نہیں ہوتے لہٰذا کوئی اس سے یہ نہ سمجھ لے کہ جس کو درس وتدریس کی حرص زیادہ ہو وہ خوامخواہ انہیں باتوں کے لئے کرتا ہے بلکہ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ یعنی عمل اچھا یا برا نیت سے ہوتا ہے۔ چنانچہ بہت سے بزرگ گزرے ہیں جو اس میں بہت حریص رہے ہیں۔ اور حدیث شریف میں اس کے حرص کی تعریف بھی آئی ہے (رزقنا اللّٰہ وایاکم) اللہ تعالیٰ ہم کو بھی اور تم کو بھی اس کے شروع حرص سے بہرہ ور فرمائے۔ پس شیخ کی غرض اس کے بیان سے یہ ہے کہ انسان کو چاہیے کہ اپنی نیت کو ان اغراض واہیہ سے خالی رکھے۔ یہ مقصد نہیں کہ علوم دینیہ کے درس وتدریس کی حرص زیادہ نہ کرے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

مشائخ کی تصنیفات کا مطالعہ کرنا اور اسلاف کی تواریخ کا پیش نظر رکھنا اور صوفیہ اور فقراء کی صحبت اختیار کرنا نیت میں اخلاص پیدا کرنے کے باب میں اکسیر ہے۔ اور جہاں تک ہو سکے خواہشات نفس کے خلاف کرنے میں سعی بلیغ کرے کہ اس کو تابع اور محکوم بنانے کی یہی صورت ہے باقی مدارِ کار تو حق تعالیٰ کی توفیق پر ہے۔

منجملہ فوائد مخالطت کے ایک یہ ہے کہ وہ دوسروں کے نفع اور اپنے انتفاع کا سبب بنتی ہے۔ نفع تو یہ ہوتا ہے کہ دوسرے مخلوق کو آدمی اپنے مال اور بدن سے راحت پہونچاتا ہے اور ان کی حاجات اور ضروریات پوری کرتا ہے اور اس میں اس کو اتنا ثواب ملتا ہے کہ جس کا کوئی شمار نہیں۔ چنانچہ جس کو لوگوں کی مصاحبت کے باوجود حدود شرع پر قائم رہنا اور حقوق اسلامیہ کی رعایت کرنا ممکن نہ ہوسکے تو اس کے لئے صحبت' تنہائی سے بہتر ہے جبکہ وہ اپنی عزلت کو عبادات نافلہ اور اعمال بدنیہ میں مشغول کئے ہوئے ہو۔ اور اگر کوئی شخص ایسا ہو جس نے کہ اپنے دل کی دنیا سنواری ہو اور ذکر و فکر کا طریق نیز ذات و صفات حق میں سیر وغیرہ کا شغل یہ امور اس کے ہاتھ لگ گئے ہوں تو اس کے لئے تو پھر عزلت ہی بہتر ہے۔

اور انتفاع (یعنی خود نفع حاصل کرنا) یوں کہ کسب اور معاملات کا اس کو موقع ملے گا۔ چنانچہ جو شخص اسباب معاش کا محتاج ہو اس کو تحصیل قوت کی بھی ضرورت ہو تو اس کے لئے ناگزیر ہے کہ عزلت ترک کرے اور مخالطت اختیار کرے۔ اب اگر حدود شرع کی رعایت کے ساتھ ساتھ یعنی حلت اور حرمت کا لحاظ رکھتے ہوئے نیز حقوق صحبت کی ادائیگی کا اہتمام کرتے ہوئے اس کو کسب کرنا ممکن ہو تو اس کے لئے کسب کرنا ہی بہتر ہے اور اگر بدون ارتکاب ممنوعات کے کسب ممکن نہ ہوسکے تو اس کے لئے عزلت (یعنی گوشہ نشینی) واجب ہے بشرطیکہ اس سے قناعت اور توکل ہوسکے۔ ورنہ مجبوراً کسب کرے۔ اور اگر کوئی شخص ایسا ہے کہ اپنی کمائی سے فقراء پر تصدق کرتا ہے تو اس کے حق میں کسب کرنا عزلت سے بہتر ہے۔ اگر عزلت سے مقصود اس کا محض عبادات ظاہری ہوں تو اس کے لئے متعدی عبادت کسب کرنا (جس کا فائدہ دوسرے بھائی کو بھی پہنچے) لازم عبادت (یعنی نوافل وغیرہ) سے بہتر ہے۔ لیکن اگر یہ شخص صاحب دل' اہل باطن اور علوم دین اور معرفت والا بھی ہے تو پھر اس کے لئے عزلت ہی افضل ہے۔ اس لئے کہ علم آخرت کے ساتھ مشغول ہونا اور معرفت حق کی جانب متوجہ ہونا اور باطن کی راہ چلنا یہ امور عبادات ظاہری سے افضل ہیں۔ پس اختلاط و صحبت میں بھی ہر چند کہ نفع اور ثواب ہوتا ہم ان کی خاطر اس عظیم شے کو ترک کرنا جائز نہیں۔

اور منجملہ اختلاط کے فوائد کے ایک یہ ہے کہ وہ تادیب اور تادّب کا ذریعہ بنتا ہے تادّب سے مراد یہ ہے کہ لوگوں سے مل جل کر رہنے میں ایذاء خلق پر صبر کرنے اور ان کی بد اخلاقیوں پر تحمل کرنے کے مواقع زیادہ ملیں گے اس کی وجہ سے خود اپنے نفس کا خوب مجاہدہ ہوگا۔ اس لئے کہ اس میں کسر نفسی بھی ہے اور اپنی شہوات کا مارنا بھی ہے اور ظاہر ہے کہ اس اعتبار سے مصاحبت اس شخص کے لئے عزلت سے افضل ہے جس کے اخلاق کی اصلاح نہ ہوئی ہو اور جس کی شہوات اور خواہشات ابھی حدود شرع کی مطیع نہ ہوئی ہوں جس طرح کہ ایسے شخص کے لئے ترک نکاح سے

نکاح بہتر ہے۔ باقی یہ فائدہ اس وقت مطلوب ہے جبکہ ارادت کی ابتداء کرنا چاہتا ہو لیکن جبکہ ریاضت نفس میں انسان لگ جائے (اور باطنی اصلاح شروع کردے) اسوقت اس کے لئے گوشہ نشینی ہی اختیار کرنا اور حق تعالیٰ کے ساتھ مشغول ہونا ہی اولیٰ ہے۔ اسلئے کہ ریاضت خود تو مقصود ہے نہیں بلکہ مقصود اس سے راہ آخرت طے کرنے کے لئے خود کو مستعد کرنا اور اس میں صلاحیت سفر پیدا کرنا ہوتا ہے۔ جس طرح کہ گھوڑے کو ریاضت دینے کے لئے خوب دوڑاتے ہیں اور اس کے پاؤں میں لنگر وغیرہ ڈالتے ہیں تو یہ چیزیں خود مقصود نہیں ہوتیں بلکہ مقصود تو اس پر سوار ہونا ہوتا ہے اور ان امور سے اس کو منزلیں طے کرنے کے لئے تیار کرنا ہوتا ہے۔

چنانچہ اگر کسی کو بلا تکلیف کے اس کی اصل فطرت ہی کے اعتبار سے حسن خلق اور صفائی خصلت کی صفات حاصل ہوں تو کیا کہنا' سبحان اللہ۔ ایسے شخص کو تادّب حاصل کرنے کے لئے صحبت کی حاجت نہیں ہے (کیونکہ وہ تو اس کو حاصل ہی ہے)

اور تادیب سے مراد یہ ہے کہ دوسروں کو معصیت سے روکنا۔ اور اس کے ارتکاب پر زجر وتوبیخ کرنا ہے اسی طرح سے حدود شرع کا لحاظ کرتے ہوئے اخلاق و نرمی کے ساتھ ان کو نیکیوں کی جانب پھیرنا اور رہنمائی کرنا۔ اور یہ صفت (یعنی تادیب) علوم ظاہر کے معلم اور طریق سلوک کے مرشد کے درمیان مشترک ہے۔ چنانچہ معلم علم ظاہر کا حال تو پہلے گزر چکا ہے۔ یہاں یہ سمجھو کہ جس طرح سے کہ دنیا کا خیال اور حب جاہ (کا مرض) ایک معلم علم ظاہر کے حق میں محتمل ہے نیز وساوس اور ان کی تباہ کاریاں اور ریا اور اس کی آفات جس طرح کہ ایک عالم ظاہر میں راہ پاسکتی ہیں اسی طرح سے مرشد کے حق میں بھی ممکن ہیں۔ اس لئے کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو بناء خانقاہ اور اجتماع مریدین محض اس لئے کرتے ہیں تاکہ مخلوق کے نزدیک مقبول ہوں اور اس کا دنیا اور آخرت کے لئے نقصان دہ ہونا اور سبب خسران ہونا ظاہر ہے۔

لہٰذا اگر طالبین میں صدق طلب دیکھے اور اپنے میں صدق نیت پاوے تب تو منصب رشد وہدایت پر بیٹھے ورنہ اس کے لئے عزلت ہی خوب ہے۔ گوشہ نشینی اختیار کرے تاکہ ضال (گمراہ ۱۲) اور مضل (گمراہ کرنے والا ۱۲) نہ ہو۔ حاصل یہ کہ صدق نیت (جس کا دوسرا نام ہے اخلاص) ہر چیز میں معتبر ہے۔ واللہ الموفق۔

اس طرح منجملہ فوائد اختلاط کے ایک یہ ہے کہ وہ خود اپنے لئے نیز دوسروں کے لئے انس حاصل ہونے کا سبب ہوتا ہے۔ لیکن باہم اس انس و موانست سے مقصود حظ نفس اور ایسے منافع کا حاصل کرنا نہ ہو جس میں دین و آخرت کا کوئی فائدہ نہ ہو کیونکہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مخالطت اور موانست سبب بن جاتی ہے حرام کے ارتکاب کا۔ لہٰذا یہ چاہیے کہ لوگوں سے انس پیدا کرنے سے اس کی غرض صرف دل کو راحت پہنچانا اور عبادت میں نشاط حاصل کرنا ہو کیونکہ ہمیشہ نفس کو

ریاضت اور مجاہدہ ہی میں لگائے رکھنا موجب وحشت و نفرت اور سبب کلال وملال ہوتا ہے۔ اور حدود کے اندر اندر نرمی اور مدارات کو (یعنی دوست احباب سے کچھ ہنس بول لینے کو) طاعت وعبادت میں شوق نشاط حاصل ہونے میں بڑا دخل ہے۔ جیسا کہ نکاح کے فوائد میں گزر چکا ہے۔ پس جو شخص گوشہ نشینی اختیار کئے ہوئے ہو اس کے لئے بھی ضروری ہے کہ اپنا ایک دوست مقرر کرلے تاکہ چوبیس گھنٹہ میں گھڑی دو گھڑی اس سے باتیں واتیں کرلیا کرے۔ البتہ اس کا خیال رکھے کہ ایسی باتیں نہ کرے کہ سارے دن کی کی کرائی عبادت ایک گھڑی میں برباد ہو جائے۔

لہٰذا چاہیے کہ اس وقت بھی دینی ہی باتیں کرے مثلاً قلبی احوال اور رذائل نفس بیان کرے اور تقصیرات قلب کی شکایت کرے اور استقامت کی ضرورت اور ثبات علی الدین کی ترغیب وغیرہ امور پر گفتگو کرے۔ یوں اگر کچھ ایسی مباح چیزوں میں مشغول ہو جائے جو اس کے لئے سبب نشاط بنیں تو خیر اس کی بھی گنجائش ہے۔ اس بات کو ارباب سلوک جو کہ قلوب کے طبیب ہیں خوب جانتے ہیں۔

(سالک کے لئے) اس طریقہ کے حاصل ہونے میں معین یہ امر ہے کہ اپنے جملہ اوقات کو مختلف عبادتوں میں تقسیم کردے مثلاً ایک وقت تلاوت قرآن کے لئے مقرر کرلے اور ایک وقت نوافل کے لئے۔ اور ایک وقت پڑھنے پڑھانے کے لئے اور ایک وقت علوم دینیہ کے مطالعہ کے لئے وغیرہ وغیرہ۔ اور ایک ہی کام پر نفس کو نہ لگادے کہ اس سے وہ ملول ہو جائے گا۔

منجملہ فوائد اختلاط کے ایک یہ ہے کہ خود اپنے لئے اجر و ثواب حاصل ہوتا ہے نیز دوسروں کے لئے بھی ثواب کی تحصیل کا ذریعہ بنتا ہے خود کو تو اجر یوں ملتا ہے کہ انسان اپنے بھائی مسلمان کے جنازہ میں شرکت کرتا ہے' مریض کی عیادت کو جاتا ہے۔ احباب کے یہاں جائز دعوتوں میں شرکت کرکے اس کے قلب کو خوش کرتا ہے اسی طرح کے اور عمل اور شرعی امور میں اس کو شرکت کا موقع ملتا ہے۔

مثلاً عیدین میں حاضر ہونا جمعہ اور جماعت میں شریک ہونا اور یہ امور تو از روئے شرع اس پر لازم ہیں۔ ان کا ترک تو جائز بھی نہیں ہے' الا بعذر' اور اس کے اعذار کتب فقہ میں مذکور ہیں۔ (مثلاً یہ کہ بقدر ستر عورت لباس نہیں ہے یا بارش یا سردی بہت سخت ہے جس کی وجہ سے بیمار پڑ جانے کا اندیشہ ہے یا مال اسباب کے چوری ہو جانیکا خوف ہو اندھیری رات ہو یا کسی مریض کا تیماردار ہو کہ اس کے ہٹنے سے اس کو تکلیف یا وحشت ہو بھوک شدید لگی ہو یا پیشاب پاخانے کا سخت تقاضا ہو وغیرہ وغیرہ)

یہ تفصیل تو اپنے لئے تحصیل اجر کی ہوئی

اور دوسروں کے لئے سبب اجر و ثواب بننا یوں ہوگا کہ لوگ اس سے ملاقات کے لئے آویں

گے، مصیبت اور غم کے مواقع میں اس کی تعزیت کریں گے۔ نعمت اور خوشی کے مواقع پر اس کو مبارکبادی دیں گے۔ پس اس سے ان کو ثواب ملے گا۔ پھر اگر یہ شخص علماء اور مشائخ میں سے ہوا تو لوگ اس کی زیارت کر کے برکت حاصل کریں گے اور اس پر بھی ان کو اجر ملے گا۔ (چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جس شخص نے کسی عالم حقانی کی زیارت کی اس نے گویا میری زیارت کی اور جس نے اس سے مصافحہ کیا اور اس کی مصاحبت اختیار کی اس نے گویا مجھ سے مصافحہ کیا اور میری صحبت میں بیٹھا۔ اور جو شخص دنیا میں میرے پاس بیٹھا (یعنی ایمان اور اعتقاد کے ساتھ) اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کو جنت میں میرا ہمنشین بنائیں گے۔ اوکما قال صلی اللہ علیہ وسلم)

مخالطت یعنی لوگوں سے مل جل کر رہنے کے بھی فوائد تم نے معلوم کئے، اب رہی یہ بات کہ کس کے لئے خلوت بہتر ہے اور کس کے لئے جلوت؟ تو معیار اس کا یہ ہے کہ جو ثواب اور فوائد اس کو اختلاط سے حاصل ہوں ان کو تولے اور اس ثواب اور فائدہ کے ساتھ اس کا موازنہ کرے جو بہ سبب عزلت اور گوشہ نشینی کے اس کو حاصل ہوتے ہوں جس جانب کے ثواب اور نفع کا پلہ راجح ہو اسی شق کو اختیار کرے خواہ وہ عزلت و تنہائی ہو یا مخالطت اور ترک خلوت۔

اور بعضے اسلاف مثلاً امام مالک رحمتہ اللہ علیہ اور آپ ہی جیسے بزرگوں سے منقول ہے کہ انہوں نے دعوت میں جانا۔ بیماروں کی عیادت کرنا اور جنازہ کی شرکت وغیرہ کو ترک فرما دیا تھا اور (اختلاط کے نقصان سے بچنے کے لئے) اپنے گھر کا گوشہ لازم پکڑ لیا تھا باہر صرف شرکت جمعہ و جماعت اور بزرگان دین کی زیارت اور صحبت کے لئے نکلتے تھے۔ اس طرح بعضے حضرات تو (اختلاط میں دیکھ کر) شہر اور بستی ہی چھوڑ کر جنگل اور پہاڑوں میں جا بسے تھے تاکہ لوگوں کے حقوق اور ہمسایہ کے آداب ہی ان پر لازم نہ ہوں کہ ان میں تقصیر موجب عذاب اخروی بنے اور اس میں شک نہیں کہ یہ طریق بڑی ہی سلامتی کا ہے۔

اس طرح سے منجملہ فوائد مخالطت کے ایک یہ ہے کہ وہ تواضع کا سبب ہے اور تواضع افضل مقامات اور احسن صفات میں سے ہے لیکن یہ صفت تنہا نشین لوگوں کو کم حاصل ہوتی ہے۔ بنی اسرائیل کے ایک حکیم کا واقعہ ہے کہ اس نے حکمت کی تین سو ساٹھ کتابیں تصنیف کیں اور اپنے طور پر یہ سمجھتا تھا کہ اس کی وجہ سے مجھے رب کریم کی بارگاہ میں مرتبہ عظیم حاصل ہو گیا۔ اس زمانہ کے پیغمبر کے پاس وحی آئی کہ اس حکیم سے کہئے کہ تیرا یہ سب زق زق اور بق بق خدا تعالیٰ کے یہاں کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتا۔ اس کے بعد اس نے عزلت اختیار کر لی اور تہ خانہ میں رہنے لگا اور اس کے بعد یہ دعویٰ کیا کہ مجھے حق تعالیٰ کی صحبت علی الدوام حاصل ہے۔ پھر پیغمبر وقت پر وحی آئی کہ ان صاحب سے کہئے کہ اگر میری رضا درکار ہے تو غار سے نکلئے اور بازاروں میں آمدورفت رکھیئے اور لوگوں میں مل جل کر رہئے اور ان کے مابین رہتے ہوئے تواضع اختیار کیجئے۔ عوام کی ہم

نشینی اور صحبت اختیار کیجئے۔ اس لیے کہ (تمہارے لئے) اس عزلت میں بے شمار آفات ہیں۔ چنانچہ وہ حکیم خلوت سے نکلا اور ایک مدت تک اس پر اپنا عمل رکھا (یعنی باوجود علم و فضل کے لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہنے لگا اور انانیت ختم کر کے فروتنی اختیار کی) تو نبی زمانہ پر وحی آئی کہ اب اس سے کہہ دیجئے کہ تو میری رضا کو پہنچا۔ (اس قصہ سے معلوم ہوا کہ عزلت میں آفات بھی ہیں)۔

چنانچہ بہت سے عزلت گزیں ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان کی عزلت اور خلوت نشینی پر باعث ان کا تکبر اور ترفع ہوتا ہے اور لوگوں کے ساتھ اس لئے مل جل کر نہیں رہتے کہ محفلوں اور مجلسوں میں لوگ ان کی تعظیم اور تکریم کا حق بجا نہیں لاتے۔ یا یہ دیکھتے ہیں کہ لوگوں سے الگ تھلگ رہنا ہی ترفع کا سبب اور مخلوق میں معزز ہونے کا ذریعہ ہوتا ہے اس لئے اختلاط سے احتراز کرتے ہیں۔ اور یہ مسکین اتنا نہیں جانتے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے بہ سبب اس کے علم دین (اور تقویٰ) کے بزرگی عطا فرمائی ہو اسے ساتھ مخالطت رکھنی اس کے حق میں کچھ بھی مضر نہیں۔ اور ایسوں کے ساتھ تواضع سے پیش آنا چاہیے۔ چنانچہ امیرالمومنین حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ اپنے اہل و عیال کے لئے بازار سے غلہ اور سامان خود ہی لیکر آتے تھے اور فرماتے تھے کہ۔

لَا یَنْقُصُ الْکَامِلَ مِنْ کَمَالِہٖ
مَا جَرَّ مِنْ نَفْعٍ اِلٰی عِیَالِہٖ

(کامل کے کمال میں کیا کمی آجاتی ہے اس سے کہ وہ کوئی چیز (اپنی پشت پر لاد کر) اپنے بال بچوں کے نفع کے لئے اپنے گھر لیکر آوے)

اسی طرح سے بعض دوسرے صحابہؓ مثلاً حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابن مسعودؓ تھے کہ وہ بھی لکڑیوں کا گٹھا (جنگل سے) اور گیہوں کی گٹھری (بازار سے) اپنی ہی پشت پر لاد کر گھر لاتے تھے۔ اور منقول ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کسی شہر کے امیر مقرر ہوئے تو وہاں بھی لکڑیوں کا گٹھا اپنے سر پر لاتے اور مجمع میں یہ صدا لگاتے چلتے کہ طُرِّقوا الامیر کُم یعنی لوگو! ذرا اپنے امیر کو رستہ دیدو اور کنارے ہٹ جاؤ۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ خود حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم بازار سے غلہ اپنے گھر لاتے ہوتے اور راستہ میں کوئی دوسرا (آپ کی راحت کے خیال سے آپ سے) مانگتا کہ لائیے حضرت میں پہنچا دوں تو آپ اس کو نہ دیتے۔ سبحان اللہ یہ تھی آپ کی تواضع اور سادگی ایسے ہی موقع کے لئے کہا گیا ہے۔

تواضع ز گردن فرازاں نکوست
گدا گر تواضع کند خوے اوست

یعنی بڑے لوگوں سے کوئی تواضع کی بات ظاہر ہو تو یہ ان کا کمال ہے۔ باقی فقیر نے اگر تواضع ظاہر کی تو کیا کمال کیا۔ فقیر ہے اگر تواضع نہ کریگا تو اور کیا کریگا۔

اس طرح سے کبھی ایک شخص اختلاط ترک کر کے خلوت نشینی اس لئے اختیار کرتا ہے تاکہ لوگ اس کی برائیوں اور عیب پر مطلع نہ ہونے پاویں اور وہ لوگوں میں اپنے زہد اور عبادت کا اعتقاد قائم کر کے اس سے ناجائز فائدہ اٹھاوے اور ان کو دھوکا دے یعنی یہ چاہتا ہے کہ لوگوں میں اس کا خوب چرچا ہو اور اس کی بزرگی کا شور و غوغا ہو۔ حالانکہ تمام رات و دن میں ایک ساعت کے لئے بھی وہ حق تعالیٰ کے ساتھ مشغول نہیں ہوتا۔ نعوذ باللہ من ذلک۔

اس طرح سے منجملہ فوائد مخالطت کے ایک یہ ہے کہ وہ تجربہ حاصل ہونے کا بھی سبب اور ذریعہ بنتا ہے اس لئے کہ امور دین و دنیا کی بہت سی مصالح سمجھنے کے لئے صرف عقل غریزی ہی کافی نہیں ہوتی (جو کہ ہر انسان کی فطرت میں ہوتی ہے) بلکہ اس کے کمال کی زیادتی تجربات اور معاملات ہی سے ہوتی ہے۔ اور جس عزلت میں تجربہ نہ ہو وہ تضیع اوقات ہے۔ چنانچہ کسی بچہ کو اگر اوائل عمر ہی سے گوشہ نشین بنا دیا جائے تو پھر وہ تمام عمر جاہل اور ناواقف ہی رہے گا۔ لہٰذا ضروری ہے ہر انسان کے لئے کہ پہلے ایک مدت تک لوگوں میں اٹھے بیٹھے تاکہ اس کو ضروری ضروری امور کا علم ہو جائے اور زندگی گزارنے کے طریقے اور نفع نقصان کی صورتیں سب معلوم ہو جائیں۔ پھر اس کے بعد گوشہ نشینی اختیار کرے۔ اب یہ ہوگا کہ مزید تجربے اس کو صرف احوال کے سننے ہی سے حاصل ہو جائیں گے اور اس سلسلہ میں یہ جان لو کہ سب تجربوں سے ضروری تجربہ اپنے نفس کا اور اپنی باطنی صفات کا تجربہ کرنا ہے اور یہ خلوت میں ناممکن ہے۔ کیونکہ اس کے لئے نفس کی صفات کا علم ضروری ہے اور علم کے لئے اختلاط ناگزیر ہے۔ اب اگر کوئی شخص نفس کے رذائل مثلاً غصہ، حسد، کبر وغیرہ کو جانے بغیر عزلت اختیار کرتا ہے تو ہر چند کہ وہ خلوت میں رہے ہمیشہ پریشان حال اور پراگندہ خاطر ہی رہے گا حالانکہ خلوت اس نے یکسوئی قلب اور فراغ خاطر ہی کے لئے اختیار کیا تھا مگر شے اپنے مقصود سے خالی رہیگی (اس لئے خلوت سے پہلے اپنے رذائل کی اصلاح ضرور ٹھہری) چنانچہ اسلاف اپنے نفس کو بڑی بڑی مشقتوں میں ڈالتے تھے تاکہ ان سے برائیاں دور ہوں۔ مثلاً جس شخص کے اندر تکبر کا مرض ہوتا تو وہ اپنے سر پر بوجھ لاد کر یا کندھے پر مشک رکھ کر بازار میں ہو کر جاتا اور بالقصد ان لوگوں کے پاس سے گزرتا جن سے حیاو حجاب رکھتا ہوتا۔ چنانچہ ایک بزرگ کا واقعہ مشہور ہی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میں نے تیس سال کی نماز محض اس بنا پر دہرائی کہ میں ہمیشہ صف اول میں نماز پڑھتا تھا ایک دن کسی وجہ سے کچھ تاخیر ہو گئی اور جماعت کھڑی ہو گئی اور میں صف اولیٰ میں نہ پہنچ سکا بلکہ آخر صف میں مجھے جگہ ملی تو میں نے دیکھا کہ میرا نفس اس تاخیر کی وجہ سے لوگوں کی نظروں میں شرمارہا ہے۔ پھر جب پہلی صف میں شریک ہوا تو اب دیکھا کہ نفس خوب خوش ہے اس لئے کہ مجھ پر لوگوں کی نظر پڑ رہی ہے اور سابقین فی الخیرات یعنی بھلائیوں میں سبقت کرنے والوں میں میرا شمار ہو رہا ہے۔ اس سے میں نے جانا کہ تیس سال تک جو میں نے نماز پڑھی

ہے وہ سب عجب اور ریا کی آمیزش کے ساتھ ادا کی ہے۔ لہٰذا ان سے اپنی عبادت کو پاک رکھنے کی خاطر میں نے ان سب کا اعادہ کیا۔

دیکھئے اس واقعہ سے بھی معلوم ہوا کہ مخالفت کو رذائل نفس کے سمجھنے اور ان کے دفع کرنے میں بڑا دخل ہے۔ اگر مجمع نہ ہوتا تو نفس کا یہ چور نہ پکڑا جاتا۔ اسی طرح سے اگر ان امور کا علم نہ ہوتا تو مرض موجود رہتا اور آدمی اپنے آپ کو تندرست ہی سمجھتا رہتا پس نفس کے احوال اور ان کو فاسد کرنے والی چیزوں کا علم ضروری ہوا۔ اور مفسدات اعمال سے جاہل اور ناواقف رہنا بدترین عیب ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان کا جاننا شریف ترین علم ہے یعنی ضروریات دین پر ایمان کے بعد بس اسی کا درجہ ہے۔ اب اگر یہی علم حاصل نہ ہو تو بدون اس کے جس قدر بھی عمل زیادہ ہوگا آفت وہلاکت ہی ہے۔ کیونکہ عمل کی صحت اور اس کی صفائی اسی علم پر موقوف ہے اور یہی وجہ ہے جو علم کو عمل سے افضل کہا جاتا ہے۔ حالانکہ علم تو وسیلہ ہے (العلم وسیلة لکل فضیلة) اور وسیلہ مقصود سے مرتبہ میں کم ہوتا ہے پس اس لحاظ سے عمل کا درجہ زیادہ ہونا چاہیے مگر عمل کی صحت اور صفائی چونکہ علم پر موقوف ہے اس لئے اس میں بھی محتاج الیہ ہونے کی وجہ سے ایک گونہ شان مقصودیت کی آگئی ہے۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسی کہ میری فضیلت تم میں کے ایک ادنیٰ شخص پر چنانچہ آیات و روایات اور آثار صحابہؓ علم کی فضیلت کے باب میں بیشمار وارد ہیں۔ اور ان سب میں علم سے مراد علم دین ہے یا جو علم کہ دین کا وسیلہ بنے۔ باقی رہے اور دوسرے علوم تو ان میں تفاوت مراتب ہے۔ بعض مباح ہیں اور بعضے ان میں سے حرام ہیں جس کی تفصیل اپنے موقع پر بیان کی گئی ہے۔ پس علم کی فضیلت کا مرجع اور مال تین امور ہیں۔ ایک تو یہ کہ صحت عمل کی اس پر موقوف ہے۔ دوسرے یہ کہ علم کا نفع عام ہے اور متعدی ہے یعنی تمام مخلوق کو پہنچتا ہے اور عمل کا نفع لازم ہے یعنی تمام مخلوق کو پہنچتا ہے اور عمل کا نفع لازم ہے یعنی خود عامل کی ذات کے ساتھ خاص رہتا ہے۔ اور تیسرے یہ کہ علم سے مقصود قلوب کو مخلوق کی جانب سے پھیر کر خالق کی جانب لانا ہے اور اس کی معرفت اور محبت میں سر شار رہنا ہے۔ اور یہ علم (یعنی جو کہ خالق جل وعلا کی محبت اور معرفت سے متعلق ہے) تو مقصود اصلی ہے باقی جس علم کو وسیلہ کہا گیا ہے وہ علم معاملات ہیں (اور معاملات سے مراد یہاں وہ علم ہے جو عمل کا سبب ہو مثلاً علوم تجارت وغیرہ اور آفات نفس کے علوم وغیرہ)۔

پس جس شخص نے علم وسیلہ ہی کو نہ جانا وہ مثل اندھے کے ہے کہ کنوئیں والے راستہ کو راہ نجات سمجھ رہا ہے۔ اور جس شخص نے سیکھا اور عمل نہیں کیا اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کہ ہاتھ میں شمع لئے ہوئے ہے مگر راستہ چل نہیں رہا ہے۔ اور جو شخص ہمیشہ عمل کی مشقت میں

رہے (یعنی بدون علم صحیح اور نیت صالح کے) وہ اس شخص کی طرح ہے جو راہ تو بہت قطع کرے مگر مقصد کو نہ پہنچے۔

مرتبہ اول (یعنی فضیلت علم کی پہلی شق کہ عمل کی صحت اس پر موقوف ہوتی ہے) یہ جہت فضیلت کی علماء دنیا کے اعتبار سے ہے جن کو علماء سو کہا جاتا ہے یعنی عالم بے عمل۔ اللہ تعالیٰ اس سے پناہ میں رکھے (مطلب یہ کہ جب یہ بات ہے کہ علم سے مقصود عمل کی تصحیح ہے تو اب وہ لوگ جو صرف علم حاصل ہو جانے کو کافی سمجھتے ہیں یہ سمجھ لیں کہ انہوں نے علم کو عمل نہ کرنے کی وجہ سے معلق اور بے کار رکھا جس سے ان کو کچھ نفع نہ ہوگا کیونکہ فائدہ علم کا تو عمل ہی تھا جس سے وہ بمراحل دور ہیں اور اس حالت میں تحصیل علم میں تعب برداشت کرنا اور پھر اس سے بالکل منتفع نہ ہونا بلاشبہ اس کا مصداق ہے' کما قال اللہ تعالیٰ مَثَلُ الَّذِينَ حُمِّلُوا التَّوْرَاةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا یعنی جو لوگ تورات کا علم حاصل کئے ہوئے ہیں اور اس کے احکام پر عمل نہیں کرتے ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جو اپنی پشت پر (مفید اور کار آمد) کتابوں کا بوجھ لادے ہوئے ہو' یعنی ایسی ایسی نافع چیز کو مشقت کے ساتھ لادے ہوئے ہے مگر اس کے فیض سے محروم ہے)

اور دوسرا مرتبہ (یعنی فضیلت علم کی یہ جہت کہ اس کا نفع متعدی ہوتا ہے اور عمل کا نفع لازم یعنی مخصوص ہوتا ہے عمل کرنے والے ہی کے ساتھ) یہ جہت فضیلت کی عابدوں اور زاہدوں کے اعتبار سے ہے یعنی ان کے سمجھنے اور غور کرنے کی بات ہے کیونکہ ان کا مقام باطل نہیں ناقص ہے یعنی کوئی شخص علم کی جانب توجہ نہ کرے اور اپنی تمامتر سعی زہد و عبادت کی تحصیل میں صرف کرے تو گو حق تعالیٰ کی معرفت کا باب اس پر نہ کھلے (کہ بے علم نتواں خدا را شناخت) تاہم اس کا علم نجات اخروی کا سبب اور موجب حصول نعیم جنت بن سکتا ہے۔ بشرطیکہ خدا کے لئے ہو اور کسی دنیوی غرض کی آمیزش اس میں نہ ہو کیونکہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو شخص آخرت کے عمل کے ساتھ دنیا طلب کرے تو وہ نہ دنیا پائیگا نہ دین۔

اور تیسرا مرتبہ (یعنی علم کی فضیلت کی یہ جہت کہ اس سے مقصود قلب کو حق تعالیٰ کی جانب سے پھیرنا ہوتا ہے۔ آدمی کو اس کی وجہ سے حق تعالیٰ کی معرفت اور محبت حاصل ہوتی ہے اور ان کے دیدار اور مشاہدہ میں سرشار رہتا ہے اور جیسا کہ کہا چکا ہے کہ علم کا یہ درجہ وسیلہ نہیں مقصود ہے' آلہ و ذریعہ نہیں بلکہ مطلوب ہے) یہ جہت فضیلت علم کی واصلین اور عارفین کے ساتھ مخصوص ہے۔ لیکن یہ بھی سمجھ لو کہ اس مرتبہ کا حصول اول کے دونوں مرتبوں کے بغیر متعذر (یعنی دشوار بھی) ہے۔ (یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ علم شرع نہ دار رکھو اور اس پر عمل بھی غائب ہو اور اس کے ساتھ ساتھ دعوئ حق تعالیٰ کی محبت اور معرفت کا چل جائے) ایسا دعویٰ عند الشرع غیر مقبول بلکہ

الحاد ہے۔ (اللہ تعالیٰ کا عارف اور مقبول عند اللہ ہونے کے لئے عمل بالشرع اور اتباع سنت لازم ہے)۔

(مپندار سعد کہ راہِ صفا
تواں رفت جزبر پئے مصطفیٰ)

(اے سعدی یہ نہ سمجھو کہ معرفت حق کی راہ بغیر سنت رسول ؐ کو اختیار کیے ہوئے طے ہو سکتی ہے)

یہاں تک جو ہم نے کلام کیا وہ عزلت کے منافع اور اس کی آفات کا بیان تھا۔ جب یہ تفصیل پیش نظر ہو گئی تو اب سمجھو کہ عزلت اور صحبت ان ہر دو میں سے کسی ایک کو دوسرے پر مطلقاً ترجیح دینا غلطی کی بات ہے۔ کیونکہ اختلاف اشخاص کی وجہ سے یہ ترجیح مختلف ہو سکتی ہے اس لئے کہ مدار ترجیح ان کے فوائد یا آفات کا مرتب ہونا ہے جو لوگوں کے اختلاف سے مختلف ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ جس شخص کو اس کے مخصوص حالات کی بنا پر عزلت اور تنہائی ہی میں فوائد نظر آویں وہ اسی کو اختیار کرے اس کے لئے وہی بہتر ہے۔ اور جس کو اس کے حالات کے اعتبار سے صحبت کی حاجت ہو وہ اسی کو اختیار کرے اس کے لئے وہی بہتر ہے۔ پس حق فیصلہ اس باب میں یہ ہے کہ اعتدال کی راہ چلے اور خود کو کسی ایک جانب (صحبت یا عزلت میں) تنہا نہ چھوڑ دے (یعنی ایسا اختلاط نہ اختیار کرے کہ عزلت گویا حرام ہی ہے یا ایسی عزلت نہ پکڑے کہ لوگوں سے ملنا یکسر ختم کر دے اور ضروریات کی تحصیل سے بھی خود کو محروم کر لے' ایسا نہ کرے بلکہ اعتدال اختیار کرے) کہ ہر چیز میں میانہ روی خوب ہے اور افراط و تفریط تو ہر امر میں مذموم ہے۔

فصل سوم

عزلت (یعنی گوشہ نشینی) کے آداب کے بیان میں

(ادب) عزلت اختیار کرنے والے کی نیت (اپنی گوشہ نشینی سے) سب سے پہلے یہ ہونی چاہیے کہ اپنے رذائل اور اخلاق بد کی اصلاح کرے گا۔ اس کے بعد یہ کہ شریروں کے شر سے اپنے کو محفوظ رکھے گا۔ اس کے بعد یہ کہ مسلمانوں اور پڑوسیوں کے حقوق کے باب میں تقصیر ہونے کی آفات سے خلاصی رہیگی۔ اور اس کے بعد یہ کہ تنہائی ہوگی تو سکون کے ساتھ اپنے مولیٰ تعالیٰ کی عبادت کر سکے گا۔ اور یہی غرض مقصود اصلی ہے۔ **(ادب)** اسی طرح سے عزلت نشین کو چاہیے کہ گوشہ نشینی کی حالت میں بھی علم و عمل پر مواظبت رکھے اور ذکر و فکر میں مشغول رہے

تاکہ عزلت کا ثمرہ اور اس کا پورا فائدہ نصیب ہو۔ اس لئے کہ عزلت اپنی ذات کے لحاظ سے تو تعطل اور بیکاری ہے جو کہ مردے کو اور سونے والے کو بھی حاصل ہوتی ہے مگر اس سے اس کو کیا نفع؟ کیونکہ مقصود اس سے عبادت ہے (پس جو خلوت عبادت سے عاری ہو وہ مانند مردے اور سوئے ہوئے کی خلوت کے ہے) (ادب) عزلت گزیں کو چاہیے کہ لوگوں کو اپنے ملنے اور اپنے پاس آنے جانے سے منع کردے کیونکہ اس ملنے جلنے سے تو عزلت کی غرض ہی فوت ہو جائیگی۔ (ادب) اسی طرح سے لوگوں کی خبریں اور ان کے حالات بھی نہ دریافت کرے۔ اور شہر کی افواہ اور عوام کی ہفوات کی جانب بھی کان نہ لگائے کہ یہ سب امور تخم وساوس اور خطرات کا بیج ہیں یعنی جس طرح سے تخم کو اگر زمین میں ڈالدیا جائے تو اس سے درخت اُگتا ہے اور شاخیں پھوٹتی ہیں اسی طرح سے ادھر ادھر کی خبروں کا سننا اور قلب میں ان کو جگہ دینا بھی بمنزلہ وساس اور خطرات کی تخم پاشی کے ہے۔ (جس کی وجہ سے قلب کا ناس ہو جانا اور سکون ودلجمی کا اس سے ختم ہو جانا ظاہر ہے۔) (ادب) عزلت گزیں کو لازم ہے کہ تھوڑی سی روزی پر قناعت کرے کیونکہ حریص آدمی کو خلوت میسر نہیں ہوتی اس لئے کہ وسعت رزق کی طلب اس کو مخلوق سے مخالطت پر مجبور کردیگی۔ (جس کے سبب یا تو خلوت ہی سے نکل جائیگا یا نہیں تو ہر وقت دل ہی دل میں ایک اسکیم سوچتا رہے گا ظاہر ہے کہ یہ بھی صحیح خلوت نہیں ہوگی۔

چو ہر ساعت از تو بجائے رود دل
بہ تنہائی اندر صفائے نہ بینی

یعنی جب ہر گھڑی تمہارا دل ادھر ادھر بانٹ رہیگا تو باوجو عزلت نشینی کے بھی تم اپنے قلب میں کچھ صفائی (نور) نہ پاسکو گے)

(ادب) نیز تنہائی اختیار کرنے والے پر لازم ہے کہ اپنے ہمسایوں کی ایذاء پر صبر کرے اور ان کی باتوں کی جانب کان نہ لگائے اس خیال سے کہ شاید اسی کا گلہ شکوہ کر رہے ہوں یا اس کی ہی غیبت اور برائی میں مشغول ہوں اور یہ سن لے تو خواہ مخواہ ان کی جانب سے دل برا ہو جاوے اور قلب میں عداوت پیدا ہو کر اس کے سکون کو فوت کردے۔ (ادب) ایک ادب یہ ہے کے اس کی عزلت نشینی کی لوگ تعریف کریں تو اس پر خوش نہ ہو اور عزلت کی برائی کریں تو ترک مخالطت پر رنجیدہ نہ ہو اور افسوس نہ کرے بلکہ اپنے کام میں لگا رہے یعنی آخرت کی راہ پر مستقیم رہے اور اپنے اوقات کو مختلف نیک کاموں میں تقسیم کردے۔ (یعنی ایک وقت مثلاً ذکر کا مقرر کرلے اور ایک وقت تلاوت کا اور ایک وقت مطالعہ کتب دینیہ کے لئے تاکہ تفنن رہے اور ہر کام میں دل لگے۔ (ادب) اور اس کو چاہیے کہ موافق طبع لوگ اور ہم نشین صالح پیدا کرے تاکہ ایک گھڑی ان کے ساتھ بھی بیٹھ کر راحت حاصل کرے اور اپنے سے کلال وملال کو دور کرسکے۔ اور (یہ صرف

اس لئے تاکہ آئندہ اس کو طاعت اور عبادت میں جدید نشاط حاصل ہو جائے لہٰذا اس میں بھی زیادتی نہ کرے اس لئے کہ) مدار کار عزلت کا دنیا سے انقطاع اور دنیوی چیزوں سے بے تعلقی ہی پر ہے۔ (ادب) اور دنیا کے فانی ہونے کو ہمیشہ پیش نظر رکھے اور طول امل (یعنی لمبی چوڑی آرزوؤں سے باز رہے۔ بلکہ دنیا کو تو ایسی ناپائیدار جانے کہ اگر رات کرے تو تو صبح کی امید نہ رکھے اور صبح کرے تو شام کا انتظار نہ کرے اور یہ اس لئے کہ ایک دو روز کی سختی پر صبر کر لینا آسان ہے اور اگر اپنی عمر بیس تیس سال فرض کر لیگا تو سختی پر صبر کرنا مشکل ہو جائے گا۔ (ادب) عزلت اختیار کرنے والے کو چاہیے کہ ہمیشہ موت کے لئے تیار رہے بلکہ اس کا منتظر رہے جس طرح سے کہ ایک مسافر ہوتا ہے کہ ہر چند وہ کہیں قیام بھی کر لے تاہم ہر وقت وہاں سے کوچ اور روانگی ہی اس کے پیش نظر رہتی ہے۔ (ادب) آخرت کے بقا اور دوام کو مستحضر رکھے اور یہ یقین رکھے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ کے راستہ میں موت آجائے گی وہ ہمیشہ زندہ ہی رہیگا۔ یہ مضمون آیت قرآنی سے ثابت ہے (مترجم عرض کرتا ہے کہ شاید وہ آیت یہ ہو وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَكِنْ لَا تَشْعُرُونَ (جو لوگ کہ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں قتل ہوں ان کو مردہ نہ جانو وہ زندہ ہیں مگر تم کو اسکا شعور نہیں ہے)

بہرحال اگر اللہ تعالیٰ کی توفیق رفیق ہو تو ہر منزل آسان ہے ورنہ سب مشکل ہے وما توفیقی الا باللہ۔

باب ششم

سفر کے آداب کا بیان۔ اور اس میں دو فصلیں ہیں

فصل اوّل

سفر کی نیت اور اس کے فوائد کے بیان میں

جانو کہ سفر کی دو قسمیں ہیں ایک تو سفر ظاہر جو اس کو کہتے ہیں کہ آدمی اپنا وطن ترک کر کے مثلاً کہیں چلا جائے اور جنگل، پہاڑ، بیابان وغیرہ طے کرے۔ دوسرا سفر باطن ہے جو اسے کہتے ہیں کہ قلب طبیعت کی زمین کی پستی سے نکل کر یعنی اپنے اخلاق کو شائستہ بنا کر اور اپنی فکر کا تصفیہ کر کے روحانیت کے آسمانوں کے ملکوت کی سیر کرے۔ اور اس سفر کی تفصیلات ان لوگوں سے معلوم کرنا چاہئے جو عالم قلب کے راہرو ہیں۔ اور سفر ظاہر اگر ذریعہ اور وسیلہ اس سفر باطن کا ہو تو وہ بھی محمود ہے ورنہ لغو اور بے سود ہے کیونکہ (بزرگوں کا مقولہ ہے کہ) مَنْ حُرِمَ عَنِ السَّفَرِ الْبَاطِنِ

اُبْتُلِیَ بِالسَّفَرِ الظَّاہِرِ یعنی جو شخص سفر باطن سے محروم کیا جاتا ہے وہ سفر ظاہر میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔ یہاں ہمارا مقصود سفر ظاہری ہی کے آداب کا بیان کرنا ہے اس طرح پر کہ وہ سفر باطن کا وسیلہ ہو جائے۔

جان لو کہ سفر ایک حرکت اختیاری کا نام ہے اور فعل اختیاری بدون کسی باعث اور غرض کے نہیں ہوا کرتا۔ پس سفر کا باعث کبھی تو کسی شے کا طلب کرنا ہوتا ہے اور کبھی کسی شے سے بچنا اور بھاگنا ہوتا ہے پھر وہ شے مطلوب کبھی تو دنیوی ہوتی ہے جیسے مال وجاہ وغیرہ اور کبھی دینی ہوتی ہے پھر دینی ہونے کی صورت میں کبھی تو علم کے قبیل سے ہوتی ہے اور کبھی عمل کے قبیل سے۔ اور علم ہونے کی صورت میں کبھی تو علوم دینی میں سے کوئی علم ہوتا ہے یا اپنے اخلاق وصفات کا علم ہوتا ہے جو بطور تجربہ کے انسان کو حاصل ہوتا ہے۔ یا اللہ تعالیٰ کی آثار قدرت اور زمین میں جو عجائبات ہیں ان کا علم ہوتا ہے (یعنی اس کی تحصیل کے لئے سفر کیا ہوگا) جیسے حضرت ذوالقرنین کا سفر روئے زمین میں۔ اور اگر وہ مطلوب عمل کے قبیل سے ہو تو یا تو عبادت کی قسم سے ہوتا ہے یا زیارت کے قبیل سے۔ عبادت کی مثال جیسے حج عمرہ اور جہاد وغیرہ اور زیارت کے قبیل سے ہونے کی صورت میں یا تو اس سے مقصود کسی جگہ اور مکان کی زیارت ہوگی' جیسے مکہ معظمہ' مدینہ منورہ یا بیت المقدس وغیرہ۔ یا کسی شیخ کی زیارت مقصود ہوگی' مثلاً اولیاء اور علماء میں سے کسی کی زیارت۔ خواہ وہ زندہ اور موجود ہوں یا دنیا سے تشریف لیجا چکے ہوں (اور حاضری ان کے مشاہد پر ہو) یہ سب قسمیں تو مطلوب کی ہوئیں۔

اور جس امر سے بھاگتا ہے (اور اس لئے اس کو سفر درپیش آیا) تو یا تو وہ ایسی چیز ہے جس کا ضرر اور نقصان بدن سے متعلق ہے خواہ وہ سب ہی لوگوں کے لئے عام ہو جیسے کوئی وبا یا قحط وغیرہ یا (اس کے لئے) خاص ہو مثلاً دشمنوں اور حاسدوں کی ایذاء رسانی کا اندیشہ کر رہا ہے۔ اور یا ایسا امر ہے کہ اس کا ضرر اور نقصان دینی ہے۔ مثلاً جاہ سے مال سے اس لئے بھاگنا چاہتا ہے کہ یہ رذائل اس کو خدا سے دور کر دیں گے یا لوگوں سے اس لئے کنارہ کشی اختیار کرنا چاہتا ہے کہ اس مقام پر اس کو عبادت میں سکون، حاصل کرنے والی تنہائی میسر نہیں۔ یا مجلس دعوت سے اس لئے اٹھ کر جانا چاہتا ہے وہاں بدعت، یا کوئی امر منکر موجود ہے (اور اس کے ازالہ پر یہ قادر نہیں ہے اس لئے خود ہی وہاں سے ہٹا جاتا ہے) (یہ تمام قسمیں مہروب عنہ کے اعتبار سے ہوئیں) حاصل یہ کہ سفر کی کل چار قسمیں ہیں۔

قسم اول۔ طلب علم کے لئے سفر کرنا اور یہ سفر یا تو واجب ہوگا یا نفل یعنی جیسا مطلوب ہوگا اور اگر وہ علم نفل ہے تو سفر بھی نفل ہوگا۔

پھر علم یا تو امور دینیہ اور اخلاق شرعیہ کا علم ہوگا یا اخلاق وصفات محمودہ یا مذمومہ کا علم ہوگا

یا زمین میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں کا علم ہوگا۔ حدیث شریف میں ہے کہ جو شخص گھر سے باہر نکلے علم طلب کرنے کے لئے تو وہ راہ خدا میں رہتا ہے جب تک کہ وہ مکان واپس نہ پہنچ جائے۔ اور یہ بھی فرمایا ہے کہ جو شخص علم حاصل کرنے کے لئے کوئی راستہ طے کریگا تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کی راہ آسان فرمادیں گے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ علم (دین) کو طلب کرو اگرچہ وہ چین میں ہو۔ اسی لئے اسلاف رحمہم اللہ تعالیٰ دور دراز کا راستہ صرف ایک ایک حدیث سننے کے لئے طے کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت جابر بن عبداللہؓ دس صحابہؓ کے ہمراہ مدینہ شریف سے مصر تشریف لے گئے۔ محض ایک حدیث خود حضرت عبداللہ بن اُنیس کی زبان سے سننے کے لئے حالانکہ یہ حدیث ان میں عبداللہ بن اُنیس سے بواسطہ دوسروں کے پہنچ چکی تھی۔

اسی طرح سے اکثر علماء نے تحصیل علم کے لئے سفر اختیار کیا ہے اور صعوبتیں برداشت کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ انکو اپنی رحمتوں سے نوازے۔ نیز علم اخلاق اور صفات نفس کا جاننا بھی ضروریات دین سے ہے اس لئے کہ آخرت کی راہ کا طے کرنا بدون تحسین صفات اور آراستگی اخلاق کے مشکل ہے کیونکہ بد اخلاق شخص کو باطن کی صفائی نصیب ہی نہیں ہو سکتی اور اخلاق کا تجربہ اور نفس کی صفات کا اندازہ اکثر سفر ہی میں ہوتا ہے اس لیے کہ وطن میں تو نفس اپنی طبیعت کے موافق امور سے انس حاصل کئے ہوتا ہے اور اپنی عادت کے مطابق جو چیزیں ہیں ان سے معتاد اور ان کا خوگر رہتا ہے جس کی وجہ سے اس کی باطنی خباثت ظاہر نہیں ہوپاتی اور سفر چونکہ محنت اور شدت کا محل ہوتا ہے اور عادت و طبیعت کے مطابق سب امور وہاں نفس کو حاصل نہیں ہوتے لہٰذا اس وقت اس کی خباثت، شرارت اور عیوب کا ظہور ہو جاتا ہے۔ اور اب اسکا علاج کرنا بھی ممکن اور آسان ہو جاتا ہے کیونکہ علاج کے لئے پہلے مرض کا ظاہر ہونا ضروری ہے۔ ورنہ تو جب بیماری ہی کا علم نہ ہوگا تو آدمی آخر علاج کس مرض کا کریگا۔ (جیسا کہ امراض ظاہری میں بھی مشاہد ہے کہ تجویز نسخہ سے پہلے تشخیص مرض کا ہونا ضروری ہوا کرتا ہے) اور اس کی تحقیق مخالطت کے فوائد کے بیان میں گزر چکی ہے۔ اور سفر بھی ایک قسم کی مخالطت ہی ہے اور مشقت اور ضرر جو اس میں پیش آتے ہیں وہ مزید برآں۔

اسی طرح سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کی ان نشانیوں کا علم بھی (جو کہ زمین میں پھیلی ہوئی ہیں) بصیرت اور یقین حاصل ہونے کا سبب بنتا ہے کیونکہ موجودات میں سے کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کے کمال صنعت اور عجیب قدرت اور احاطہ علم پر دلالت نہ کرتی ہو۔ باقی اس چیز کو حضرات اہل دل جن کی جان کے کان کھلے ہوتے ہیں اور اس کے ذریعہ سے زبان حال سے کہی ہوئی باتیں بھی سمجھ لیتے ہیں، وہی حضرات خوب جانتے ہیں (وقیل فی ہذا المعنی۔

برگ درختاں سبز در نظر ہوشیار
سر ورقے دفتریست معرفت کردگار

مرد ہوشیار یعنی مرد عارف اور اہل دل کی نظر میں یہ درختوں کے سبز پتوں میں سے ہر پتہ حق تعالٰی کی معرفت کا ایک ورق بلکہ ایک دفتر ہے۔)

اس مرتبہ کے حصول کے بعد انسان کا وطن میں رہنا یا سفر کرنا دونوں برابر ہو جاتا ہے۔ اور اس کے لئے آنکھوں کا کھولنا اور بند کرنا ہر دو یکساں ہو جاتا ہے کیونکہ وہ ہمیشہ سفر میں رہتا ہے۔ (اسی مقام سے فرمایا گیا ہے۔

وسعت دل کی کیا کرتے ہیں سیر اے امدادؔ
کہ یہی باغ ہے اپنا یہی میداں اپنا

اور۔

الٹی ہی چال چلتے ہیں دیوانگان عشق
آنکھوں کو بند کرتے ہیں دیدار کے لئے

اور اس راہ کی کیفیت طریق آخرت کے سالک ہی جانتے ہیں (جو کہ سچے لوگ ہیں لہٰذا دوسروں کو ان کی تصدیق لازم ہے (جَعَلَنَا اللّٰہُ تَعَالٰی مِنْھُمْ وَرَزَقَنَا مِنْ ذَوْقِہٖ شَیْئًا (یہ تمامتر تفصیل تو سفر کی چاروں قسموں میں سے قسم اول کی تھی۔ بہرحال دوسرے سفر کا بیان یہ ہے)

قسم دوم عبادت کے لئے سفر کرنا، مثلاً حج یا جہاد کے لئے جانا، اور انبیاءؑ، اولیاء اور علماء کی مشاہد کی زیارت کے لئے سفر کرنا بھی اسی قبیل سے ہے یعنی زندگی کی حالت میں جس کی زیارت سے برکت حاصل کرتے رہے ہوں اب اس کے دنیا سے چلے جانے کے بعد اس کے مشہد کی زیارت کر کے برکت حاصل کرنا چاہیں تو یہ امران کے درجات اور مراتب کے اختلاف کی رو سے مختلف حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زندوں کی زیارت مردہ لوگوں (کی قبر) کی زیارت سے بہتر ہے کہ یہاں فائدہ حاصل ہونے کی زیادہ امید ہے۔ نیز علماء اور صلحا کے چہرہ کی زیارت خود ایک اطاعت ہے۔ اور مسلمان بھائی کی ملاقات کی فضیلت کا دوستی کے آداب میں بیان ہو ہی چکا ہے وہ بھی یہاں حاصل ہوگی۔

بیت المقدس کی زیارت کرنے کے بہت فضائل ہیں اور اس کا بے شمار ثواب آیا ہے اس لئے کہ حضرت سلیمان علٰی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت رب العزت سے درخواست کی تھی کہ جو شخص اس مسجد یعنی بیت المقدس میں آوے تو یا اللہ آپ اس پر لطف و کرم کی نظر فرمائیگا اور گناہوں سے اس طرح سے اس کو پاک وصاف کر دیجئے گا جیسے ابھی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہو۔ اور بار الٰہا اس آنے والے کی دعا کو قبول فرمایئے گا۔

قسم سوم دین میں تشویش پیدا کرنے والے امور سے بھاگنے کے لئے سفر کرنا یہ انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے۔ چنانچہ منجملہ ان امور کے جن سے کہ بھاگنا واجب ہے امارت و حکومت، مال وجاہ کی قید و اسارت اور اسباب وعلائق کی کثرت بھی ہے کہ یہ سب چیزیں باعث تشویش خاطر اور سبب تشتت قلب ہوتی ہیں۔ اور دین کا تمام اور اس کا کمال بدون فراغت قلبی کے اور قطع علائق کے بہت مشکل ہے اگرچہ تعلقات ضروریہ اور حاجات لابدی سے قلب کی فراغت بھی ناممکن ہے تاہم ان کا کم کرنا اور ان میں تخفیف کرنی تو ممکن ہی ہے۔ اور دین اور طاعت میں آدمی کا لگنا بقدر اس کی سبکباری ہی کے ہو سکتا ہے چنانچہ جو شخص دنیا میں زیادہ سبکبار ہے وہ دین میں بھی زیادہ تیز رفتار ہے۔ اور جب کسی شخص کو ریاضت ومجاہدہ اور تہذیب اخلاق کی بعد اس طرح سے فراغت قلبی نصیب ہو جائے کہ پھر اس کو کوئی شے حق تعالیٰ کے ملاحظہ اور مشاہدہ سے مانع نہ ہو تو ایسے شخص کے لئے البتہ اسباب کا پاس ہونا موجب تشویش قلب نہ ہوگا۔ مگر اس مرتبہ کا حصول مخصوص ہے۔ انبیاءؑ اور اولیاءؒ کے ساتھ عوام کو یہ مرتبہ حاصل نہیں پس ان میں اور عوام میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ (انبیاء اور اولیاء کے قلوب قوی ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے شواغل کا تحمل فرما لیتے ہیں۔ اور عوام کے قلب میں ویسی قوت نہیں ہوتی ذرا سی تشویش میں ادھر سے ادھر ہو جاتے ہیں۔)

اور شواغل کے اٹھانے میں ان دو جماعتوں میں جو تفاوت ہے اس کی مثال ایسی ہی سمجھو جیسے ظاہری بوجھ کے اٹھانے میں بدن کی قوت میں تفاوت ہوتا ہے۔ یعنی نحیف اور ضعیف آدمی تھوڑا بوجھ اٹھاتا ہے بوجھ زیادہ ہو تو عاجز ہو جاتا ہے۔ اور قوی و تندرست آدمی زیادہ بوجھ اٹھا سکتا ہے۔ یہی حال قلب کی قوت وہمت کا ہے دوں ہمت تھوڑے سے شغل کا بھی تحمل نہیں کر سکتا اور گھبرا جاتا ہے اور عالی ہمت قوی القلب لوگ بہت بہت شغلوں کے متحمل ہو جاتے ہیں اور ذرا نہیں گھبراتے اور ان کے استقامت اور حضور مع اللہ میں بالکل فرق نہیں آتا۔

اور جس طرح سے کہ کثرت تکرار اور تھوڑی تھوڑی عادت ڈالنی ظاہری قوت کی اضافہ میں معین ہے۔ اسی طرح سے مجاہدہ وریاضت قوت باطنی اور ہمت قلبی کے بڑھانے میں بھی دخل کامل رکھتا ہے۔

اور سفر اس لئے اختیار کرنا کہ خود کو آفات اور فتنوں سے بچائے یہ طریقہ اسلاف کا رہا ہے چنانچہ حضرت سفیان ثوریؒ نے فرمایا کہ یہ ایسا زمانہ ہے کہ آدمی کے لئے مناسب ہے کہ ہر روز کسی نئے شہر میں جا کر رہے (یعنی آج یہاں تو کل وہاں) اور خاص کر جہاں مشہور ہو جائے وہاں سے تو چل ہی دے۔ اس لئے کہ مشہور ہونے کے بعد نمبر مفتون ہی ہونے کا ہے) چنانچہ حضرت ابراہیم خواص رحمۃ اللہ علیہ کسی شہر میں چالیس دن سے زیادہ قیام نہ فرماتے تھے۔

قسم چہارم ان امور سے بچنے کے لئے سفر کرنا جو مثلاً بدن کے لئے مضر ہوں۔ جیسے وباء یا مال

کے لئے نقصان دہ ہوں جیسے قحط اور گرانی۔ چنانچہ غلہ کی گرانی کی وجہ سے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا، اور سفر کرنا اس نیت سے کہ وہاں دل جمعی اور عبادت کے لئے فراغت قلبی میسر ہوگی، جائز ہے۔

حضرت سفیان ثوریؒ کو کسی نے دیکھا کہ ہاتھ میں پانی کا مشکیزہ اور پشت پر غلہ (وسامان وغیرہ) کی گٹھری لئے ہوئے چلے جا رہے ہیں پوچھا کہ اے ابو عبداللہ کہاں تشریف لئے جا رہے ہیں فرمایا کہ میں نے سنا ہے کہ فلاں گاؤں میں غلہ ارزاں ہے لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ وہیں جا کر رہوں۔ اس نے پوچھا کہ کیا ہم بھی اسی طرح کریں؟ فرمایا کہ ہاں تم بھی کر سکتے ہو، جب تم یہ سنو کہ کسی جگہ ارزانی ہے تو وہیں سکونت اختیار کرو کیونکہ سلامتی اور دل جمعی اسی میں ہے۔ اور اسباب کے ساتھ تعلق رکھنا یہ توکل کے منافی نہیں ہے (یعنی توکل ترک اسباب کا نام نہیں ہے بلکہ اسباب پر نظر نہ ہونے کا نام ہے) باقی وبا وغیرہ کے خوف سے سفر کرنا یہ جائز نہیں ہے حدیث شریف میں آتا ہے کہ یہ وباء ایک مرض ہے جو پچھلی امتوں پر بطور عذاب کے آیا تھا پھر اس کے بعد یہ باقی رہ گیا۔ چنانچہ کبھی کبھی آجاتا ہے پھر چلا جاتا ہے۔ پس جو شخص کسی بستی میں اس کے ہونے کی خبر سنے تو چاہئے کہ وہاں نہ جائے اور اگر اس جگہ پہلے سے ہے تو وہاں سے بھاگے نہیں بلکہ وہیں رہے اور صبر سے کام لے (بھاگنا اس لئے بھی منع ہے واللہ تعالیٰ اعلم کہ اس میں دوسروں کے لئے ایحاش ہے یعنی اس کے بھاگ جانے کی وجہ سے جو لوگ دوسری جگہ جانے پر قادر نہیں ہیں وہ بڑی ضیق میں مبتلا ہو جائیں گے اور رنج کریں گے کہ کاش ہمارا بھی کوئی ٹھکانا ہوتا یا ہم بھی ذی وسعت ہوتے تو ہم بھی یہاں سے چلے جاتے۔ اس طور پر گویا وہ دوہری مصیبت میں گرفتار ہو جائیں گے۔ طاعون اور بے بسی ظاہر ہے کہ یہ کس قدر رحم اور انسانیت کے خلاف بات ہے کہ ہماری وجہ سے ہمارا بھائی اس طرح سے گھٹے۔ اس لئے انسانیت کے ناطے اور صلہ رحمی کی خاطر شریعت نے اس بستی سے بھاگنے کو منع کر دیا ہے۔ رہی موت تو وہ ایک امر مقدر ہے، جس کا وقت مقرر ہے نہ اپنے وقت سے پہلے آئے گی اور نہ آجانے پر بروج مشیدہ بھی اس کی گرفت سے کسی کو بچا سکتا ہے۔)

نیز حدیث شریف میں یہ بھی آیا ہے کہ طاعون ایک وبائی مرض ہے جس طرح سے کہ اونٹ میں غدہ کی بیماری جو اس کے منہ میں نکلتا ہے (اور اس کے موت کا سبب بن جاتا ہے) جو مسلمان اس کی وجہ سے مرے وہ شہید ہے۔ اور جو کوئی ایسے وقت میں اس بستی میں ٹھہرا رہے وہ (ثواب میں) اس شخص کے مانند ہے جو خدا کی راہ میں جہاد کرے۔ اور جو شخص وبا کی وجہ سے وہاں سے بھاگے وہ ایسا ہے گویا جہاد سے بھاگا۔ حاصل یہ کہ وبا کی جگہ سے بھاگنا بھی منع ہے اور وہاں جانا بھی منع ہے۔ سفر کے منافع کا بیان ختم ہوا۔

اسی سے سفر کی نیت کا حال بھی معلوم ہو گیا کہ اگر سفر سے کسی نیک کام کی نیت کی ہے تو وہ سفر

بھی موجب ثواب ہے ورنہ لغو اور بیکار ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ سفر کئی قسم کا ہوتا ہے اچھا برا اور مباح اچھا سفر وہ ہے جو آخرت کے کسی کام کے لئے کیا گیا ہو مثلاً تحصیل علم (دین) وغیرہ کے لئے۔ اور اگر کسی ایسی دنیوی ضرورت کی خاطر سفر کرے جس کا حصول معیشت کے لئے ناگزیر ہے تو وہ اعمال آخرت ہی میں سے شمار ہے البتہ قدر ضرورت سے زیادہ حاصل کرنا دنیا کے قبیل سے سمجھا جائیگا (اس کے لئے جو سفر ہوگا وہ اس حکم سے خارج ہوگا) باقی مدار اس کا نیت پر ہے۔ پس مال کا حاصل کرنا تقوی علیٰ العبادت کے لئے اور اس غرض کے لئے کہ فقرا کی خبر گیری کرے گا آخرت ہی کا عمل ہوگا اگرچہ حاجت اور ضرورت سے زائد ہی ہو۔ اسی طرح حج کے لئے محض نام آوری اور شہرت کے لئے جانا دنیا ہے۔ اور یہ سمجھ لو کہ نیت کا اعتبار واجبات اور مباحات میں ہے حرام میں نہیں ہے۔ (یعنی امر واجب اور مباح اگر حسن نیت کے ساتھ ادا کئے جائیں گے تو حسن ہونگے ان پر ثواب ملے گا اور اگر نیت خراب ہوگی تو یہ چیزیں بھی خراب ہو جائینگی اور آخرت میں سب عتاب بن جائیں گی۔

کلید در دوزخ است آں نماز
کہ در چشم مردم گزاری دراز

لیکن جو چیزیں کہ حرام ہیں وہ بہر حال قبیح ہی رہیں گی اچھی نیت کر لینے سے بھی ان میں ثواب کبھی نہ ہو گا۔ مثلاً ڈاکہ میں یہ نیت کرے کہ غریب و مسکین کی امداد کرے گا یہ کچھ نہیں ہے اسی کو آگے فرماتے ہیں) اور فعل حرام کا ارتکاب جائز نہیں ہے مثلاً حج یا تجارت کے لئے نکلا تو اس میں اچھی ہی نیت معتبر ہوگی اور اگر ڈاکہ وغیرہ کے لئے سفر کیا اور اس میں یہ کہتا ہے کہ میری نیت یہ ہے کہ فقراء غرباء پر مال تقسیم کرونگا تو یہ نیت چونکہ ایک فعل حرام میں کی گئی ہے اس لئے معتبر نہ ہوگی۔ ایسا کام ہر گز نہ کرنا چاہئے۔

(ادب) ہمیشہ سیر و سیاحت ہی میں رہنا قلب میں تشویش کا موجب ہوتا ہے مگر اقویا یعنی کاملین اس سے مستثنیٰ ہیں۔ باقی اکثر سیاح بیکار گداگر ہوتے ہیں۔ یوں اس کے فائدوں میں سے ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے دلگیری دفع ہوتی ہے یعنے قلب میں ضیق اور گھٹن ہو تو سفر سے وہ مبدل بانشراح ہو جاتی ہے۔ پھر سفر کے نیک ارادوں میں بھی مناسب ہے کہ ارادہ طالب علم دین یا بزرگوں اور دینداروں کی زیارت کرنا ہو تا کہ دل کی آنکھ کھلے، عمل و فکر کا ذریعہ ہاتھ لگے۔ اور جب اللہ تعالیٰ کسی کے لئے یہ امور مقدر فرمادیں تو پھر اس کے لئے اقامت ہی بہتر ہے۔ یعنی اپنے وطن میں یا کسی ایک جگہ سکونت اختیار کرے (اور سکون کے ساتھ دین کے کام میں لگے اور اللہ کے بندوں کو نیک راہ بتائے)۔

○☆○

فصل دوم

مسافرت کے آداب کا بیان

(ادب) جب سفر کا ارادہ ہو تو چاہئے کہ اہل حقوق کے حقوق اور قرض خواہوں کا قرض ادا کرے اور اگر لوگوں کی امانتیں اس کے پاس رکھی ہوں تو ان کو واپس کرے اور زمانۂ سفر بھر کے لئے بیوی بچوں کا نفقہ فراہم کردے۔ اور اپنے لئے خرچہ سفر اور اپنے لئے زادراہ حلال طیّب مال سے ہمراہ لے۔ اور مناسب ہے کہ سفر کا خرچہ اس قدر پاس رکھے کہ رفقاء پر بھی فراخی کر سکے (یعنی بالکل نپا تُلا نہ لے کہ خرچ کرتے وقت کاٹ کپٹ کرنا پڑے کہ یہ آئین رفاقت کے خلاف ہے)۔

(ادب) چاہئے کہ سفر میں خوب خوش خلق رہے اور اخلاق نیک ظاہر کرے یعنی لوگوں کے ساتھ برتے۔ کیونکہ آدمی کے اخلاق کا پورا تجربہ سفر ہی میں ہوتا ہے۔ چنانچہ جو شخص سفر میں دوستی میں ثابت قدم رہا اور پورا اترا اور وہاں قابل صحبت ثابت ہوا وہ وطن میں بدرجہ اولیٰ ان امور کا اہل رہے گا۔ دیکھا جاتا ہے کہ بہت سے آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ وطن میں تو بہت راضی اور خوش رہتے ہیں لیکن سفر میں بالکل بدل جاتے ہیں یعنی نہایت ترش رو ثابت ہوتے ہیں۔ وجہ یہ ہوتی ہے کہ سفر مصائب اور حوادث کا مقام ہوتا ہے اور اس حالت میں ان امور کا تحمل نہایت دشوار ہوتا ہے لامحالہ آدمی میں تُنک مزاجی اور جھنجلاہٹ آجاتی ہے۔ اسی لئے علما نے فرمایا ہے کہ تین آدمیوں سے سختی کے ساتھ کلام نہ کرنا چاہئے۔ ایک تو روزہ دار سے۔ دوسرے بیمار سے تیسرے مسافر سے (کہ ذرا سا خلاف مزاج ہونے پر انھیں بہت غصہ آجاتا ہے)

(ادب) ایک مسافر کا اعلیٰ خلق یہ ہے کہ (جس آدمی یا جانور کو) کرایہ پر کیا ہے اس کے ساتھ سلوک اور احسان کرے اور اپنے ساتھیوں کے حق میں معین و مددگار ثابت ہو یعنی یار شاطر رہے بار خاطر نہ بنے۔ پھر اعانت خواہ سواری کے سلسلہ میں ہو یا کھانے پینے کی چیزوں سے ہو یا اور کسی طریقہ سے ہو غرض ہر ممکن طریقہ سے مدد کرے اور موقع کا متلاشی رہے اور کبھی کبھی خوش طبعی کی باتیں بھی کرکے انکا دل خوش کیا کرے لیکن اس میں اسکا لحاظ رکھے کہ حد سے تجاوز نہ ہو یعنی خوش طبعی کے اندر فحش اور گناہ کی باتیں نہ آنے پائیں بلکہ مباح ہی تک محدود رہے۔ اور خوش طبعی کو اس لئے کہا کہ اسکی وجہ سے دلی وحشت اور قلبی گرانی دور ہو کر غم غلط اور طبیعت منشرح ہوجاتی ہے اور ذہنی تکان دور ہو کر دماغ از سرنو تازہ ہوجاتا ہے جسکی ضرورت ہر کام میں ظاہر ہے۔

اسیطرح سے منجملہ آداب سفر کے یہ ہے کہ سب سے پہلے رفیق سفر تلاش کرے تنہا سفر نہ کرے کہ اس میں تکلیف اور پریشانی کا مظنّہ ہے اس لئے بزرگوں نے کہا ہے کہ اَلرَّفِیْقُ ثُمَّ الطَّرِیْقُ یعنی پہلے رفیق تلاش کرو پھر طریق۔ (یعنی سفر کا ارادہ کرو) لیکن چاہئے کہ وہ رفیق ایسا ہو جو اسکی مدد دین میں کرسکتا ہو یعنی کوئی بات بھول جائے تو یہ اس کو یاد دلادے اور اگر یاد ہو تو اسکو بروئے کار لانے میں اسکی مدد کرے۔ مشہور ہے کہ المرءُ علٰی دِیْنِ خَلِیْلِہٖ انسان اپنے دوست کے طریقہ پر ہوتا ہے یعنی اگر رفیق دیندار ہوگا تو یہ بھی اسکی صحبت کی وجہ سے دیندار ہوجائے گا اور حقیقی دوست تو وہی ہے جو دین میں معین اور خیر خواہ ہو۔ حدیث شریف میں تنہا سفر کرنے سے ممانعت آئی ہے اور کم سے کم جماعت سفر کے لئے تین آدمی ہونے چاہئیں اور اگر چار ہوں تو بہتر ہے۔ کیونکہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ خَیْرُ الْاَصْحَابِ اَرْبَعَۃٌ اور وجہ اسکی یہ ہے کہ اگر تین ہی آدمی ہوئے اور دو کسی ضرورت سے مثلاً کھانا وانا لینے چلے گئے تو ایک شخص تنہا گھبرائے گا کیونکہ سفر وحشت اور مشقت کی جگہ ہوتی ہے۔ اور اگر اس کام کو پورا کرنے کے لئے ایک آدمی جائے گا تو وہ پریشان ہوگا کیونکہ تحصیل ضرورت اور اجنبیوں سے معاملہ نئی جگہ مسافر کو دشوار ہوا کرتا ہے۔ دو ہوں گے تو باہم صلاح و مشورہ سے کام کرلیں گے اور قوت بھی رہے گی ایک شخص دلگیر ہوگا اسلئے چار کا ہونا بہتر ہے کہ دو کہیں کام سے جاویں تو دو جائے اقامت پر رہ کر باہم بولیں باتیں کریں۔ اور چار سے زیادہ چونکہ ضرورت سے زیادہ ہے اس لئے نہیں ہونا چاہئے۔ اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ سفر میں جو شخص کام اور ضرورت سے غافل ہوجاتا ہے اسکی جانب توجہ کم ہوجاتی ہے اور اسکا اہتمام بھی نہیں رہ جاتا۔

(ادب) چاہئے کہ بوقت سفر اپنے میں سے ایک شخص کو امیر بنالے اسکی وجہ سے دوئی کا ضرر ختم ہوجائے گا جیسا کہ آگے آتا ہے کہ اَلسَّلَامَۃُ فِی الْوَحْدَۃِ وَالْاٰفَاتُ فِی الْاِثْنَیْنِ (یعنی تنہائی میں سلامتی ہے اور دو ہونے میں آفت ہے اور جب ایک شخص امیر ہوگیا تو کل اختیارات اسی کی طرف لوٹے پس گویا وحدت ہی رہی پھر امیر بنانے میں ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ منزل اختیار کرنے میں راستہ متعین کرنے میں اور دیگر ضروریات سفر کے تجویز کرنے میں لوگوں کی رائے مختلف ہوسکتی ہے اس لئے کہ عقل اور فہم میں تفاوت ہوتا ہے اب اگر حاکم اور امیر کوئی شخص نہ ہوگا تو باہم اختلاف اور نزاع واقع ہوجائے گا اور امور انتظامیہ میں خلل واقع ہوگا اور امیر کے ہونے کے سبب سے سارا اختلاف و نزاع ختم ہوجائیگا۔ **(ادب)** مناسب ہے کہ امیر ایسے شخص کو بنائیں جو ایک جانب خوش اخلاق اور نرم مزاج ہو اور دوسری جانب عاقل اور تجربہ کار ہو اور سلوک و احسان کرنے میں راغب اور ایثار پیشہ ہو (اور ایثار کے معنی یہ ہیں کہ اپنی حاجت پر دوسروں کو مقدم رکھنے والا ہو)۔ حضرت عبداللہ مروزی فرماتے ہیں کہ میں نے ابو علی کی ایک سفر

میں ہمراہی اختیار کی۔ ابو علی نے مجھ سے کہا کہ اے عبداللہ تم امیر سفر بنو گے یا میں بنوں۔ میں نے کہا کہ آپ ہی امیر ہیں یہ سنکر ابو علی بولے مجھے امیر بناتے تو ہو مگر جانتے بھی ہو کہ امیر کے کیا حقوق ہیں اس کے حکم کی اطاعت اور اس کے امر کی فرمانبرداری لازم ہوا کرتی ہے تم پر بھی لازم ہو جائیگی ۔میں نے کہا انشاء اللہ تعالے آپ مجھے ایسا ہی پائیں گے یعنی مطیع و منقاد۔ اس کے بعد سے ابو علی نے یہ کیا کہ ہمارا اور اپنا سارا اسباب خود ہی اٹھاتے لادتے اور ہر قسم کی خدمت خود ہی کرتے اور مجھے کوئی کام نہ کرنے دیتے۔ ایک شب بارش ہونے لگی تو آپ ساری رات میرے سر پر چادر تانے کھڑے رہے میں نے یہ دیکھ کر کہا اللہ اللہ۔ ارے بندہ خدا مجھے بھی تو کچھ خدمت کرنے دو۔ کہا کہ میں نے تم سے پہلے ہی نہ کہہ دیا تھا کہ امیر بنایا ہے تو میری اطاعت کرنا، مجھ سے کسی معاملہ میں مزاحمت نہ کرنا۔ ان کے اس جواب سے مجھے ان کو امیر بنانے کی شرمندگی سارے سفر رہی یہی پچھتاوا رہا کہ کاش اس وقت میں ان کو امیر نہ بنائے ہوتا یہ تو میں ان کو امیر بنا کر پھنس گیا۔

(ادب) منجملہ آداب کے ایک یہ ہے کہ اپنے رفیقوں، عزیزوں اور دوستوں کو رخصت کرے یعنی روانگی کے وقت سب سے ملے اور آپس میں سب ایک دوسرے کے لئے دعا کریں۔ چنانچہ مقیم، مسافر سے کہے کہ فِي حِفْظِ اللّٰهِ وَ كَنَفِهٖ زَوَّدَكَ التَّقْوٰى وَ غَفَرَلَكَ وَوَجَّهَكَ لِلْخَيْرِ حَيْثُ تَوَجَّهْتَ (یعنی جاؤ تم کو سونپا میں نے اللہ تعالیٰ کی حفاظت اور پناہ میں۔ اللہ تم کو راستہ کا توشہ تقویٰ کا دے اور تمہاری مغفرت فرمائے اور جدہر بھی تم جاؤ خدا تمہارا رخ خیر ہی کی جانب فرمائے) اور مسافر مقیم سے یوں کہے کہ اَسْتَوْدِعُ اللّٰهَ دِيْنَكَ وَاِيْمَانَكُمْ وَ خَوَاتِيْمَ عَمَلِكُمْ (یعنی سونپتا ہوں میں اللہ تعالیٰ کو تمہارا دین، تمہارا ایمان اور تمہارا آخری عمل)۔ اور چاہئے کہ اسی طرح سے اپنے جملہ اہل و مال اور ہر چیز کو جو اس سے متعلق ہے اللہ تعالیٰ کے سپرد کرے اور دعا جو کرے تو سب کے لئے کرے کسی بعض کی اس میں تخصیص نہ کرے۔ (اس سلسلہ میں ایک قصہ سنو)

حکایت عجیبہ:۔ روایات میں آتا ہے کہ ایک دفعہ امیر المومنین حضرت عمرؓ لوگوں کو مال تقسیم فرمارہے تھے کہ اچانک ایک شخص آیا اور اس کے ہمراہ اسکا ایک لڑکا بھی تھا بالکل اس کے مشابہ (یعنی بیٹا باپ سے اس قدر مشابہ تھا کہ بدون کہے ہی معلوم ہو جاتا تھا کہ یہ دونوں باپ بیٹے ہیں چنانچہ استعجاباً) حضرت نے اس سے دریافت فرمایا یہ لڑکا کون ہے؟ اور تمہاری اس سے کیا قرابت ہے۔ دو آدمیوں میں اس قدر مشابہت میں نے نہیں دیکھی۔ اس نے عرض کیا کہ امیر المومنین یہ میرا بیٹا ہے۔ واقعہ اسکا یوں ہوا کہ ایک بار میں نے سفر کا ارادہ کیا اسوقت یہ لڑکا اپنی ماں کے پیٹ میں تھا اس نے کہا کہ تم تو سفر میں چلے اور مجھے اس حال میں چھوڑے جاتے ہو۔ میں نے کہا کہ تیرے بطن میں جو کچھ ہے میں اس کو خدا تعالیٰ کے سپرد کرتا ہوں۔ یہ کہکر میں سفر کو چلا گیا، جب سفر سے واپس آیا تو اسکی ماں مر چکی تھی ایک دن میں لوگوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ ناگہاں اسکی قبر پر

ایک آگ روشن دیکھی۔ لوگوں سے دریافت کیا کہ یہ کیا چیز ہے؟ انہوں نے بتایا کہ وہ تمہاری بیوی کی قبر ہے۔ وہاں پر تو یہ روشنی برابر ہم دیکھتے ہیں۔ میں نے کہا خدا کی قسم میری بیوی چونکہ نیک و صالحہ عورت تھی صائم الدہر اور قائم اللیل تھی' یعنی ہمیشہ دن میں روزہ رکھا کرتی تھی اور رات کو نماز پڑھتی تھی۔ یہ روشنی اسی وجہ سے ہے۔ اس کے بعد میں خود اس کے قبر پر گیا دیکھا کہ ایک چراغ روشن ہے اور قبر کے پاس یہی لڑکا بیٹھا ہاتھ پیر پٹک رہا ہے۔ اتنے میں ایک ہاتف غیبی نے آواز دی کہ لو یہ لڑکا تمہاری وہی امانت ہے جس کو تم خدا کے سپرد کر کے سفر پر گئے تھے اگر اسکی ماں کو بھی تم خدا کے سپرد کر جاتے تو آج اس کو بھی زندہ پاتے۔ کیونکہ جو شخص خدا کی سپردگی میں کوئی امانت دے جاتا ہے تو وہ اس کو صحیح وسالم ہی پاتا ہے۔

(ادب) منجملہ آداب سفر کے ایک ادب یہ ہے کہ سفر شروع کرنے سے پہلے دو رکعت نماز استخارہ پڑھے کیونکہ جو شخص کسی کام کے کرنے سے پہلے استخارہ کرلیتا ہے' تو اس کام کا انجام بخیر ہوتا ہے۔ اور حدیث شریف میں آتا ہے کہ ابن آدم (انسان) کی سعادت سے یہ بات ہے کہ کام شروع کرنے سے پہلے استخارہ کرلے۔ اور یہ بھی آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کو اسطرح سے استخارہ تعلیم فرماتے تھے جیسے قرآن کی کوئی سورت۔ مطلب یہ کہ نہایت اہتمام فرماتے تھے۔ چنانچہ اسلاف ہر کام میں استخارہ کو لازم سمجھتے تھے۔

استخارہ کا طریقہ۔ یہ ہے کہ اولاً دو رکعت نماز اسطرح سے پڑھے کہ اول رکعت میں الحمد کے بعد قُلْ يَاأَيُّهَا الْكَافِرُونَ اور دوسری رکعت میں قُلْ هُوَ اللّٰهُ پڑھے اور نماز سے فارغ ہو کر یہ دعا پڑھے اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْتَخِيْرُكَ بِعِلْمِكَ وَ اَسْتَقْدِرُكَ بِقُدْرَتِكَ وَاَسْئَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ الْعَظِيْمِ فَاِنَّكَ تَقْدِرُ وَلَا اَقْدِرُ وَ تَعْلَمُ وَلَا اَعْلَمُ وَاَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ اَللّٰهُمَّ اِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ هٰذَا الْاَمْرَ خَيْرٌ لِّيْ فِيْ دِيْنِيْ وَ مَعَاشِيْ وَعَاقِبَةِ اَمْرِيْ اَوْ عَاجِلِ اَمْرِيْ وَاٰجِلِهٖ فَاقْدِرْهُ لِيْ وَيَسِّرْهُ لِيْ ثُمَّ بَارِكْ لِيْ فِيْهِ وَاِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ هٰذَا الْاَمْرَ شَرٌّ لِّيْ فِيْ دِيْنِيْ وَ مَعَاشِيْ وَ عَاقِبَةِ اَمْرِيْ اَوْ عَاجِلِ اَمْرِيْ وَ اٰجِلِهٖ فَاصْرِفْهُ عَنِّيْ وَاصْرِفْنِيْ عَنْهُ وَ اقْدِرْ لِيَ الْخَيْرَ حَيْثُ كَانَ ثُمَّ اَرْضِنِيْ بِهٖ۔ یعنی اے اللہ میں آپ سے آپ کے علم کے استعانت سے خیر طلب کرتا ہوں' اور آپ کی قدرت کے ذریعہ قدرت طلب کرتا ہوں' اور آپ سے آپ کے فضل عظیم کا سوال کرتا ہوں اس لئے کہ آپ قادر ہیں اور مجھ میں قدرت نہیں' آپ سب کچھ جاننے والے ہیں اور مجھ کو علم نہیں' اور آپ پوشیدہ باتوں کے بھی جاننے والے ہیں اے اللہ اگر آپ کے علم میں یہ ہو کہ یہ چیز (جسکا میں نے اپنے سفر سے قصد کیا ہے) میرے حق میں' میرے دین کے حق میں میری دنیا اور معاش کے حق میں اور میرے انجام کار میں یا میرے لئے حالاً اور مآلاً یعنی دنیا اور آخرت کے اعتبار سے بہتر ہے تو

اس کو میرے لئے مقدر فرمادے اور میرے لئے اسکی تحصیل میں آسانیاں بہم پہونچادے اور پھر حاصل ہو جانے پر میرے لئے اس میں برکت عطا فرما۔ اور اگر آپ کے علم میں یہ ہو کہ یہ شے میرے لئے میرے دین کے لئے' میری دنیا اور معیشت کے لئے' میرے انجام کار کے لئے یا میری دنیا اور آخرت کے لئے شر اور مضر ثابت ہونے والی ہے تو اس کو مجھ سے دور فرمادے اور مجھکو اس سے بچالے۔ اور میرے لئے تو خیر اور بھلائی ہی کو مقدر فرما جس جگہ سے بھی حاصل ہو۔ اور پھر حصول خیر کے بعد مجھے اس پر رضا بھی نصیب فرما۔

(فائدہ) حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو شخص کسی کام کا ارادہ کرے تو دو رکعت نفل نماز پڑھے اور اس کے بعد یہ دعا' پڑھے' اور کام سے مراد وہ مباح کام ہے جسکے کرنے نہ کرنے میں اس کو تردد ہو رہا ہو' مثلاً کہیں کا سفر کرنا۔ مکان بنوانا۔ نکاح کرنا۔ وغیرہ وغیرہ۔ باقی روزانہ کا کھانا پینا اس میں استخارہ نہیں کرنا چاہئے۔ اس طرح سے واجب (مسنون) اور مستحب امور میں بھی استخارہ نہیں کرنا چاہئے۔ (کیونکہ شریعت نے تو ان میں خود ہی جانب فعل کو راجح کر دیا ہے اب یہاں نہ کرنے کا کیا سوال) اسی طرح سے حرام اور مکروہ کام کے ترک کرنے میں بھی استخارہ نہ کرے (کیونکہ جب شریعت نے ان سے منع کر دیا ہے تو پھر اب یہاں کرنے کا کیا احتمال) پس استخارہ کرنے کے بعد جو جہت اس کے لئے مناسب ہو گی اس پر دل کو قرار ہو جائیگا۔ حضرت شیخ نے مشکوٰۃ کی شرح میں یہی لکھا ہے۔

(ادب) عین سفر کے وقت چار رکعت نماز اور پڑھے کیونکہ حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ (سفر کرنے والا) انسان اپنے اہل و عیال میں اپنا کوئی خلیفہ یعنی جانشین اور کار پرداز ایسا جو کہ خدا تعالیٰ کو بھی محبوب ہو ان چار رکعت سے بڑھکر نہیں چھوڑ جاتا جسے اس نے رخت سفر درست کرنے اور بستر باندھنے کے وقت پڑھا ہو۔ اور اس نماز کی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ اور قل ہو اللہ احد پڑھے۔ اور بعد نماز کے کہے اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَتَقَرَّبُ بِهِنَّ اِلَيْكَ فَاخْلُفْنِيْ اَهْلِيْ وَمَالِيْ یعنی اے اللہ میں تیرا قرب حاصل کرتا ہوں ان رکعات کے ذریعہ سے پس تو میرا کار پرداز ہو جا میرے بعد میرے اہل و عیال اور میرے مال میں۔ جو کوئی یہ پڑھتا ہے حق تعالیٰ اسکی حفاظت فرماتے رہتے ہیں اس کے اہل و مال اور خود اس کے سروجان کی جب تک کہ وہ اپنے مکان نہ واپس آجائے۔ حدیث شریف کا مضمون ختم ہوا)۔

(ادب) جب جاتے ہوئے گھر سے باہر نکلے تو یہ کہے بِسْمِ اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ رَبِّ اَعُوْذُبِكَ اَنْ اَضِلَّ اَوْ اُضَلَّ اَوْ اَزِلَّ اَوْ اُزَلَّ اَوْ اَظْلِمَ اَوْ اُظْلَمَ اَوْ اَجْهَلَ اَوْ يُجْهَلَ عَلَيَّ یعنی میں اللہ کے نام سے (سفر کے لئے) نکل رہا ہوں۔ بھروسا کیا میں نے اللہ تعالیٰ پر نہیں ہے گناہ سے بچنا اور نہ قوت عبادت کی مگر اللہ تعالیٰ کی مدد اور اعانت کے ساتھ۔ اے میرے رب میں پناہ پکڑتی ہوں۔ تیری اس بات سے کہ گمراہ ہوں اور گمراہ کیا جاؤں

میں، یا پھسلوں میں یہ پھسلایا جاؤں میں یا ظلم کروں میں یا یہ کہ ظلم کیا جاؤں میں، یا جہالت کروں میں یا مجھ پر جہالت کی جائے۔

((ادب)) اور جب راہ میں قدم رکھ دے یعنی گھر سے باہر نکل کر روانہ ہو جائے تو یہ دعا پڑھے اَللّٰهُمَّ بِکَ اِنْتَشَرْتُ وَ عَلَیْکَ تَوَکَّلْتُ وَبِکَ اِعْتَصَمْتُ اِلَیْکَ تَوَجَّهْتُ اَللّٰهُمَّ اَنْتَ ثِقَتِیْ وَ اَنْتَ رَجَائِیْ فَاکْفِنِیْ مَا اَهَمَّنِیْ وَ مَالَا اَهْتَمُّ بِهٖ اَللّٰهُمَّ زَوِّدْنِی التَّقْوٰی وَوَجِّهْنِیْ لِلْخَیْرِ اَیْنَمَا تَوَجَّهْتُ (یعنی اے اللہ میں تیرے نام کے ساتھ گھر سے باہر نکلا اور زمین پر پھیلا اور تجھ ہی پر توکل کیا میں نے اور تیرے ہی ساتھ میں نے اعتصام کیا (یعنی چنگل مارا) اور آپ ہی کی جانب متوجہ ہوا میں۔ اے اللہ تجھ ہی پر اعتماد ہے مجھ کو اور تجھ ہی سے ہے امید مجھ کو پس کفایت کر دے اس چیز سے کہ فکر میں ڈالے مجھ کو اور اس چیز سے بھی کہ میں فکر نہیں کرتا جسکی۔ اے اللہ تو مجھ کو توشہ راہ دے تقویٰ کا اور اور متوجہ کر مجھ کو خیر کے واسطے جس جانب کہ متوجہ ہوں میں۔

(ادب) مذکورہ بالا دعا، جسطرح سے کہ گھر سے نکلنے کے بعد پڑھا ہے اس طرح اثناء سفر میں جہاں کہیں ٹھہرے اور منزل کرے تو وہاں سے روانگی کیوقت پھر پڑھے اسی طرح ہر منزل پر کرے۔ (یہ اس لئے تھا کہ سفر کی کوئی منزل یاد خدا سے خالی نہ رہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سنت پر عمل کرنے کی توفیق بخشے)

((ادب)) گھر سے باہر نکل کر جب گھوڑے (یا ریل، موٹر، کشتی) پر سوار ہو تو یہ دعا پڑھے بِسْمِ اللّٰهِ وَ بِاللّٰهِ وَ اللّٰهُ اَکْبَرُ تَوَکَّلْتُ عَلَی اللّٰهِ وَ لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَظِیْمِ مَاشَاءَ اللّٰهُ کَانَ وَمَالَمْ یَشَاْ لَمْ یَکُنْ سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَ مَا کُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ وَ اِنَّا اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ۔ اَللّٰهُمَّ اَنْتَ الْحَامِلُ عَلَی الظَّهْرِ وَاَنْتَ الْمُسْتَعَانُ عَلَی الْاُمُوْرِ۔ (میں اللہ تعالیٰ کے نام اور اسکی مدد سے سوار ہوتا ہوں اس پر اللہ بہت بڑا ہے۔ بھروسا کیا میں نے اللہ تعالیٰ پر اور نہیں ہے بچنا گناہوں سے اور نہ قوت عبادت کی مگر اللہ برتر و بزرگ کی مدد سے۔ اللہ تعالیٰ ہی نے جو کچھ چاہا ہوا۔ جو نہ چاہا نہ ہوا پاک ہے وہ ذات جس نے اس سواری کو ہمارے تابع کردیا ورنہ تو ہم اسکی طاقت نہ رکھتے تھے اور بلاشبہ ہم اپنے رب کی جانب لوٹ کر جانے والے ہیں۔ اے اللہ تو ہی سوار کرنے والا ہے مجھے اسکی پشت پر۔ اور تجھ ہی سے مدد چاہی جاتی ہے جملہ امور و حاجات میں۔

ان دعاؤں سے مقصود یہ ہے کہ انسان اثنائے سفر میں برابر ہر ہر موقع پر حق تعالیٰ سے التجا اور استعانت کرتا رہے اور اسی پر توکل کرے۔ اور اسی سے بھلائی کی توفیق مانگے اور اسکی یاد میں برابر مشغول رہے دل سے اسے کبھی نہ بھولے۔

(ادب) منجملہ آداب سفر کے ایک یہ ہے کہ پنجشنبہ کے روز سفر کرے کہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کا یہی معمول تھا۔ اور مناسب ہے کہ صبح کے وقت سفر میں نکلے اس لئے کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حق تعالیٰ برکت دے میری امت کو پنجشنبہ کی صبح میں۔ مطلب یہ کہ جو کام اس دن اسوقت کریں برکت پاویں چنانچہ ہر کام میں مستحب یہ ہے کہ صبح کے وقت اس کو شروع کیا جائے کہ یہ وقت برکت کا ہے۔

(ادب) جمعہ کے دن طلوع فجر کے بعد سفر نہ کرے کہ جمعہ کی نماز چھوڑ کر جانا بہتر نہیں۔ نیز منجملہ آداب سفر کے ایک یہ ہے کہ جب تک دھوپ تیز ہو کر دن گرم نہ ہو جائے سواری سے اترے نہیں (یعنی) سفر موقوف نہ کرے۔ یہ اس سفر کا حکم ہے کہ لوگ عرب میں پیدل قافلہ کے ساتھ یا سواری پر رات رات میں سفر کرتے تھے اور دن میں بوجہ تمازت آفتاب کہیں منزل کر دیتے تھے۔ اس کو فرمایا کہ مقصود تک جلد سے جلد پہونچنے کی کوشش کرے اس لئے جب تک دھوپ کی برداشت ہو سکے کچھ راستہ طے ہی کر لے دن ہوتے ہی نہ اتر جائے بلکہ جب گرم ہو جائے تب اترے) کہ سنت اسی طرح سے ہے اور اکثر راستہ شب میں قطع کرے حدیث شریف میں آتا ہے کہ رات کو چلا کرو کہ راہ شب میں لپیٹ دی جاتی ہے۔ یعنی زیادہ مسافت کم معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ حکم اسوقت کے لئے ہے کہ راستہ پر خطر نہ ہو اور رفقاء بہت سے ہمراہ ہوں۔

(ادب) جب بلندی پر چڑھے مثلاً ٹیلہ یا پہاڑ آوے تو تکبیر یعنی اللہ اکبر کہے اور جب نشیب میں آوے تو تسبیح یعنی سبحان اللہ کہے اور جب کسی منزل کے نزدیک پہونچے تو یہ کہے اَللّٰھُمَّ اَسْأَلُکَ خَیْرَ ھٰذَا الْمَنْزِلِ وَ خَیْرَ اَھْلِہٖ وَ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ شَرِّ ھٰذَا الْمَنْزِلِ وَشَرِّ مَا فِیْہِ اَللّٰھُمَّ اصْرِفْ عَنِّیْ اَشْرَارَھُمْ یعنی اے اللہ میں آپ سے اس منزل اور اس کے رہنے بسنے والوں کی خیر کا سوال کرتا ہوں اور آپ سے پناہ مانگتا ہوں اس منزل اور اس میں ہونے والی چیزوں سے شر سے۔ اے اللہ انکے بروں کی برائی کو ہم سے پھیر دے۔

(ادب) اور جب منزل پر اتر جائے تو چاہئے کہ وہاں دو رکعت نماز ادا کرے اور یہ کہے اَعُوْذُ بِکَلِمَاتِ اللّٰہِ التَّآمَّاتِ الَّتِیْ لَا یُجَاوِزُھُنَّ بَرٌّ وَّ لَا فَاجِرٌ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ یعنی پناہ مانگتا ہوں میں اللہ تعالیٰ کے ایسے کلمات کے ذریعے جو پورے اور کامل ہیں۔ اور جو ایسے ہیں کہ نہیں تجاوز کرتا ان سے کوئی بھلا اور نہ کوئی برا اس چیز کے شر سے جس کو اس نے پیدا کیا ہے۔

(ادب) اور جب رات ہو تو یہ پڑھے یَا اَرْضُ رَبِّیْ وَ رَبُّکِ اللّٰہُ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ

ے یعنی جمعہ کے دن شروع ہو جانے کی وجہ سے اس کا ادب یہی ہے کہ اب سفر نہ کرے تاہم اگر کوئی شخص اذان جمعہ سے پہلے پہلے سفر میں چلا جائے تو بالاتفاق مکروہ نہیں ہے ہاں جمعہ کے دن اذان کے بعد نماز چھوڑ کر سفر میں چلے جانے کو البتہ فقہائے

شَرِّكِ وَ شَرِّ مَا خُلِقَ فِيكِ وَ شَرِّ مَا يَدِبُّ عَلَيْكِ وَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ اَسَدٍ وَ اَسْوَدٍ وَمِنَ الْحَيَّةِ وَالْعَقْرَبِ وَمِنْ شَرِّ سَاكِنِ الْبَلَدِ وَمِنْ وَالِدٍ وَمَا وَلَدَ وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِي اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔ اے زمین میرا اور تیرا رب اللہ ہے پناہ مانگتا ہوں میں اللہ کی تیری برائی سے (یعنی زلزلہ وغیرہ سے) اور اس چیز کی برائی سے جو تجھ میں پیدا کی گئی ہے (یعنی سانپ وغیرہ) اور اس چیز کی برائی سے جو تجھ پر چلتی ہے (یعنی حیوانات اور جن وانس وغیرہ) اور پناہ مانگتا ہوں میں اللہ کی شیر اور کالے اژدھے کی برائی سے اور ہر طرح کے سانپ اور بچھو سے اور شہر کے رہنے والوں اور بسنے والوں کے شر سے اور ہر جننے والے کے شر سے اور اس چیز کے شر سے جسکو اس نے جنا اور اللہ ہی کے لئے ہیں وہ سب چیزیں جو سکون پکڑتی ہیں رات اور دن میں۔ اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

(فائدہ) حضرت جبیرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ اے جبیرؓ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ جب تم سفر کے لئے نکلو تو اپنے سب ساتھیوں سے صورت اور حال میں بہتر اور توشہ و مال میں ان سب سے بڑھ کر ہو جاؤ، یعنی مال و کمال اور جمال والے تم ہو جاؤ۔ میں نے عرض کیا جی ہاں یا رسول اللہ آپ پر میرے ماں باپ فدا ہوں ضرور ایسا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ تم یہ پانچ سورتیں (سفر میں جانے سے پہلے) پڑھ لیا کرو۔ قُلْ يَا اَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ۔ اِذَا جَاءَ۔ قُلْ هُوَ اللّٰهُ۔ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ۔ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ اور ہر سورہ کو بسم اللہ سے شروع کرو اور سب سورتیں پڑھنے کے بعد آخر میں ایک بار پھر بسم اللہ پڑھو گویا بسم اللہ چھ بار پڑھو۔ جبیرؓ کہتے ہیں کہ میرا یہ حال تھا کہ میں ایک امیر شخص تھا سفر میں جاتا تھا تو بالکل تباہ ہو جاتا تھا اور اپنے احباب میں سب سے زیادہ مفلس، خستہ حال اور بدہیئت ہو کر گھر واپس آتا تھا ویسے تھا میں مالدار شخص مگر بڑی بے برکتی تھی۔ نفع کو تو کون کہے راس المال ہی ضائع کر کے آتا تھا لیکن جب سے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سورتیں سیکھیں اور سفر کے وقت انکے پڑھنے کا معمول بنایا اب وہی میں ہوں کہ اپنے سب ساتھیوں سے بڑھا ہی رہتا ہوں ہیئت و حال میں بھی اور توشہ و مال میں بھی اور روانگی سے لیکر واپسی تک میرا یہی حال رہتا ہے۔ اس روایت کو ابو یعلی نے نقل کیا ہے۔

(ادب) جب منزل پر اترے تو یہ دعا پڑھے اَعُوْذُ بِكَلِمٰتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ میں اللہ تعالے کے ان کلمات سے جو کامل و مکمل ہیں اسکی مخلوق کے شر سے پناہ چاہتا ہوں۔ حدیث شریف میں اس دعاء کی بہت فضیلت آئی ہے۔ حضرت معقل بن یسارؓ جو کہ صحابی ہیں روایت فرماتے ہیں کہ جس نے یہ دعاء پڑھی اس پر ستر ہزار فرشتے متعین ہوتے ہیں جو اس کے لئے بخشش کی دعاء کرتے ہیں اور اگر یہ شخص سفر میں مرجاتا ہے۔ تو شہید مرتا ہے۔ یہ روایت ملاعلی

قاری نے حصن حصین کی شرح میں نقل کی ہے۔ اور صحیح مسلم میں روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ آج کی شب ایک بچھو کے کاٹ لینے سے بڑی ہی تکلیف ہوئی ساری رات مصیبت اٹھائی۔ آپؐ نے فرمایا کہ جس وقت کہ تم نے شام کی تھی اگر یہ دعاء پڑھ لیتے تو تم کو کچھ ضرر نہ پہونچتا اور تم اس تکلیف سے محفوظ رہتے۔ وہ دعاء یہ ہے اَعُوْذُ بِکَلِمٰاتِ اللّٰہِ التَّآمَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ چنانچہ جو شخص منزل پر اتر کر یہ دعا پڑھ لے گا تو کوچ کرنے تک ہر چیز کے ضرر سے محفوظ رہیگا۔ یہ روایت مشکوٰۃ شریف میں آئی ہے اور ابن نجارؒ نے اپنی تاریخ میں حضرت علیؓ سے نقل کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص سفر کرنے کا ارادہ کرے اور اپنے گھر کے دروازہ کا دونوں بازو پکڑ کر گیارہ بار قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ پڑھے تو اللہ تعالیٰ اسکا نگہبان ہوتا ہے سفر سے واپسی تک۔ یہ روایت تفسیر در المنثور میں ہے۔ اور بہت سی دعائیں تفصیل کے ساتھ حصن حصین وغیرہ میں بیان کی گئی ہیں۔ جو چاہئے سو پڑھے۔

(ادب) منجملہ آداب سفر کے ایک یہ ہے کہ دن میں بھی اور رات میں بھی خوب حفاظت اور احتیاط کے ساتھ رہے دن میں احتیاط یہ کہ تنہا نہ چلے اور قافلہ سے الگ نہ ہو شاید کہ کوئی تاک میں لگا ہو یا قافلہ سے رہ جائے اور رات میں اسطرح کہ بیدار اور ہوشیار رہے سونا ہو تو بے خبر نہ سوئے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں جب اول شب میں سوتے تو اپنے بازو کو اپنے سر مبارک کے نیچے بچھا دیتے (کہ اس صورت میں پوری راحت ملتی ہے اور خوب نیند آتی ہے) اور جب آخر شب میں سونا ہوتا تو بازو نصب فرما لیتے اور سر کو ہتھیلی پر رکھکر آرام فرماتے کہ اس ہیئت سے سونے میں غفلت زیادہ نہیں ہونے پاتی اور انسان جلدی جاگ اٹھتا ہے۔ اور مستحب یہ ہے کہ سب شرکاء سفر باری باری سے جاگیں (تاکہ پوری رات کی نگرانی بھی ہو جائے اور کسی پر بار اور تعب نہ ہو)۔

(ادب) دن یا رات میں اگر کوئی درندہ ایذا کا قصد کرے تو آیۃ الکرسی اور قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ پڑھے اور اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگے اور اسی پر بھروسہ کرے اور اسی سے مدد چاہے۔

(ادب) منجملہ آداب سفر کے ایک یہ ہے کہ اگر سواری پر سفر کر رہا ہے تو اس کے بھی حقوق ادا کرے یعنی اس پر رحم اور نرمی کرے اور اس کی طاقت سے زیادہ اس پر بوجھ نہ رکھے اور مارنا ہو تو منہ پر نہ مارے کہ ہر جاندار کے منہ پر مارنا منع ہے (کچھ انسان ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے) اور سواری پر سوئے نہیں تاکہ وہ گراں بار نہ ہو اس لئے کہ نیند کی حالت میں وزن زیادہ ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے جانور کو ایذاء ہوتی ہے اس لئے اس پر سوئے نہیں اگر کہیں کہیں تھوڑی دیر کے

(ادب) مناسب ہے کہ اپنے اہل خانہ کے واسطے نیز دوست احباب اقرباء کے واسطے بقدر اپنی استطاعت کے تحفہ لادے کہ یہ سبب ہوتا ہے انکے دل کی فرحت اور باہم ازدیاد محبت کا۔

(ادب) منجملہ آداب سفر کے ایک ادب جس کا تعلق انسان کے باطن سے ہے یہ ہے کہ سفر سے مقصود اور نیت آخرت ہو یا ایسی کوئی چیز ہو جو معین آخرت بنے۔ اگر سفر حصول دین یا زیارت دین کا سبب نہ ہو تو نہ کرے۔ اسی طرح سے جب اپنی قلبی رغبت میں تغیر پاوے تو سفر موقوف کر دے اور اگر شروع کر چکا ہے تو واپس آجائے۔

(ادب) چاہئے کہ ہر شہر اور بستی میں داخل ہونے سے مقصود وہاں کے بزرگوں کی زیارت اور ملاقات ہو اور اس بات کی کوشش کرے کہ ہر ایک سے کوئی نہ کوئی فائدہ کی چیز اخذ کرلے اگرچہ ایک ہی بات کیوں نہ ہو۔ اور نیت یہ ہو کہ اس مفید بات سے خود متنفع ہو گا نہ یہ کہ صرف قصہ گوئی کے طور پر دوسروں سے بیان کرنا (اور اپنے سفرنامے کو اس سے مزین کرنا مقصود ہو)۔

(ادب) اور اپنے سفر میں جو عجائب اور غرائب دیکھے ہیں کمال ریاضت تو یہ ہے کہ اسکا بھی کسی سے ذکر نہ کرے اور اگر بیان ہی کرنا ہو تو بقدر ضرورت بیان کرے اور کسی تقریب یعنی مناسب موقع سے بیان کرے۔

(ادب) کسی شہر میں ہفتہ عشرہ سے زیادہ قیام نہ کرے مگر یہ کہ جس شیخ کی زیارت کرے وہی حکم کرے زیادہ دن ٹھہرنے کا تو خیر اور اگر کسی دوست یا ملاقاتی کے یہاں رہنا ہو تو تین دن سے زیادہ نہ ٹھہرے کہ مہمانی کی یہی حد ہے الا یہ کہ اس کو تمہاری جدائی شاق ہو اور اصرار کرے کہ ابھی اور ٹھہرو تو خیر۔ اور اگر کسی شیخ اور بزرگ کی زیارت کو جائے تو ایک رات دن سے زیادہ وہاں قیام نہ کرے کہ بزرگوں کی تکلیف دینی اچھی بات نہیں (اور زیارت و ملاقات کے لئے چوبیس گھنٹے کا وقت کافی ہے)۔

(ادب) سفر میں عیش و عشرت میں مشغول ہونا اچھا نہیں کہ اس سے سفر کی برکت جاتی رہتی ہے۔

(ادب) جس شہر میں جائے پہلے وہاں کے بزرگوں سے ملاقات کرے ان کے مرتبہ اور فضیلت کی ترتیب کے مطابق یعنی پہلے اس شیخ سے ملے جو وہاں سب سے بڑا ہو پھر اس سے کم والے پھر اس سے کم والے سے۔

(ادب) اگر وہ بزرگ گھر کے اندر ہوں تو انکا دروازہ نہ کھٹکھٹائے اور انکو باہر آنے کی زحمت نہ دے بلکہ باہر بیٹھ کر انکے نکلنے کا انتظار کرے یہاں تک کہ جب وہ خود ہی باہر تشریف لائیں تو ان سے ملاقات کرے اور ان کی مجلس میں ادب سے بیٹھے۔ بدون اجازت کے بات نہ کرے اور اگر وہ

کچھ دریافت فرمائیں توبقدر سوال کے جواب دے۔اور بدون انکی رضامندی اور اجازت کے ان سے مسئلہ وغیرہ نہ پوچھے۔

(ادب) جس شہراور بستی میں جانا ہو وہاں کے گذرے ہوئے صلحاء اور مشائخ کے قبور کی زیارت کرے اور اگر خود کو نہ معلوم ہو تو وہاں کے رہنے والوں سے دریافت کرے

(ادب) بدون ضرورت کے اپنی حاجت کسی سے ظاہر نہ کرے' اگرچہ جانتا ہو کہ وہ قبول کر لے گا۔ اور راستہ میں ہمیشہ ذکر و فکر میں لگا رہے۔(مطلب یہ کہ اپنے قلب کو ہروقت یاد خدا میں لگائے رکھے غفلت کو پاس نہ آنے دے۔)

(ادب) مناسب یہ ہے کہ ذکردن میں کرے لوگوں کو سنائے نہیں' اور اگر کوئی اس سے کچھ بات پوچھے تو ذکر کو منقطع کر کے پہلے اسکی بات کا جواب دیدے اور پھر ذکر میں لگ جائے کہ اس صورت کو اپنے حال کے پوشیدہ رکھنے میں بڑا دخل ہے اور یہ بات نفس کی خواہش کے بھی خلاف ہے اس لئے یہی مناسب ہے (کیونکہ اسکی خواہش تو یہ ہوتی ہے کہ لوگ اس کو ذاکر و شاغل اور پابند اوراد و وظائف سمجھیں اس لئے وہ تو یہی سمجھائے گا کہ وظیفہ میں مت بولو' ہوں ہاں کر کے اپنے ذاکر ہونے کا دوسرے پر اظہار کرنا اور اپنی بزرگی کا سکہ اس پر جمانا ہی چاہے گا۔ لیکن جب ذکر موقوف کر کے اس کو جواب دیدیا اور پھر اپنے ذکر میں لگ گیا تو دوسرے کو کیا پتہ کہ یہ کیا کر رہا تھا اور کیا کر رہا ہے اس لئے اپنا حال مخفی رہیگا جو کہ اقرب الی الاخلاص اور ابعد عن الرّیا ہو گا اسلئے یہی چاہئے۔ خدا کا ذکر ایسا کمزور نہیں کہ ذراسی بات سے ٹوٹ جائے۔ نفس ایسے موقع پر دھوکا دیکر اپنی غذا حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس ادب میں اسی کی جانب تنبیہ فرمائی ہے۔ مترجم)

(ادب) اگر کہیں (اپنے وطن ہی میں) صلحاء اور فقراء کی خدمت میسر آجائے تو پھر سفر نہ کرے کہ سفر سے بھی مقصود یہی ہوا کرتا ہے۔ پس اس صورت میں اس کو چھوڑ کر کہیں اور جانا کفران نعمت شمار ہو گا کہ گھر کے نعمت کی قدر نہ کی اور بلاوجہ سفر اختیار کیا۔

(ادب) جب حالت سفر میں اپنی طاعت و حضور عبادت کی کیفیت میں کچھ کمی اور نقصان محسوس کرے بمقابلہ وطن کے قیام کے تو سمجھ لے کہ یہ سفر اس کے حق میں ضرر رساں ہے لہٰذا اس سے واپس آجائے۔

(ادب) سفر کرنے والے کو چاہئے کہ پہلے اپنے اندر سے نفس کی خواہشات اور مرغوبات کو نکالے پھر سفر کرے تاکہ سفر میں ذلیل و خوار نہ ہو کیونکہ جو نفس کا بندہ ہے اور اسکی خواہشات سے ابھی نکلا نہیں وہ ہمیشہ خوار ہی رہتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دینی سفر بھی مبتدیوں کے لئے سخت مضر ہے ہمارے اسلاف کا تو یہی تجربہ تھا۔)

(ادب) منجملہ آداب سفر کے بلکہ واجبات سفر کے یہ ہے کہ سفر سے پہلے شرعی رخصت کو مثلاً نماز کا قصر ہونا یا رمضان کے مہینے میں بھی روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہونے وغیرہ وغیرہ۔ (ان سب امور کو جانے) نیز قبلہ کی سمت کا جاننا (اور اس کا طریقہ معلوم کرنا) نیز نماز کے اوقات کا جاننا۔ اسیطرح سے ان تمام چیزوں کے مسائل کا سیکھنا جو سفر میں پیش آنے والی ہوتی ہے واجب اور ضروری ہے تاکہ اسکا سفر گمراہی کا ذریعہ نہ بنے (یعنے جس طرح سے جو شخص جس کام میں کہ وہ لگا ہوا ہو' اس کے ذمہ اس کے مسائل کا جاننا فرض عین ہو جاتا ہے' چنانچہ نماز پڑھنے والے کے لئے نماز کے مسائل کا علم فرض' تجارت کرنے والے کے لئے اسکی جائز و ناجائز صورتوں کا جاننا ضروری' نکاح کرنے والے کے لئے اس کے امور کا علم ضروری اور لازم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح سے سفر کرنے والے کے لئے اس کے حقوق کا علم لازم ہو جاتا ہے۔ جو سفر سے متعلق ہیں یعنی مسافر جن میں مبتلا ہوا کرتا ہو اگر اس کے احکام کے جانے بغیر سفر کریگا تو بہت کچھ بے عملی اور گمراہی کا شکار ہو گا) واللہ الموفق

ساتواں باب

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بیان میں اور اس باب میں سات فصلیں ہیں

فصل اوّل

امر بالمعروف (یعنی بھلائیوں کا حکم کرنے) اور نہی عن المنکر (یعنی برائیوں سے روکنے) کی فضیلت کے بیان میں

معلوم کرو کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر منجملہ فرائض کے ایک فریضہ ہے۔ چنانچہ آیات قرآنیہ' احادیث نبویہ اور اقوال و آثار صحابہ سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن فرض عین نہیں ہے (کہ ہر شخص پر فرض ہو) بلکہ فرض کفایہ ہے کہ اگر بعض لوگ بھی مسلمانوں میں سے اس کو بجالادیں تو سب کے ذمہ سے یہ فریضہ ساقط ہو جاتا ہے۔ جیساکہ فرض کفایہ کا حکم ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ تم بہترین امت تھے' نکالے گئے ہو واسطے

لوگوں کے کہ حکم کرتے ہو لوگوں کو اچھی باتوں کا اور منع کرتے ہو بری باتوں سے۔ اس آیت میں اس امت کی خیریت کو وابستہ کیا ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے وصف کے ساتھ۔ ایک مقام پر یہ فرمایا کہ تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ یعنی مدد کرو ایک دوسرے کی نیکی اور تقویٰ پر۔ اور نہ مدد کرو اوپر گناہ اور تعدی کے۔ چنانچہ قرآن شریف میں ایسی آیتیں جو کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر دلالت کرتی ہیں بہت سی وارد ہیں۔

اور حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کی ایک جماعت سے فرمایا کہ تمہارا اس دن کیا حال ہوگا جبکہ سرکشی کریں گی تمہاری عورتیں اور فسق کریں گے تمہارے نوجوان اور تم چھوڑ دو گے اپنے جہاد کو۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا ایسا ہونا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں قسم ہے اس ذات کی کہ محمد کی جان جسکے قبضہ میں ہے قریب ہی ہے وہ زمانہ کہ جس میں یہ کیا اس سے بھی سخت تر اور بدتر چیزیں واقع ہونگی صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ اس سے بھی زیادہ سخت کیا چیز ہوگی فرمایا کہ (اس سے سخت یہی کہ) کیا حال ہوگا تمہارا اسوقت جب کہ معروف کو منکر سمجھو گے اور منکر کو معروف سمجھو گے (یعنی اچھی بات تم کو بری معلوم ہوگی اور بری بات کو تم اچھا سمجھو گے) صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا یہ بھی ہونا ہے اور ایسا وقت بھی آنا ہے۔ (بلاشبہ یہ تو بہت ہی برا حال اور پورا وبال ہے) آپ نے فرمایا ہاں اور یہی نہیں اس سے بھی سخت چیز واقع ہوگی۔ صحابہؓ نے عرض کیا وہ کیا چیز ہوگی یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا وہ یہ کہ تم منکر کا امر کرو گے اور معروف سے منع کرو گے یعنی نہ صرف اتنا ہی ہوگا کہ معروف کو منکر اور منکر کو معروف جانو گے بلکہ منکر کا دوسروں کو امر کرو گے اسکی اشاعت اور تبلیغ میں سرگرم ہو گے اور معروف سے لوگوں کو روکو گے اور باز رکھو گے غرض یہ کہ نیک کام نہ خود کرو گے نہ دوسروں کو کرنے دو گے)۔ حدیث لمبی ہے آپ نے پوری حدیث بیان فرمائی۔

حدیث شریف میں یہ بھی آتا ہے کہ اس شخص پر لعنت اترتی ہے جو کسی ایسی جگہ جائے یا موجود رہے جہاں لوگ ظلم کر رہے ہوں اور یہ اس ظلم کو ان سے دفع نہ کرے۔ اس حدیث کی رو سے تو گوشہ نشینی کا وجوب نکلتا ہے کیونکہ یہاں منع کرنے سے عاجز ہونے کو عذر نہیں قرار دیا گیا ہے اس لئے کہ عاجز تھا تو وہاں گیا کیوں؟ اور دیکھنے کے بعد رکا کیوں؟ یہیں سے بعض بزرگوں نے عزلت کو ترجیح دی ہے اور اسے اختیار کیا ہے۔ جیسا کہ فوائد عزلت کے بیان میں گذرا ہے۔ چنانچہ ایسی جگہوں پر قصداً اور بلا ضرورت جانا منع ہے (جہاں کوئی امر منکر ہو اور یہ منع کرنے پر قادر نہ ہو) باقی اگر کوئی ضرورت ہی پیش آجائے یا اتفاقاً اس کے پاس سے گذرا تو معذور ہے اور یہاں بیشک عجز اور قدرت مدار حکم بنے گا۔ (یعنی اس جگہ ضرورۃً یا اتفاقاً گیا اور منع پر اس کو قدرت نہیں ہے تو یہ شخص عاجز ہے اور اگر قصداً گیا ہے تو یہ شخص عاجز نہیں ہے بلکہ قصد ہی قدرت کے حکم میں ہوگا اور

اب اس پر مواخذہ ہوگا اور پہلی صورت میں معذور متصور ہو کر مواخذہ سے بچ جائیگا۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہؓ نے دریافت فرمایا کہ یا رسول اللہ کیا وہ گاؤں اور بستی بھی ہلاک ہوتی ہے جس میں صلحاء ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں۔ صحابہ نے عرض کیا کہ سبب ہلاکت کیا ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ (وہ لوگ خود تو گناہ کا ارتکاب نہیں کرتے مگر دوسروں کی) معصیت ان کی نظروں میں سہل اور معمولی ہو جاتی ہے اور ان کو منع کرنے سے سکوت اختیار کرلیتے ہیں (یہ سبب بنتا ہے انکی ہلاکت کا)

نیز حدیث شریف میں یہ بھی آتا ہے کہ حق تعالیٰ نے ایک فرشتہ کو حکم فرمایا کہ کہ فلاں بستی کو اس کے بسنے والوں پر الٹ دو۔ فرشتہ نے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار اس میں آپ کا ایک ایسا بندہ موجود ہے جسنے کبھی آپ کی نافرمانی نہیں کی ہے۔ حکم ہوا کہ اس کے سمیت الٹ دو۔ اس لئے کہ اس نے گو گناہ نہیں کیا لیکن اور مخلوق کو گناہ کرتے دیکھ کر وہ چین بجبیں بھی نہ ہوا یعنی اس سے ناگواری کا اثر اس کے چہرہ پر ظاہر نہ ہوا۔

اسی طرح سے ایک روایت میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ایسی بستی کے لوگوں کو عذاب دیگا جس میں اٹھارہ ہزار ایسے آدمی ہونگے جن کے اعمال انبیاء کے سے ہونگے اور یہ عذاب اس لئے ہو گا کہ انہوں نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ترک کیا ہوگا۔

نیز حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو لوگ اچھی باتوں کا حکم کرتے ہیں اور بری باتوں سے روکتے ہیں اور آپس میں اللہ تعالیٰ کے لئے محبت رکھتے ہیں اور بغض بھی اللہ ہی کے لئے رکھتے ہیں وہ لوگ بہشت کے ایسے بالا خانوں میں ہوں گے جو کہ شہداء کے بالا خانوں سے اوپر ہوں گے اور ہر بالا خانے کے تین تین لاکھ دروازے ہونگے یاقوت اور زمرد کے اور ہر شخص کے عقد میں تین تین سو ایسی حوریں ہونگی کہ جب یہ انکی جانب نظر کریگا تو وہ کہیں گی کہ تجھے یاد ہے یا نہیں کہ فلاں وقت تو نے فلاں کو امر بالمعروف کیا تھا اور فلاں وقت فلاں کو نہی عن المنکر کیا تھا ہم لوگ تیرے اسی فعل کی جزا ہیں۔

نیز حدیث میں یہ بھی آتا ہے کہ شہداء میں سے افضل وہ ہے جو کسی ظالم حاکم کو امر بالمعروف کرے اور اس میں مارا جائے اس کی منزل جنت میں حضرت حمزہؓ اور حضرت جعفرؓ کے درمیان ہوگی

(فائدہ) حضرت حمزہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ہیں اور حضرت جعفرؓ حضرت علیؓ کے بھائی ہیں اور یہ دونوں حضرات شہید ہوئے ہیں اور بزرگی میں اونچا مقام رکھتے تھے پس یہ شخص بھی ان ہی حضرات کا رفیق ہوگا جنت میں۔

اسی طرح سے حضرات صحابہؓ کے بھی ارشادات امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی فضیلت میں بیشمار ہیں۔ چنانچہ حضرت حذیفہؓ ابن الیمانؓ سے لوگوں نے دریافت کیا کہ زندوں کے درمیان مردہ

کون ہے؟ آپ نے فرمایا جو اپنے سامنے گناہ ہوتا دیکھے اور ہاتھ زبان اور دل کسی سے بھی اس پر انکار نہ کرے۔ یعنی اولاً تو اس کو لازم تھا کہ اس گناہ کو اپنے ہاتھ سے مٹا دے اور یہ نہ ہو سکے تو زبان سے منع کر دے اور یہ بھی نہ ہو سکے تو دل سے برا جانے اور جس شخص نے ان امور میں سے کچھ بھی نہ کیا وہ بمنزلہ ' مردہ کے ہے (اگرچہ زندہ ہو) اور حضرت حذیفہؓ ہی سے یہ بھی منقول ہے کہ فرمایا کہ عنقریب ایک ایسا زمانہ لوگوں پر آئیگا کہ ایک مرا ہوا گدھا انکے نزدیک زیادہ محبوب ہو گا اس مسلمان سے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا ہو گا۔ (یعنی اس فعل سے ایسی بیزاری ہو گی کہ اس کے کرنے والے کو نہایت حقیر سمجھیں گے)۔

امیر المومنین حضرت عمرؓ سے منقول ہے کہ دل سے بھی کسی گناہ پر انکار نہ کرنا قلب کے اندھے ہونے کی دلیل ہے۔ روایت میں آتا ہے کہ حضرت کعبؓ احبار نے ابو مسلمؒ خولانی سے پوچھا کہ تمہاری قدر و منزلت تمہاری قوم میں کیسی ہے؟ انہوں نے کہا کہ بہت اچھی ہے۔ کعبؓ احبار نے کہا کہ توریت تو اس کے خلاف کہہ رہی ہے۔ ابو مسلمؒ نے پوچھا کہ توریت کیا کہہ رہی ہے؟ کعبؓ احبار نے کہا کہ توریت تو یہ کہتی ہے (یعنی اس میں یہ لکھا ہے کہ) جو شخص امر بالمعروف کرتا ہے اور نہی عن المنکر کرتا ہے وہ اپنے قوم کی نظروں میں بے قدر اور ذلیل ہے۔ ابو مسلم نے کہا کہ توریت سچ کہتی ہے اور ابو مسلم غلط کہتا ہے۔

(فائدہ) حضرت کعبؓ احبار کے ارشاد کا حاصل یہ تھا کہ توریت سے تو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے سے لوگ اس سے بغض رکھتے ہیں اور او راس سے نفرت کرتے ہیں اور اس کو حقیر اور ذلیل سمجھتے ہیں۔ پس تم جو کہتے ہو کہ لوگ مجھکو اچھا جانتے ہیں اس سے تو معلوم ہوا کہ تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہیں کرتے ہو گے ابو مسلمؒ خولانی نے اقرار کیا اور اپنے قصور کا اعتراف کیا اور کہا کہ توریت سچ کہتی ہے میں ہی اس میں قاصر ہوں اور کوتاہی کرنے والا ہوں اور بیشک واقع میں میں ہی اچھا نہیں ہوں اگرچہ لوگ مجھے اچھا جانتے ہیں۔

حاصل یہ کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب ہے جبکہ انسان کو اس پر قدرت ہو۔ اور اول درجہ اسکا یہ ہے کہ آدمی دل سے اس کو برا جانے اور اگر ایک شخص قوم میں اس کو اختیار کرے تو سب کے ذمہ سے ساقط ہو جاتا ہے۔

فصل دوم

محتسب کے شرائط کا بیان

محتسب سے مراد وہ شخص ہے جو منصب احتساب پر فائز ہو یعنی اسکو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (یعنی روک ٹوک کرنے کا مرتبہ حاصل ہو اس کے لئے چند شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔ چنانچہ منجملہ شرائط احتساب کے ایک یہ ہے کہ وہ مکلف ہو یعنی عاقل اور بالغ ہو۔ پس مجنوں اور نابالغ لڑکے پر احتساب واجب نہیں۔ دیوانہ پر نہ ہونے کی وجہ تو ظاہر ہے کہ وہ اسکی اہلیت اور صلاحیت نہیں رکھتا رہا لڑکا تو وہ بھی چونکہ احکام شرعیہ کا مکلف نہیں ہے اس لئے اسپر بھی واجب نہیں کہ دوسرے کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے۔ تاہم جائز ہے یعنی اگر کرے تو کر سکتا ہے کیونکہ کسی کام کے صدور و جواز کے لئے صرف عقل و تمیز کافی ہے۔ اور مراہق (غلام) یعنی وہ لڑکا جو قریب بہ بلوغ ہو عقل اور تمیز سے فی الجملہ متصف ہو جاتا ہے لہٰذا وہ کسی منکر پر انکار کر سکتا ہے۔ چنانچہ شراب کا برتن اوندھا کر سکتا ہے اور کھیل تماشا اور باجہ وغیرہ کی چیزوں کو توڑ سکتا ہے اور کوئی شخص اس سے اسکو روک نہیں سکتا اس لئے کہ وہ ثواب اور عبادت کا تو اہل ہے ہی اگرچہ ولایت (حکومت) کا اہل نہیں ہے اور احتساب بھی ایک قسم کی عبادت ہے یہی وجہ ہے کہ غلاموں اور عام رعایا کے لئے بھی جائز ہے اگرچہ یہ لوگ بھی اہل ولایت (حکومت) نہیں ہیں۔ اور اس جیسی ولایت کے لئے صرف ایمان کا ہونا کافی ہے جیسے کہ مشرک کا قتل کر دینا اور اسکا سامان خراب کر دینا یا اسکے ہتھیار چھین لینا وغیرہ وغیرہ کہ لڑکا اور بالغ دونوں اسمیں یکساں ہیں۔ اور فسق سے منع کرنا بھی (مخصوص حالات میں) ایسا ہی ہے جیسے کفر سے باز رکھنا۔

منجملہ شرائط احتساب کے ایک شرط محتسب کا ایمان والا ہونا بھی ہے۔ اسلئے کہ احتساب ایک دینی مدد اور نصرت کا نام ہے۔ پس جو شخص دین ہی کا دشمن اور اسلام ہی کا مخالف ہو وہ دین کی مدد اور نصرت کا اہل کیونکر ہو سکتا ہے؟ لہٰذا کافر تو اہل احتساب نہیں ہو سکتا۔ لیکن فاسق کو حق پہونچتا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے کیونکہ یہ احتساب فی نفسہٖ ایک عبادت ہے خواہ وہ شخص اسکے موافق عمل کرتا ہو یا نہ کرتا ہو (یہ الگ بات ہے) کیونکہ آدمی کا اپنی کہی ہوئی بات پر عمل کرنا یہ ایک دوسرا عمل ہے اور دوسری عبادت ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ صحابہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا ایسا ہے کہ ہم جب تک کسی معروف پر عمل نہ کریں دوسروں کو اسکا حکم بھی نہ کریں اور جب تک کسی منکر سے خود

نہ بچیں دوسروں کو بھی اس سے منع نہ کریں۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ (نہیں یہ بات تو نہیں ہے) تم معروف کا حکم کرو اگرچہ سب اچھی باتوں پر تم عمل نہ کر سکو۔ اسی طرح سے بری باتوں سے دوسروں کو منع کرو اگرچہ سب برائیوں سے تم نہ بچ سکو۔ لیکن یہاں یہ بھی سمجھ لو کہ احتساب کی متعدد صورتیں ہوا کرتی ہیں جیسا کہ ہم اسکو آگے بیان بھی کریں گے۔ یہ کبھی وعظ و نصیحت کے ذریعہ ہوتا ہے اور کبھی رعب داب اور زدو کوب کے ذریعے بھی ہوتا ہے۔ (مطلب یہ کہ فاسق کے احتساب کی کچھ یہی صورت تو نہیں کہ وہ وعظ ہی کہے بلکہ بعض مرتبہ وہ اپنی قوت اور اثر سے بھی بہت سی برائیوں کا انسداد کر سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس دوسری شق میں پہلے جیسی قباحت بھی نہیں ہے۔ لہٰذا احتساب اور بے عملی میں کیا منافات؟ البتہ) فاسق کے لئے مناسب نہیں کہ ایسی جگہ وعظ و نصیحت کرے جہاں اسکا فسق لوگوں کو معلوم ہو نہ اس سبب سے کہ یہ حرام ہے بلکہ اس سبب سے کہ وہاں اسکے وعظ کا نفع نہ ہوگا اور نصیحت بے سود ہوگی۔ ہاں ایسی جگہ بھی قہر اور زور سے جو احتساب کیا جا سکتا ہے وہ اسکے لئے بھی جائز ہے مثلاً شراب کا برتن اوندھا دینا اور لہو و لعب کی چیزوں کو توڑ پھوڑ ڈالنا۔ وغیرہ۔

بعض حضرات نے محتسب کے لئے عدالت کی بھی شرط لگائی ہے یعنی یہ کہ فاسق نہ ہو بلکہ نیکو کار ہو اور اسکی دلیل نقلی اور عقلی بیان کرتے ہیں نقلی تو یہ کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ یعنی کیا تم لوگوں کو تو نیکی کا حکم کرتے ہو اور اپنے نفسوں کو بھول جاتے ہو (اس میں خود عمل نہ کرنے کی صورت میں دوسروں کو امر بالمعروف کرنے پر نکیر فرمائی گئی ہے)۔ نیز اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ تم کیوں کہتے ہو اس بات کو جسے خود نہیں کرتے ہو۔ اور حدیث شریف میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں شب معراج میں ایک ایسی قوم کے پاس سے گزرا کہ فرشتے انکے منہ کو آگ کی قینچیوں سے کاٹ رہے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ اے مردوں کی جماعت تم کون لوگ ہو؟ انہوں نے کہا ہم ایسے لوگ ہیں جو دوسروں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے تھے مگر خود ہمارا عمل اسکے مطابق نہ تھا۔ اور یہ بھی حدیث میں آیا ہے کہ حق تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر وحی بھیجی کہ اے ابن مریم! پہلے تم اپنے آپ کو نصیحت کرو جب خود اس نصیحت کے قبول کرنے والے ہو جاؤ تو پھر اسکے بعد اور دوسروں کو نصیحت کرو ورنہ مجھ سے شرماؤ کہ کسی منہ سے اس بات کو دوسروں سے کہتے ہو جس پر تمہارا عمل نہیں ہے ان آیات اور روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ محتسب کے لئے عدالت شرط ہے۔

جواب کلی ان سب دلائل کا یہ ہے کہ ان لوگوں پر جو انکار کیا گیا ہے وہ امر معلوم پر عمل کے ترک کرنے کی وجہ سے ہے نہ کہ امر بالمعروف کرنے کی وجہ سے (یعنی جس طرح سے دوسرے لوگوں کو

نیکی کا حکم کرتے ہو تو خود بھی تو کرو۔ نہ یہ کہ اگر خود نہیں کر رہے ہو تو دوسروں کو بھی نہ کہو۔ اور دوسروں کو کہنا اور خود عمل نہ کرنا اسلئے مذموم ہے کہ دوسروں کو وعظ و تبلیغ کرنے سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کو کامل علم ہے اور ظاہر ہے کہ عالم پر مواخذہ سخت ہوا کرتا ہے کیونکہ اس آدمی پر ملامت زیادہ کی جائیگی جو آنکھ رکھنے کے باوجود اپنے اختیار سے کنوئیں میں گر جائے بہ نسبت اندھے کے کہ وہ تو اندھا ہی ہے اگر کنوئیں میں گر جائے تو کیا عجب۔ حاصل یہ کہ احتساب کے لئے عدالت شرط تو نہیں تاہم عالم بے عمل کر کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر عرفاً خالی اور از قبح بھی نہیں!!

رہی حدیث سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی تو اس میں بھی اسکی ممانعت کی گئی ہے کہ آدمی دوسرے کو تو نصیحت کرے اور خود نصیحت قبول نہ کرے اس سے بھی معلوم ہوا کہ یہ طریقہ خوب نہیں اور اس حدیث میں یہ جو آیا ہے کہ "ورنہ مجھ سے شرماؤ" تو اسکا یہ مطلب نہیں کہ بدون عمل کئے دوسروں کو کہنا حرام ہے بلکہ اسکا مطلب بھی یہی ہے کہ مناسب نہیں اور امر پسندیدہ نہیں اور بلاشبہ ایک عمل کو خود تو نہ کرنا اور دوسروں کو اسکے کرنے کا حکم کرنا باوجودیکہ جائز ہے بلکہ عبادت ہے مگر چونکہ متضمن ہے ایک دوسری عبادت کے ترک کرنے کو اسلئے خالی از قباحت نہیں (یعنی اسکا اثر برا پڑتا ہے۔ عوام میں بے عملی پر جرات بڑھتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اگر اس کام کا کرنا ضروری ہوتا تو یہ واعظ صاحب خود نہ کرتے)۔

نیز محتسب کے لئے عدالت شرط ہونے کی ایک دلیل عقلی وہ لوگ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ دوسروں کی ہدایت فرع ہے خود اپنے ہدایت پر ہونے کی جس طرح سے کہ دوسری چیز کا سیدھا اور درست کرنا فرع ہے خود سیدھا ہونے کی یعنی اصلاح فرع اور شاخ ہے صلاح کی۔ پس جو شخص خود منصلح نہیں ہے۔ وہ دوسروں کی کیا اصلاح کرے گا یعنی جو صالح نہیں ہے وہ مصلح نہیں ہو سکتا۔ لکڑی جب خود ٹیڑھی ہو تو اسکا سایہ جو کہ اسکی فرع ہے کیسے سیدھا ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ دلیل کوئی عقلی دلیل نہیں ہے بلکہ قوت خیالیہ کے اوہام کے قبیل سے ہے اور ایک شے معقول کو امر محسوس پر قیاس کرنا ہے (یعنی ایک ظاہر چیز کو دیکھ کر کسی عقلی چیز کو اسی طرح سمجھ لینا جیسے لکڑی اور اسکا سایہ ایک محسوس چیز ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جیسی لکڑی ہوگی ویسا ہی اسکا سایہ ہوگا۔ لکڑی ٹیڑھی ہو تو اس کا سایہ کیسے سیدھا ہو سکتا ہے۔ اب اسی پر قیاس کر لیا انسان کی صلاح اور اسکی اصلاح کو اور یوں سمجھا کہ جب انسان خود صالح نہیں تو اسکی بات کا دوسروں پر بھی اثر نہ ہوگا یہی معقول کو محسوس پر قیاس کرنا ہے۔ پس قوت واہمہ اور خیالیہ کے نزدیک یہ دلیل چاہے کچھ وقیع ہو مگر عقل کے نزدیک تو اسکا کچھ بھی درجہ نہیں ہے)۔

البتہ احتساب کے لئے عدالت شرط ہونے کی دلیل عقلی کسی درجہ میں یہ ہو سکتی ہے کہ یوں

کہا جائے کہ اگر خود عمل نہ کرنیوالے کو امربالمعروف کی اجازت دیدیجائے محض اس خیال سے کہ امربالمعروف بھی ایک عبادت ہے اور عمل ایک دوسری عبادت ہے (اور یہ کیا ضرور کہ جو آدمی ایک عبادت نہ کرے تو وہ دوسری بھی نہ کرے) تو اسپر کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ اچھا ایک شخص ہے جو وضو کرتا ہے لیکن نماز نہیں پڑھتا یا سحری کھاتا ہے مگر روزہ نہیں رکھتا ٹوکنے پر کہتا ہے کہ وضو کرنا اور سحری کھانا فی نفسہ ایک عبادت ہے اور نماز و روزہ دوسری عبادت ہے (تو اگر میں وضو کرتا ہوں اور نماز نہیں پڑھتا سحری کھاتا ہوں اور روزہ نہیں رکھتا تو کیا برا کرتا ہوں ایک عبادت کا گو تارک ہوں مگر دوسری چیز کو جو کرتا ہوں وہ بھی تو عبادت ہے۔ اب فرمائیے اسکا یہ کہنا کیسا ہے؟) ظاہر ہے اس کا یہ فعل نامشروع ہے اور دلیل نامقبول ہے (بس اسی طرح سے بے عمل کے لئے وعظ کہنا امر شنیع ہے۔ اور یہاں یہ کہنا کہ امربالمعروف بھی ایک عبادت ہے اور عمل کرنا دوسری عبادت ہے ایک کے نہ کرنے کا دوسرے کے کرنے پر کوئی اثر نہیں یہ ایسا ہی ہے جیسے وضو کرنا اور نماز نہ پڑھنا یا سحری کھانا اور روزہ نہ رکھنا پس جس طرح یہ لوگ وضو اور سحری پر بھی ملام ہیں اسی طرح محتسب غیر عادل یعنی غیر عامل پر بھی نکیر کی جائے گی اور احتساب کے لئے عدالت شرط ہوگی)۔

لیکن یہ دلیل بھی صحیح نہیں ہے بلکہ فاسد ہے اسلئے کہ وضو بلا قصد صلوٰۃ اور سحری بدون نیت صوم عبادت ہی نہیں ہے۔ بلکہ غرض وضو سے نماز ہی کا ادا کرنا اور سحری سے روزہ کا رکھنا ہی ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ امور بدون ان مقاصد کے سرے سے معتبر اور مقبول ہی نہیں ہیں۔ بخلاف امربالمعروف کے کہ غیر کو امر کرنے سے مقصود اپنے نفس کا عمل کرنا نہیں ہوتا کہ بدون خود عمل کئے ہوئے دوسرے کو کہنا مقصود سے خالی ہونے کی وجہ سے درست نہ ہو (لہٰذا اصلاح و اصلاح کو وضو نماز یا سحری اور روزہ پر قیاس کرنا بھی صحیح نہیں ہے)۔ اور (جو لوگ احتساب کے لئے عدالت شرط کہتے ہیں انکے) عقلی دلائل کے منجملہ ایک یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی عورت سے زنا بالجبر کرے اور عورت اس فعل کے بعد بھی اپنا ستر کھلا رکھے اور وہ زانی اسکی وجہ سے اسپر احتساب کرے کہ تو اپنا ستر ڈھانک، جانتی نہیں کہ نامحرم کے سامنے ستر کھولنا حرام ہے۔ تو ظاہر ہے کہ اسکا یہ احتساب کس درجہ مضحکہ خیز ہوگا۔ (بس یہی حال عمل نہ کرنے والے مبلغ کا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ احتساب کے لئے محتسب کو خود بھی باعمل ہونا چاہئے) اس دلیل کا جواب یہ ہے کہ یہاں اسکا احتساب کرنا مضحکہ بن گیا اور معیوب سمجھا گیا تو اس جہت سے نہیں کہ اس نے ایک فعل حرام سے اسکو کیوں روکا؟ کیونکہ یہ بات تو فی نفسہٖ مستحسن ہی تھی کیونکہ واقعی ستر کا ڈھانکنا واجب ہے اور ایک واجب کسی حرام کے ارتکاب کرنے کیوجہ سے حرام نہیں ہو جاتا۔ (پس گو اس عورت نے فعل حرام (زنا) کیا مگر اسکی وجہ سے ستر تو اسپر واجب ہی رہا پس اسی کا اس آدمی نے حکم کیا لہٰذا یہ تو کوئی خلاف بات نہ ہوئی) لیکن برائی اور قباحت جو یہاں ہوئی وہ یہ کہ اس شخص نے ایک امر واجب (یعنی ترک زنا)

کو تو ترک کیا اور جو چیز کہ اتنی ضروری نہیں تھی اسکا ارتکاب کیا یعنی اسکو ستر ڈھانکنے کی نصیحت فرمانے لگے۔ یہ چیز عام طبائع کے لئے موجب نفرت ہوا کرتی ہے اور عقل کو اسپر انکار ہوتا ہے جیسے کہ کوئی شخص ہمیشہ زنا کا تو خوگر ہو مگر مال غصب کے کھانے سے احتیاط کرے یا جھوٹی گواہی تو بے تکلف دیا کرتا ہے لیکن غیبت سے پرہیز کرتا ہے تو لوگوں کو ایسے شخص سے کچھ نفرت ہی ہوتی ہے پس اب ہم یہ تو کہہ نہیں سکتے کہ اسکا مال مغصوبہ کا نہ کھانا یا غیبت سے مجتنب رہنا یہ غلط چیزیں ہیں بلکہ یوں ہی کہیں گے کہ اس شخص کا مواخذہ اور عذاب جو حرام بھی کھاوے اور زنا کا بھی مرتکب ہو زیادہ ہوتا ہے اس شخص کے عذاب اور مواخذہ سے جو ان میں سے کسی ایک ہی کا مرتکب ہو۔ اسی طرح سے اس شخص کا ثواب جو دوسرے کو حکم کرنے کے ساتھ ساتھ خود بھی عمل کرتا ہے ظاہر ہے کہ اس کے ثواب سے زیادہ ہے جو صرف ایک ہی کام کرے۔ یعنی مثلاً دوسروں کو کہے اور خود نہ کرے۔ (حاصل یہ کہ اس سے بھی بس یہ معلوم ہوا کہ جب دوسروں کو کہتا ہے تو خود بھی عمل کرے ورنہ اسکا وعظ و تبلیغ بس مذاق ہو کر رہ جائے گا۔ یہ تو نہیں معلوم ہوتا کہ اگر عمل نہیں کر رہا ہے تو وعظ بھی نہ کہے)۔

اسی طرح سے منجملہ عقلی دلیلوں کے ایک یہ ہے کہ (اگر احتساب کے لئے عدالت کو شرط نہ کیا جائے تو پھر اس تقدیر پر لازم آتا ہے کہ کافر کا احتساب بھی مسلمان پر صحیح ہو کیونکہ کوئی کافر اگر کسی مسلمان سے مثلاً یہ کہے کہ زنا مت کرو تو اس بات کے فی نفسہٖ حق ہونے میں کیا کلام ہے رہا یہ کہ وہ کافر ہے تو اسکا کفر اسکے منافی نہیں ہے۔ (کفر کی برائی الگ بات ہے اور نصیحت کی خوبی الگ چیز ہے اس لئے یہ بظاہر جائز معلوم ہوتا ہے) حالانکہ علماء فرماتے ہیں کہ کافر کا احتساب مسلمان پر جائز نہیں ہے (اس سے معلوم ہوا کہ احتساب کے لئے عدالت شرط ہے)۔

جواب اس دلیل کا یہ ہے کہ کافر کا احتساب کرنا مسلم پر جو ممنوع ہے تو وہ اس جہت سے نہیں ہے کہ اس کافر کا کلام فی نفسہٖ حق نہیں ہے بلکہ اس لئے منع ہے کہ احتساب اپنے اندر تحکم اور ایک شان حکومت رکھتا ہے اور کافر کو مسلم پر حکومت کرنے کا حق نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا (یعنی نہیں مقرر کی اللہ تعالیٰ نے کافروں کے لئے مومنوں پر کوئی سبیل (مثلاً حکومت کا استحقاق) باقی فاسق کا یہ حکم نہیں ہے کیونکہ وہ مسلمان ہے اس لئے حکومت کا فی الجملہ اہل ہے۔ چنانچہ ہم یہ نہیں کہتے کہ اس کافر کو قیامت میں اس بات پر عتاب ہو گا کہ تو نے مسلمان سے کیوں کہا تھا کہ زنا مت کرو (کیونکہ یہ نہی عن المنکر تھا اور تو اسکا اہل نہیں تھا لہٰذا تو نے کیوں یہ کام کیا)۔ نہ اس سے یہ مواخذہ ہو گا۔ اور نہ دنیا میں اسکو یہ کہنے کا حق ہی دیا جائے گا۔

(احتساب کی پہلی شرط محتسب کا عاقل و بالغ ہونا تھا اور دوسری شرط

مسلمان ہونا تھا۔ اسکے بیانٗ کے بعد آگے فرماتے ہیں کہ

اسی احتساب کی ایک شرط یہ ہے کہ محتسب کو احتساب پر قدرت بھی ہو اور اگر کوئی شخص عاجز ہے تو اسکا احتساب صرف یہ ہے کہ دل سے اس امر منکر کو برا جانے کیونکہ جو شخص اللہ تعالیٰ کو دوست رکھے گا وہ اسکی نافرمانی کو ضرور برا جانے گا اور یہ سب سے ادنیٰ درجہ ہے)۔
احتساب کی تیسری شرط قدرت ہونا ہے۔

(فائدہ) یعنی نہی عن المنکر کے کئی درجہ ہیں ادنیٰ درجہ یہی ہے کہ دل سے اسکو برا جانے۔ اگر خدانخواستہ اتنا بھی نہ ہوگا تو بڑے ہی نقصان کی بات ہے۔ چنانچہ ایک روایت میں آیا ہے کہ جو شخص بددینوں سے اپنے ہاتھ سے جہاد کرے وہ مومن ہے اور جو ان سے جہاد کرے اپنی زبان سے وہ بھی مومن ہے اور جو شخص ان سے جہاد کرے اپنے قلب سے وہ بھی مومن ہے۔ اور پھر اسکے بعد میں رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان کا حصہ نہیں ہے۔ انتہیٰ (یہ مشکوٰۃ شریف کی حدیث کا ایک ٹکڑا ہے) اور اسکے آخری جملہ کی شرح کرتے ہوئے سید جمال الدین نے لکھا ہے کہ یہ اس لئے کہ جس نے دل سے بھی برا نہ جانا تو گویا راضی ہوا خلاف شرع پر لہٰذا یہ کفر ہوگا۔
اور (بے عمل کا احتساب اس لئے بھی بے اثر ہوتا ہے کہ) گناہ سے منع کرنا محتسب کی غیرت کے سبب ہوا کرتا ہے یعنی جس کو خود غیرت اور حمیت دین کی ہوگی وہی دوسروں کو گناہ کی باتوں سے منع بھی کریگا۔ رہا فاسق اور بے حیا شخص تو اسکو اسکی کیا پرواہ ہے۔ (پرواہ ہوتی تو خود کیوں وہی کام کرتا)۔

(ادب) جو شخص قدرت نہ رکھے اسکے لئے سوا صبر کرنے کے اور چارہ کار ہی کیا ہے۔ آخر کیا کرے۔ ع۔ روز و شب خلق خدا عربدہ نتواں کرد۔ اب دن رات خدا کی مخلوق سے جنگ و جدال تو کیا نہیں جا سکتا۔

(عجز یعنی عدم قدرت کے معنی اور اس کی تفصیلات)

(ادب) جاننا چاہئے کہ مراد عاجز ہونے سے صرف یہی نہیں کہ ظاہری طور سے عاجز ہو جائے بلکہ یہ کہ اس سے فتنہ میں پڑ جانے کا اندیشہ ہو اور اسکے امر و نہی کا نفع بخش نہ ہونا بھی عجز ہی میں داخل ہے۔ چنانچہ یہاں عجز کی کئی صورتیں ہو گئیں۔
اول یہ کہ یہ سمجھے کہ میری بات نفع دیگی اور کسی فتنہ کا بھی اندیشہ نہیں پس اس صورت میں تو احتساب واجب ہے کیونکہ یہاں پوری قدرت حاصل ہے۔
دوسرے یہ کہ یہ جانے کی میری نصیحت نفع نہ کریگی بلکہ کہنے میں اندیشہ ضرر کا ہی ہو اس صورت میں احتساب نہ صرف یہ کہ واجب نہیں بلکہ بعض موقع پر تو حرام ہے۔ اسلئے چاہئے کہ

ایسی جگہ جائے ہی نہیں الایہ کہ کوئی ضرورت ہی پیش آجائے یا کوئی زبردستی پکڑ کر لے جائے اور ایسی جگہ سے ہجرت کرنا اور وطن ہی کو ترک کرنا لازم نہیں مگر یہ کہ لوگ خود اسکو گناہ پر مجبور کریں اور اسکے لئے کوئی مقام فرار بھی ہو۔

تیسرے یہ کہ احتساب سے نفع کی امید تو نہ ہو مگر کسی ضرر کا بھی اندیشہ نہیں ہے پس اس صورت میں بھی احتساب واجب نہیں۔ اسلئے کہ احتساب سے مقصود تو گناہ کا دفعیہ تھا اور یہاں اسکی توقع نہیں۔ لیکن اگر یہاں بھی اس خیال سے احتساب کرے کہ اسمیں شعار اسلام کا اظہار ہے تو مستحب ہے۔

چوتھے یہ کہ احتساب سے نفع بھی ہو اور کسی قدر ضرر بھی لاحق ہونے کا اندیشہ ہو جیسے شراب کی بوتل یا مزامیر وغیرہ کو توڑ تو ڈالے لیکن یہ سمجھتا ہے کہ اسکے بعد میرے سر کی بھی خیر نہیں لوگ اسکو بھی توڑ ڈالیں گے، پس احتساب اس صورت میں بھی واجب نہیں لیکن حرام بھی نہیں ہے۔ بلکہ دین کے کمال اور اسکے تقویٰ کی دلیل ہے۔ مرد مومن کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں کچھ تو تکلیف برداشت کرنی ہی چاہئے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ظالم بادشاہ کے سامنے کلمۃ الحق کہنے کی بڑی فضیلت آتی ہے۔ حضرت ابو سلیمان دارانی "کہتے ہیں کہ بعضے حکام سے میں نے ایک بات سنی چاہا کہ اسپر نکیر کروں اور یہ جانتا تھا کہ اسکی سزا قتل سے نیچے نہیں ہے مگر میں نے نہیں کہا کچھ موت کے ڈر سے نہیں بلکہ یہ دیکھا کہ میرے نفس میں اس کے کہنے سے عجب پیدا ہو جائے گا اور اس حال میں اگر مارا گیا تو غیر مخلص مارا جاؤں گا۔ جان بھی گئی اور میں اخلاص سے خالی گیا' یہ گوارا نہ ہوا اس لیے اس سے کچھ نہ کہا لیکن ہر چیز کی شریعت میں حدود ہے۔ علم دین کے نہ ہونے کی وجہ سے انسان اکثر اوقات غلطی میں پڑ جاتا ہے۔ چنانچہ حق بات کہنے کے بھی مواقع ہیں۔ ایک موقع تو آپ نے یہ دیکھا' دوسرا یہ ہے کہ) اگر کوئی ظالم شخص بیٹھا ہوا ہے اور اسکے ایک ہاتھ میں شراب کا پیالہ ہے اور دوسرے ہاتھ میں تلوار ہے اور محتسب یہ جانتا ہے کہ اگر اسکو ٹوکا تو یہ قتل کر دیگا تو احتساب کی یہاں کوئی گنجائش نہیں ہے بلکہ حرام ہے۔

(ادب) اسی طرح سے جہاں یہ سمجھتا ہو کہ ایک شخص کو گناہ سے منع کرنا دوسرے شخص کے گناہ میں مرتکب ہونے کا سبب بنجائے گا تو یہاں بھی احتساب نہ کرے۔ اس لئے کہ احتساب سے مقصود تو نفس گناہ کو ختم کرنا تھا نہ کہ کسی خاص شخص (مثلاً زید) کے گناہ کا استیصال اور جب زید کو روکا اور وہ بعینہٖ سبب بن گیا عمر کے کرنے کا تو اس سے کیا فائدہ ہوا۔ اصل گناہ تو باقی ہی رہا۔ (پس یہ بھی ایسا ہی ہوا جیسے کہ ایک شخص کو احتساب کر کے شراب سے روکنا چاہا اب وہ اس سے رکا یا نہ رکا قتل کے گناہ کا مزید مرتکب ہو گیا)۔

(ادب) محتسب کے لئے منکرات کے مراتب کی رعایت بھی لازم ہے یعنی یہ دیکھے کہ

جس منکر کو ختم کرنا چاہتا ہے اسکی نسبت اس منکر کے ساتھ کیسی ہے جو اسکے احتساب کے سبب پیدا ہونے والی ہے۔ پس اگر ختم ہونے والے منکر کا مرتبہ پیدا ہونے والے منکر کے برابر یا اس سے کم ہے تو احتساب نہ کرے اور اگر زیادہ ہے تو کرے یعنی ایک بڑی برائی مٹ کر چھوٹی برائی پیدا ہو سکتی ہو تو احتساب کر کے بڑی کو ختم کر دے۔

(ادب) اس معاملہ میں ظن اور گمان کا مرتبہ یقین کے برابر ہے۔ پس اگر ضرر پہنچنے کا گمان غالب ہو تو یہ بھی حکم میں یقین ہی کے ہے باقی شک اور وہم کے بارے میں اختلاف ہے یعنی بعضوں نے اسکا اعتبار کیا ہے اور بعضوں نے نہیں (جس امر میں دو احتمال ہوں تو اگر قلب کا رجحان کسی جانب نہ ہو یعنی دونوں جانب مساوی ہوا سے شک کہتے ہیں اور اگر ایک جانب راجح ہو اور دوسرا مرجوح تو جانب راجح کو ظن کہتے ہیں اور جانب مرجوح کو وہم۔ دوسرے لفظوں میں اس کو یوں سمجھئے کہ اگر روپیہ میں آٹھ آنہ خیال ہے ضرر کا اور آٹھ آنہ ہے کہ ضرر نہ ہو گا تو اسکو کہا جائیگا کہ ضرر کا شک ہے۔ اور اگر بارہ آنہ خیال ہے کہ ضرر ہو گا اور چار آنہ خیال ہے کہ ضرر نہ ہو گا تو ان دونوں میں سے اول کا نام ظن ہے اور ثانی کا وہم)۔ اسی طرح سے خوف میں بھی معتبر سلامتی طبع اور اعتدال خلقت ہے یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے میں ضرر کا اندیشہ اس شخص کا معتبر ہے جو مزاج اور خلقت کے اعتبار سے معتدل ہو۔ کیونکہ بزدل آدمی تو معمولی چیز سے بھی ڈر جاتا ہے اور نڈر اور دلیر آدمی امور شاقہ پر بھی جری ہو تا ہے لہٰذا معتبر انسان کی شجاعت ہو گی کہ متوسط درجہ یہی ہے (نہ کہ جبن و تہور) پس اگر مرد شجاع کو خوف ہو تو اسکا اعتبار ہے ورنہ نہیں چنانچہ یہی معتبر ہے کشتی کے سوار ہونے میں یعنی بعض لوگ تو بہت ڈرتے ہیں کشتی میں سوار ہونے سے اور بعضے بالکل نہیں ڈرتے۔ یعنی اگر ہوا مخالف بھی ہو تب بھی کشتی میں سوار ہو جاتے ہیں پس اس میں بھی اعتبار متوسط درجہ کے لوگوں کا ہے یعنی جو موافق ہوا میں نہیں ڈرتے۔ اب اگر حج اسلام کے جانے میں ایسے لوگ ڈوب جانے کا اندیشہ کریں اور اسکا انہیں گمان غالب ہو اسلئے کشتی پر سفر کی ہمت نہ کریں تو اسکا اعتبار ہے اور یہ لوگ معذور متصور ہونگے، نہ وہ لوگ جو نفس کشتی ہی میں سوار ہونے سے ڈریں اگرچہ ہوا وغیرہ کچھ بھی نہ ہو اس خوف کا اعتبار نہیں اور شرعًا یہ عذر بھی نہیں ہے۔ یوں بعضوں نے کہا ہے کہ جس شخص پر بزدلی غالب ہو اسکو سفر حج کے لئے کشتی پر سوار ہونا بہتر نہیں۔ باقی مختار قول اول ہی ہے اسلئے کہ اس نوع کی بزدلی کا ازالہ مشق کرنے اور عادت ڈالنے سے ممکن ہے۔ واللہ اعلم

(کس قدر ضرر اور تکلیف مجوز ترک احتساب ہے!)

جاننا چاہئے کہ اس ضرر اور مکروہ کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں جو کہ درباره احتساب لوگوں کو

پیش آیا کرتی ہیں۔ چنانچہ بعض نفوس کو ذرا سخت بات سے بھی ایذاء ہو جاتی ہے اور بعضوں کو مارنے اور گالی دینے سے تکلیف ہوتی ہے (اس سے کم کو وہ برداشت کر لیتے ہیں) اسی طرح اور امور بھی علی اختلاف الوضع والعادۃ۔ اور لوگوں کے انکی قدر و منزلت، عزت و حرمت کے اعتبار سے مختلف درجات ہیں لہٰذا تفصیل بیان کرنا (یعنی یہ تعیین کر دینا کہ یہ فرد ضرر اور یہ قسم مکروہ مجوز ترک احتساب ہے ذرا) مشکل ہے۔ تاہم بطور قاعدہ کلیہ کے (کہا جا سکتا ہے کہ) علماء نے فرمایا ہے کہ مکروہ ضد ہے مطلوب کی۔ یعنی بعض چیزیں تو وہ ہیں جنکی انسان خواہش رکھتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ اسکو حاصل ہو جائیں یہ تو مطلوب کہلاتی ہیں۔ اور بعض چیزیں ایسی ہیں جن کو برا جانتا ہے اور ناپسند کرتا ہے، چاہتا نہیں کہ وہ اسکے پاس آویں انکو مکروہ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اس دنیا میں انسان کے لئے مطلوب چار چیزیں ہیں۔ علم۔ صحت۔ ثروت۔ جاہ۔ علم کا تعلق اسکی روح سے ہے۔ صحت کا تعلق اسکے بدن سے ہے۔ ثروت متعلق ہے مال کے ساتھ اور جاہ کا تعلق قلوب ناس سے ہے۔ اور جاہ کے معنی ہیں لوگوں کے قلوب کا مالک ہو جانا جسطرح سے کہ ثروت کے معنی ہیں روپیہ پیسہ کا مالک ہو جانا اور جس طرح سے درہم دنانیر کا مالک ہونا اسلئے مطلوب ہے کہ وہ وسیلہ اور ذریعہ بنتا ہے مطالب کے تحصیل کا اسی طرح سے لوگوں کے دلوں کا بھی مالک ہونا اس لئے مطلوب ہوتا ہے کہ وہ بھی واسطہ ہوتا ہے مقاصد کے حصول کا۔

باقی یہ کہ جاہ کی حقیقت کیا ہے اور طبیعت کا میلان ادھر کیوں ہوتا ہے۔ یہ امر تفصیل طلب ہے (کتب طریق مثلاً احیاء العلوم وغیرہ سے اسے معلوم کرنا چاہئے یہاں تفصیل کا موقعہ نہیں) حاصل یہ کہ کوئی دنیاوی مطلوب ان چار چیزوں سے خالی نہیں پھر ان چیزوں کا طلب کرنا یا تو اپنے لئے ہوا کرتا ہے یا اپنے عزیز قریب اور احباب کے لئے ہوتا ہے۔

الغرض جب مطلوب کی فہرست معلوم ہو گئی تو اسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مکروہ کیا چیزیں ہیں اور وہ یہی کہ ان سب امور کا نہ ہونا ہی مکروہ ہے اور اس کے نہ ہونے کی دو ہی صورتیں ہیں کبھی تو یوں ہوتا ہے کہ پہلے وہ چیز حاصل تھی۔ بعد میں ختم ہو گئی اور کبھی یوں کہ وہ حاصل تو نہیں ہے مگر ہو سکتی ہے اور اسے اسکا انتظار بھی ہے۔ بس ترک احتساب اس قسم اخیر (والے مکروہ) میں جائز نہیں مگر یہ کہ ضرورت اور مجبوری ہی ہو تو خیر ترک کر سکتا ہے۔

(فائدہ) حضرت شیخؒ کے ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ حصول مکروہ کی ایک قسم تو یہ ہے کہ مطلوبات اس کو حاصل ہیں لیکن وہ یہ سمجھ رہا ہے کہ اگر میں احتساب کرونگا تو یہ چیزیں (سوائے عمر کے) جاتی رہیں گی (یعنی صحت خراب ہو جائیگی مال ختم یا کم ہو جائے گا۔ لوگوں کے نزدیک جو جاہ مجھے حاصل ہے اس میں فرق آجائے گا) پس اس صورت میں (کہ اس کا حاصل شدہ مطلوب ضائع ہو رہا ہے اور اسطرح پر گویا اسے مکروہ پہونچ رہا ہے لہٰذا) ترک احتساب جائز ہے۔

اور دوسری قسم یہ ہے کہ وہ مطلوبات اور مرغوبات فی الحال اسکو حاصل تو نہیں لیکن انکا حصول ممکن اور متوقع ضرور ہے (مگر اندیشہ ہے کہ اگر یہ احتساب کریگا تو شاید وہ حاصل نہ ہوں) اس صورت میں ترک احتساب جائز نہیں الا بضرورۃ (کیونکہ جو چیز حاصل ہی نہیں ہے اس کا حصول صرف محتمل ہے۔ وہاں ضیاع اور نقصان کا کیا سوال زیادہ سے زیادہ اسکو عدم نفع کہا جاسکتا ہے ضرر نہیں کہا جاسکتا۔)

۱۔ مزید تفصیل سے اس بات کو یوں سمجھو کہ اگر کوئی شخص مثلاً ضروریات دین ہی کو نہ جانتا ہو اور سوا ایک تعلیم کرنے والے کے شہر میں کوئی اور دوسرا معلم نہ ہویا ہو لیکن سب مطیع اور تابع معلم کے ہوں اور ظن غالب سے یہ بات معلوم ہو جائے کہ اگر اس معلم کو احتساب کروں گا تو (وہ ناراض ہو جائے گا اور) تحصیل علم کا دروازہ ہی بند ہو جائے گا تو اس صورت میں (اسکا مطلوب "علم" جو کہ ابتک اسکو حاصل نہیں تھا مگر حاصل ہو سکتا تھا اس کے احتساب سے فوت ہو رہا ہے) لہٰذا اس اندیشہ سے وہ اگر احتساب ترک کردے تو جائز ہے کیونکہ ضروریات دین کا علم ایک امر ضروری ہے یوں بلا ضرورت ترک کردے تو جائز ہے

۲۔ اسی طرح سے مثلاً کوئی مریض ہے جو کسی طبیب کے زیر علاج ہے اور صحت کا منتظر ہے اور جانتا ہے کہ تاخیر صحت میں اسکا ضرر شدید ہے اور اتفاق سے اس شہر میں اس سے بہتر کوئی طبیب بھی نہیں ہے (اب اگر طبیب صاحب کو احتساب کیا جاتا ہے تو ہو سکتا ہے کہ خفا ہو جائیں اور علاج بند کردیں اس خیال سے اگر یہ مریض اس کو کسی بری بات سے منع نہ کرے تو جائز ہے (پس یہاں بھی اس مریض کا مطلوب یعنی صحت جو کہ سردست اسکو حاصل نہیں ہے لیکن علاج سے نفع ہے اس لئے امید ہے کہ عنقریب حاصل ہو جائے گی اور احتساب سے اس کے فوت ہونے کا اندیشہ ہے تو چونکہ حصول صحت بھی ایک امر ضروری ہے اور تاخیر میں ضرر تھا اس لئے یہاں بھی احتساب ترک کرنے کی اجازت ہوگی۔

۳۔ اسی طرح سے فرض کرو کہ ایک شخص ہے جو کہ کسب سے بھی اور سوال کرنے سے بھی عاجز ہے اور اسکو توکل کا مقام اور اللہ تعالیٰ کی رزاقیت کا کامل یقین بھی حاصل نہیں ہے اور اس بستی میں صرف ایک شخص ہے جو اس کو کچھ دے دیا کرتا ہے دوسرا کوئی ایسا نہیں ہے اور یہ فقیر جانتا ہے کہ اگر اس کو میں کسی امر منکر پر احتساب کرونگا تو میری روزی کی رہی سہی راہ بھی ماری جائے گی اور بھوک کی وجہ سے میں ہلاک ہو جاؤں گا یا پھر مجھے حرام میں مبتلا ہونا پڑیگا تو اس صورت میں بھی اگر یہ فقیر اس کو کسی امر منکر سے نہ روکے اور خاموش رہے تو جائز ہے (تو دیکھو یہاں بھی اس غریب کا مطلوب یعنی "مال" جو کہ اسوقت اس کے پاس پہلے ہی سے مفقود ہے مگر آئندہ ملتے رہنے کی اس کو امید ضرور ہے۔ اس متحمل مال کے بھی نہ ملنے اور بند ہو جانے کا بوجہ احتساب کے اسکو اندیشہ ہے

اور مال یعنی (رزق) ضروریات زندگی میں سے ہے لہٰذا اس کی وجہ سے اس غریب کے لئے اس امیر پر احتساب نہ کرنا جائز ہے۔

۴۔ اسی طرح کسی بستی میں مثلاً کچھ شریر اور بددین قسم کے لوگ ہیں جو ایک صالح شخص کے درپے ایذا رہتے ہیں اور اس کے لئے ان سے بچاؤ کی سوا اسکے کوئی سبیل نہیں کہ حاکم یا سلطان سے اس کے جو تعلقات ہیں ان سے کام لے۔ لیکن حاکم ایسا ہے جو کہ شراب خور ہے یا ریشم پہنتا ہے جو کہ حرام ہے۔ پس ان صورتوں میں اگر ظن غالب یعنی قریب بہ یقین کے یہ بات ہو کہ اگر میں اس سے احتساب ترک کروں گا تو میرا مقصد حاصل ہو جائے گا تو ہو سکتا ہے کہ اس کو ترک احتساب کی شرعاً اجازت ہو۔ لیکن انسان کو چاہئے کہ ایسی صورتوں میں اپنے دل سے فتویٰ لے اور اپنی عزت و حرمت۔ جاہ و منزلت کے فوت ہونے کا ضرر (جو کہ شریروں کی جانب سے پیش آتا ہے) اور ترک احتساب کا ضرر (جس پر انکا حصول محتمل ہے) ان دونوں نقصانوں کو تولے اور وزن کرے جون سا غالب ہو اس کی رعایت کرے اور اسی کو مد نظر رکھے باقی دنیا حاصل کرنے کا بہانہ دین کو نہ بنائے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تو نیت اور سرائر کو خوب جاننے والے ہیں اگرچہ لوگ صرف ظاہر کو دیکھتے ہیں۔

یہ خوب سمجھ لو کہ اگر سکوت کا منشاء امر دین ہے تو اس کو مدارات کہتے ہیں اور اگر نفس کے سبب سے ہو تو اس کا نام مداہنت ہے۔ باقی اللہ تعالیٰ ہی توفیق دینے والے ہیں اور پھر اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں اپنے نفس کے شرور اور اپنے اعمال کی برائیوں سے۔

(شیخ ؒ نے بڑی ہی عمدہ بات بیان فرمائی مدارات اور مداہنت کا فرق یاد رکھنے کی چیز ہے اور ایک کو دوسرے سے خلط نہیں کرنا چاہئے) یہاں تک تو تفصیل کردہ کی قسم دوم کی تھی جہاں کہ امر مطلوب حاصل نہیں ہوتا۔ چنانچہ امر مطلوب کی چاروں اقسام کے اعتبار سے چار مثالیں بطور لف و نشر مرتب کے بیان کردیں۔ اور قسم اول جہاں کہ حاصل شدہ مطلوب کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو وہاں بہر حال احتساب سے سکوت سب صورتوں میں جائز ہے سوا "علم" کے۔ کیونکہ علم کے فوت ہونے کا کوئی احتمال ہی نہیں اور نہ کسی کو اس پر قدرت ہے کہ کسی کا علم ضائع کردے (ہاں صحت ضائع کر سکتا ہے۔ مال اور جاہ بھی برباد کر سکتا ہے مگر علم کا نقصان اس کے قبضہ میں نہیں۔ چنانچہ علم کے فضل اور بزرگی کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ وہ ایک باقی اور دائم رہنے والی شے ہے اس کو زوال نہیں ہے جیسا کہ حضرت علیؓ فرماتے ہیں۔

فَإِنَّ الْمَالَ يَفْنِىْ عَنْ قَرِيْبٍ　　　وَإِنَّ الْعِلْمَ مُلْكٌ لَا يَزَالُ

یعنی بلاشبہ مال تو عنقریب فنا ہو جائے گا اور علم ایک لازوال ملک ہے (یہ دوسرا شعر ہے جس کو شعر اول کی دلیل میں فرمایا ہے پہلا شعر یہ ہے۔

رَضِینَا قِسْمَۃَ الْجَبَّارِ فِینَا لَنَا عِلْمٌ وَلِلْجُھَّالِ مَالٌ

یعنی ہم خدائے جبار کی اس تقسیم پر دل و جان سے راضی ہیں کہ ہم کو علم (دین) دیا اور جاہلوں کو مال دیا۔

اس کے بعد وہی شعر ہے۔ اس لئے کہ مال تو عنقریب ختم ہو جانے والی چیز ہے اور علم ایک دولت لازوال ہے۔ پس علم کو تو نقصان نہیں۔ رہی صحت تو وہ کسی کے مارنے یا دکھ پہنچانے سے برباد ہو سکتی ہے۔ اسی طرح سے ریاست اور امیری بھی جا سکتی ہے کہ کوئی گھر بار ہی کو لوٹ لے اور کپڑے بھی چھین لے جائے۔ پس ان صورتوں میں احتساب کرنا واجب تو نہیں رہ جاتا البتہ مستحب ضرور ہے بلکہ ایسے مواقع پر احتساب کرنا انسان کے کمال دین اور پختگی یقین کی علامت ہے۔

اسی طرح سے انسان کی جاہ بھی کسی کے مارنے سے فوت ہو سکتی ہے۔ چاہے وہ ضرب شدید نہ ہو یعنی کوئی عضو ٹوٹ پھوٹ کر تکلیف دہ نہ بھی ہوا ہو۔ بلکہ اس سے بھی کم عمل مثلاً کسی کا اسکو گالی دیدینا یا اس کی پگڑی اتار کر پھینک دینا وغیرہ ان سے بھی جاہ فوت ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس اندیشہ سے بھی ترک احتساب کرنا اور سکوت اختیار کرنا جائز ہے۔ کیونکہ اپنی عزت اور آبرو کی حفاظت بھی شرعاً مامور بہ ہے۔ تاہم نری جاہ اور بلندی مرتبہ کی حفاظت کی فکر رکھنا امر عبث ہے بلکہ خالص نفسانیت ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھو کہ ایک شخص ہے جو کہ بدون گھوڑے پر سوار ہوئے اور بغیر پر تکلف لباس زیب تن کئے ہوئے بازار میں کبھی نکلتا ہی نہیں اور احتساب کی وجہ سے اس کو اندیشہ ہے کہ مجھے سواری ختم کرنا ہو گا اور پیدل چلنا ہو گا اور معمول کے خلاف لباس بھی پہننا پڑیگا تو ترک احتساب کے باب میں یہ عذر کوئی عذر نہیں ہے بلکہ ایک امر لغو اور فضول سی بات ہے۔ اسی طرح سے یہ خوف کہ لوگ میری غیبت کریں گے یا زبان سے میری اہانت کریں گے مثلاً مجھے جاہل اور احمق وغیرہ کہیں گے یا ریاء اور نفاق کے ساتھ متہم کریں گے تو یہ سب بھی کوئی عذر نہیں ہے اس لئے کہ اگر ایسے امور کا اعتبار کیا جائے اور اتنی ذرا ذرا سی بات بھی مجوز ترک احتساب ہو جایا کرے تو پھر تو سرے سے احتساب ہی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ حالانکہ وہ ایک امر واجب ہے۔ پھر یہ کہ احتساب کا تو ایسے امور سے خالی ہونا ممکن بھی نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَۃَ لَائِمٍ یعنی یہ لوگ ملامت کرنے والوں کی ملامت سے ڈرتے نہیں اور اس کی پرواہ نہیں کرتے (اس سے معلوم ہوا کہ نیک کام کرنے والوں پر لوگ ملامت بھی کرتے ہیں اور ان کو اسکی پرواہ نہ کرنی چاہئے۔ کیونکہ یہ ارشاد مقام مدح میں فرمایا ہے)۔

(ادب) اگر کسی کو غیبت سے منع کرتا ہے اور یہ جانتا ہے کہ منع کرنے سے وہ دوسروں کی غیبت تو چھوڑیگا نہیں بلکہ خود اس محتسب کی بھی غیبت کرنے لگ جائے گا تو منع نہ کرے کیونکہ اس سے تو وہ کم گناہ سے زیادہ گناہ میں مبتلا ہو گیا اور اسکا سبب یہ محتسب ہو گا اور اگر یہ سمجھتا ہے کہ

میرے احتساب کرنے سے یہ شخص دوسروں کی غیبت سے تو باز آجائیگا لیکن اسکے عوض میری غیبت شروع کردے گا تو اس کو احتساب کرے (اور دوسروں کی مصیبت اپنے سر اوڑھ لے) کہ یہ ایثار ہے جو کہ محمود ہے۔

یہاں تک تو بیان تھا اس خوف کا جو کہ خود اپنے نفس پر مکروہات کے پیش آنے سے ہو سکتا تھا اور جہاں خوف ہو اپنے اقربا اور احباب کو کسی مکروہ کے پہونچنے کا بہ سبب اس کے احتساب کے۔ تو وہاں بھی اجازت ہے کہ احتساب ترک کردے بلکہ اولیٰ وانسب اسے ترک کر دینا ہی ہے کیونکہ دوسروں کو تکلیف سے بچانا مقدم ہے اپنے آپ کو مکروہ سے بچانے سے

(احتساب کے لئے اذن امام شرط نہیں ہے)

جاننا چاہئے کہ بعض علماء نے احتساب میں اذن امام کو بھی شرط قرار دیا ہے یعنی امام المسلمین کی جانب سے جو شخص محتسب مقرر ہو اور جسے امیر المومنین اجازت دیں بس وہی احتساب کر سکتا ہے دوسرا کوئی نہیں لیکن صحیح یہ ہے کہ اس کے لئے امام کی اجازت شرط نہیں ہے کیونکہ آیات اور روایات جو اس باب میں وارد ہیں ان سے اطلاق اور عموم ہی معلوم ہوتا ہے اس لئے احتساب کے عام حکم کو اذن امام کے ساتھ خاص کرنا غلو فی الدین اور شرعاً ایک بے وزن سی بات ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ احتساب چونکہ ایک قسم کی حکومت ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ کافر اسکا اہل نہیں ہوتا لہٰذا اس کا ثبوت اور حق عام کیسے ہو سکتا ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے۔ ہے کہ امام (حاکم مسلم) جس کو حکومت کا یہ شعبہ بخشے اسی کو یہ اجازت ہونی چاہئے۔ تو اس کے جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ اس قدر حکومت تو ہر مومن کو بوجہ اس کے دین اور معرفت کے دوسروں پر حاصل ہے اور احتساب میں ہوتا ہی کیا ہے۔ دین کا بتانا اور سکھانا احکام شرعی کا۔ پس کسی کو دین کی کوئی بات بتا دینا اور کسی مسئلہ میں حکم شرعی سے واقف کر دینا یہ بات بھلا اذن امام پر کیسے موقوف ہو سکتی ہے؟

اور تحقیقی بات اس باب میں یہ ہے کہ خود احتساب کے کئی درجے ہیں۔

۱۔ اول۔ کسی کو دین کی کوئی بات صرف بتلا دینا اور حکم شرعی سے واقف گردان دینا۔ بس

۲۔ دوم یہ کہ پند و نصیحت کے لئے عوام میں وعظ کہنا۔

۳۔ سوم۔ یہ کہ اگر کہیں نرمی سے کام نہ چلے تو ذرا گرمی سے بھی کام لے لینا یعنی ڈانٹ ڈپٹ کر کے اور سختی کے ساتھ کوئی بات کہنا مثلاً کسی کو جاہل اور احمق وغیرہ کہہ دینا۔

۴۔ چہارم۔ زبردستی اور بجبر نہی عن المنکر کرنا۔ مثلاً آلات لہو کو توڑ ڈالنا شراب کے برتن کو اوندھا کر دینا اور غصب کئے ہوئے کپڑے وغیرہ کو غاصب سے چھین لینا۔

۵ پنجم۔ سزا اور عتاب کی دھمکی دینا۔ مثلاً یہ کہ ایسا کروگے تو بند کرا دونگا یا ایسا نہ کروگے تو

پچاس بید رسید کرونگا۔

پس جو احتساب کہ مشروط ہے اذن امام کے ساتھ وہ یہی اسکا پانچواں درجہ ہے کیونکہ اس قسم میں ضرورت پڑے گی لڑنے مارنے کی (اور اس کے لئے قوت شوکت پولیس اور فوج کی ضرورت ہو گی۔ اور ظاہر ہے کہ وہ بدون اذن امیر کیسے آسکتی ہے اس لئے اس مرتبہ کے لئے اذن امام شرط ہے) باقی صرف مسئلہ کسی کو بتا دینا۔ یا وعظ وغیرہ کہ دینا یہ تو بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ ان کے لئے اذن امام کی شرط لگانے کی کوئی معنی ہی نہیں۔

اسی طرح سے کسی جاہل اور احمق کو اگر جاہل اور احمق کہ دیا تو کیا غلط کہا (غلطی اس کی ہے جو اپنے جہل و حمق کو تو دور نہ کرے اور الٹے عالم سے تکبر کرے۔ پس یہ بھی اذن امام کا محتاج نہیں) الا یہ کہ ان مذکورہ درجات میں سے کوئی درجہ ہی بڑھتے بڑھتے پانچویں درجہ کو پہنچ جائے تب بلاشبہ اس میں اذن امام کی ضرورت ہو گی (یعنی صرف مسئلہ بتایا تھا یا وعظ کہا تھا اور بات بڑھ گئی اس لئے یہ کام بھی یا تو وہ شخص کرے جس کو اپنے نفس پر پوری قدرت حاصل ہو ورنہ تو بدون اذن امام کے ان ابتدائی درجات کی بھی جسارت نہ کرے) واللہ تعالیٰ اعلم

نیز یہ کہ گزشتہ علماء اور بزرگان دین کی حکایات اور واقعات ان کے احتساب کے متعلق جو انہوں نے امراء اور سلاطین پر کئے تھے بکثرت منقول ہیں۔ ان سب کے دیکھنے سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ احتساب اذن امام پر موقوف نہیں ہے (کیونکہ اکثر نے انمیں سے ان کے احتساب پر کوئی احتساب نہیں کیا اور بعضوں نے اگر کیا بھی ہے۔ یعنی یہ کہ ان سے پوچھا ہے کہ آپ کو محتسب کس نے بنایا تو ان علماء حقانی نے اس کا برجستہ جواب دیا ہے کہ مجھے محتسب اسی نے بتایا ہے جس نے تمہیں بادشاہ بنایا ہے۔ چنانچہ ان کے اس جواب پر امراء کو خاموش ہونا پڑا)۔

فصل سوم

جن امور پر احتساب کیا جائے ان کے شرائط کا بیان

منجملہ اس کی شرائط کے ایک یہ ہے کہ وہ کوئی امر منکر ہو اور منکر سے مراد یہ ہے کہ شریعت نے اس کے کرنے سے منع کیا ہو جس کا حاصل یہ ہے کہ منکر معصیت سے عام ہے (یعنی بعض اوقات ایک چیز منکر یعنی غیر پسندیدہ اور بری ہوتی ہے مگر معصیت یعنی گناہ نہیں ہوتی اس کی مثالیں آگے آتی ہیں) اور احتساب کچھ معصیت ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص کسی نابالغ لڑکے یا دیوانے کو (جو شرعاً مکلف نہیں ہیں) شراب پیتا ہوا دیکھے تو اس پر واجب ہے کہ

اس کو منع کرے اور شراب چھین کر پھینک دے اسی طرح سے اگر یہ دیکھے کہ کوئی دیوانہ یا کسی دوسرے دیوانے کے ساتھ برا فعل کر رہا ہے تو اس سے بھی روکنا واجب ہے۔ حالانکہ یہ چیزیں ان دونوں کے حق میں معصیت نہیں ہیں لیکن ایک امر منکر یعنی ممنوع شرعًا ضرور ہے (اس لئے اس کے سرسے بھی روک ٹوک کی جائے گی۔ نیز احتساب کئے جانے کے لئے یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ وہ چیز گناہ کبیرہ ہی ہو بلکہ صغیرہ پر بھی احتساب جاری ہوتا ہے۔ (اور یہ اس لئے کہ اکثر چھوٹا گناہ بڑے گناہ کا ذریعہ اور واسطہ بن جایا کرتا ہے لہٰذا جب بڑے گناہ سے روکنا ضروری ہے تو جو اس کا مقدمہ بنے اس سے بھی لوگوں کو باز رکھنا ضروری ہو گا۔ کیونکہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو لوگوں کے اندر تقویٰ نہ پیدا ہو سکے گا اور انسان شرافت اور انسانیت کا راستہ ہی نہ جان سکے گا)

اسی طرح سے محل احتساب کے لئے ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ چیز فی الحال پائی جا رہی ہو۔ پس وہ گناہ جو کیا جا چکا ہے اس پر ہر ایک کو حق احتساب حاصل نہیں ہے بلکہ وہ موقوف ہے حاکم پر۔ اسی طرح سے جو چیز فی الحال موجود نہ ہو لیکن احتمال ہو اس کے موجود ہونے کا اس پر بھی احتساب صحیح نہیں کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ واقع نہ ہو۔ اسی طرح سے اگر کسی مجلس کو آراستہ پیراستہ دیکھا اور قیاس و قرینہ سے اس نے معلوم کیا کہ یہاں شراب کا بھی دور چلے گا تو اگر وعظ و نصیحت کردے تو جائز ہے لیکن محض اس گمان پر شراب نوشی سے اجتناب کا وعظ کہنا واجب نہیں ہے اور اگر اہل مجلس اس قسم کے خرافات کے منکر ہوں یعنی شراب کے دور چلنے کی نفی کر رہے ہوں تو پھر مخصوص طور سے اس وقت اس کی نصیحت بھی نہ کرے کہ اس میں ان کے ساتھ بد گمانی ہے (جس کی شرعًا اجازت نہیں ہے) اور اگر قرینہ بالکل ظاہر اور قوی ہو (کسی معصیت ہی کا) لوگوں کی عادت قدیمہ کو دیکھتے ہوئے مثلاً یہ کہ کوئی شخص عورتوں کے حمام کے دروازے پر بیٹھا ہوا ہے تو جائز ہے کہ اس کو منع کر دے یعنی کہہ دے کہ اٹھو یہاں سے یہاں کیوں بیٹھے ہو کیونکہ ہر چند یہ احتمال ہے کہ کسی اور غرض کے لئے بیٹھا ہو لیکن قوی احتمال یہی ہے کہ انکے گھورنے کے لئے اور ان سے ناجائز تعلق قائم کرنے کے لئے بیٹھا ہے اور ہو سکتا ہے کہ وہاں بیٹھنے، غرض لوگوں کے اختلاف احوال کی بنا پر مختلف ہو مثلاً کوئی شخص جو زنا کار ہے وہاں بیٹھا ہے تو قرینہ قوی برائی ہی کا ہو گا اور اگر کوئی متقی شخص بیٹھا ہوا ہے تو احتمال قوی اسکا ہو گا کہ کسی اور کام کے لئے بیٹھا ہو اور یہی فرق کیا جا سکتا ہے بوڑھے اور جوان میں باقی ظن غالب اس جگہ تعین کے قائم مقام ہے (یعنی جن امور کی بنا یقین پر ہوا کرتی ہے وہ یہاں ظن غالب پر بھی ہو جائے گی)

منجملہ شرائط محل احتساب کے ایک یہ ہے کہ وہ امر منکر محتسب پر ظاہر بھی ہو اس کو اس کی کوئی ٹوہ نہ کرنی پڑے کہ تجسس حرام ہے چنانچہ اس سلسلہ میں اسلاف کے واقعات مسلمانوں کے حقوق کے بیان میں گزر چکے ہیں اب گفتگو اس میں ہے کہ کسی منکر کے ظاہر ہونے یا پوشیدہ ہونے

کی حد کیا ہے چنانچہ علماء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے گھر کے اندر کوئی گناہ کرے اور گھر کا دروازہ بند کر لے تو محتسب کو تحقیق حال کے لئے گھر کے اندر جانا جائز نہیں مگر یہ کہ گھر کے اندر ہونے والے گناہ کا اثر اور اس کی نشانیاں گھر کے باہر ظاہر ہو رہی ہوں مثلاً گانے بجانے کی آواز یا شرابیوں کی نشہ کی حالت کی گفتگو جسے لوگ سڑک اور گلیوں سے سن رہے ہوں تو اس صورت میں احتساب واجب ہے اور اگر دیوار کے پیچھے سے شراب کی بو آرہی ہو تو اگر قرینہ سے معلوم ہو جائے کہ یہ اس شراب کی بو ہے جسے خرید کر حفاظت کے ساتھ گھر میں رکھا گیا ہے تو اس شراب کے گرانے اور بہا دینے کا قصد نہ کرے ہاں اگر یہ جانے کہ یہ پی ہوئی شراب کی بو ہے جو شرابیوں کے منہ سے آرہی ہے تو اس میں علماء کا اختلاف ہے ظاہر یہی ہے کہ اس میں احتساب جائز ہو اور اگر کسی شخص کو دیکھے کہ وہ کوئی بوتل اپنے بغل میں دبائے یا دامن کے پیچھے چھپائے لئے جا رہا ہے تو گو کہ وہ شخص فاسق ہی ہو اس کی چھپی ہوئی بوتل کا کھولنا جائز نہیں یہاں تک کہ وہ اپنے آثار اور علامت سے خود ہی نہ ظاہر ہو جائے اور محض اسکے فاسق ہونے کی وجہ سے یہ حکم نہیں لگا سکتے کہ وہ شراب ہی ہے اس لئے کہ فاسق کو بھی سرکہ وغیرہ کی ضرورت پڑا کرتی ہے شاید وہی لئے جا رہا ہو رہا اسکا چھپا کر لے جانا تو اس کو بھی شراب ہونے کی دلیل نہیں بنا سکتے اس لئے کہ چھپانے کے بھی بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں ہاں اگر اس کی بو پھیلی ہو تو اس کو کھول سکتے ہیں (اور ٹوک سکتے ہیں کہ دکھلاو کہ دامن کے پیچھے کیا ہے اور شراب کی بوتل ہونے پر توڑ سکتے ہیں)

اسی طرح سے اگر کوئی شخص گانے بجانے کا کوئی آلہ کپڑے کے نیچے چھپا کر لئے جا رہا ہو اور باہر سے اس کی شکل معلوم ہو رہی ہو جس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ فلاں باجہ ہے تو اس کو بھی کھولنا جائز ہے کیونکہ یہاں بھی علم حاصل ہو چکا ہے بذریعہ ہیئت اور شکل کے نظر آنے کے جس طرح سے کہ پہلی صورت میں بو سے معلوم ہو گیا تھا کہ شراب ہے پس یہ علم کے بعد کھولنا ہوا نہ کہ علم کے لئے کھولنا اور تجسس یہی دوسری صورت ہے نہ کہ پہلی۔

چنانچہ یہ جائز نہیں ہے کہ علم سے پہلے اس سے کھولنے کے لئے کہے یعنی کہے کہ کھول دیکھوں تیرے کپڑے کے نیچے کیا ہے کہ یہ تجسس ہے اور تجسس کے معنی ہیں معرفت کی نشانی طلب کرنا اور اگر نشانی خود بخود حاصل ہو جائے بغیر اس کی طلب کے تو یہ تجسس نہیں ہے پس تجسس نہیں کرنا چاہئے کہ وہ آیت قرآنی کے رو سے حرام اور ممنوع ہے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ وَلَا تَجَسَّسُوْا۔

اور منجملہ اس چیز کے شرائط کے جس پر احتساب جاری ہوتا ہے ایک یہ ہے کہ اس امر کا منکر ہونا بغیر اجتہاد کے معلوم ہو یعنی تمام ائمہ کا اس کی برائی پر اتفاق ہو باقی جن چیزوں میں ائمہ کا اختلاف ہے وہ محل احتساب بھی نہیں۔

چنانچہ ایک حنفی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی شافعی پر اس کے کیکڑہ گوہ اور مینڈک یا اسی کے مانند ان چیزوں کے کھانے پر احتساب کرے جو انکے مذہب میں حلال ہے اور نہ کسی شافعی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ ایک حنفی پر اعتراض کرے ان چیزوں میں جو اسکے مذہب میں جائز ہیں مثلاً نبیذ[1] کا پینا جو کہ نشہ کی حد تک نہ پہونچتا ہو یا ہمسایہ کے لئے حق شفعہ[2] کو ثابت ماننا وغیرہ لیکن کوئی حنفی یا شافعی اگر اپنے اپنے مسلک کے خلاف کریں تو آیا حنفی کو شافعی پر اور شافعی کو حنفی پر احتساب کا حق پہنچتا ہے یا نہیں مختار قول یہ ہے کہ پہنچتا ہے اس لئے کہ یہ خلاف مسلک چلنے والا اپنے اعتقاد کی رو سے تو خطا ہی پر ہے پس محتسب کو یہ حق پہونچتا ہے کہ اس کو اسکا مسلک بتلادے اور اس پر عمل کرادے پس احتساب کا حاصل یہ ہوا کہ محتسب نے گویا یوں کہا کہ اے شخص باوجود اعتقاد حرمت کے تو نے اس (خلاف) پر جرأت کیوں کی اس کی مثال گویا یوں سمجھ لو کہ ایک شخص مثلاً بہرا ہے اور ایک اس کی بیوی ہے اس مرد کے باپ نے نابالغی ہی کے زمانہ میں اسکا یہ عقد کردیا تھا اور اس کو بوجہ بہرے پن کے اسکا علم نہیں ہوا (کہ میرا نکاح ہو چکا ہے اور فلاں عورت میری بیوی ہے۔) اور وہ اسی عورت سے بقصد زنا مقاربت کرنا چاہتا ہے یعنی لڑکپنے ہی میں اس اعتقاد کے ساتھ کہ وہ عورت اجنبیہ ہے اور محتسب کو ان سب باتوں کا علم ہے پس محتسب کو حق پہنچتا ہے کہ اس کو منع کرے اس لئے کہ وہ اپنے اعتقاد کی رو سے اس جماع کرنے میں گنہگار ہے تو اس کے اعتقاد کے حساب سے تو اسکا احتساب کرنا بھی جائز ہے اور اگر وہ محتسب اپنے اعتقاد کی رو سے کہ وہ جانتا ہے کہ یہ عورت اس کی بیوی ہی ہے اس کے اس فعل پر احتساب نہ کرے تو یہ بھی جائز ہے۔

اور علماء کی ایک جماعت کی رائے یہ ہے کہ امور مختلف فیہا میں احتساب نہیں کرنا چاہئے مگر یہ مسائل فقہیہ میں ہے (یعنی جن مسائل میں علما کا اختلاف ہے تو اگر کسی شخص نے ایک امام کے اجتہاد پر عمل کیا ہے تو دوسرے امام کے ماننے والے کو اس پر حق احتساب نہیں ہے۔ رہے اعتقادات تو ان اصولی مسائل میں اہل حق کو اہل باطل کی خطا پر احتساب کرنا واجب ہے جیسے معتزلہ یا روافض کے غلط عقائد۔ ہرچند کہ وہ لوگ بزعم خود اپنے کو حق پر سمجھتے ہیں لیکن یہاں یہ نہ کہا

---

[1] نبیذ اسے کہتے ہیں کہ کھجوروں کو پانی میں بھگا دیتے ہیں اور کچھ دیر بعد اس پانی کو پی لیتے ہیں حنفیہ رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں اس کا استعمال جائز ہے بشرطیکہ وہ عرق اتنا گاڑھا نہ ہو جائے کہ جھاگ پھینک دے اور نشہ پیدا کردے ایک جانور ہے جو نیولے سے ذرا بڑا ہوتا ہے۔ ۲

[2] کسی کے پڑوس میں مکان بکتا ہو تو اس کی خریداری کا اولین مستحق وہ شخص ہے جس کا مکان اس بکنے والے مکان کے متصل ہے اس حق کا شرعی نام حق شفعہ ہے حنفیہ اس حق کو ثابت مانتے ہیں اور شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ کوئی حق نہیں ہے

جائے گا کہ ہم کو دوسرے کے مسلک سے کیا غرض ہے۔ جو جیسا طریقہ چاہے۔ اختیار کرے یہ صحیح نہیں ہے بلکہ ان کے غلط عقائد پر احتساب کیا جائے گا۔ اور علماء کے ذمہ احقاق حق اور ابطال باطل لازم ہے۔

مگر چاہئے یہ کہ بدون حکام اور سلاطین کے ایسوں پر احتساب اور اعتراض نہ کرے کہ وہ لوگ بھی شبہات اور دلائل فاسدہ رکھتے ہیں اس لئے مقابلہ کریں گے یہاں تک کہ ہو سکتا ہے کہ اس بحث و مناظرہ میں نوبت نزاع اور فتنہ کی پہونچ جائے اور مقصود حاصل نہ ہو لیکن اگر احتساب سلطان کے حکم سے ہو گا تو اس میں مناظرہ وغیرہ کی ضرورت ہی نہ پڑیگی اور نہ وہ اہل باطل حکم حاکم کا مقابلہ کر سکیں گے۔

(فائدہ) از مترجم ثانی) ہم لوگ مثلاً حنفی المذہب ہیں تو ہمارے مقابل دو طرح کے لوگ ہیں۔ بعضے ایسے ہیں جن سے ہمارا فروعی (یعنی مسائل کا) اختلاف ہے مثلاً شوافع حنابلہ اور مالکی لوگ اور دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جن سے ہمارا اصولی (یعنی عقائد کا) اختلاف ہے جیسے معتزلہ۔ روافض خوارج وغیرہ۔ اول جماعت سے جو ہمارا اختلاف ہے اس کے متعلق ہم یوں کہتے ہیں کہ مسائلنا حقٌ یحتمل الخطا یعنی ہمارے امام نے جو مسائل فقہیہ اپنے اجتہاد سے مستنبط فرمائے ہیں وہ سب حق اور صحیح ہیں لیکن احتمال اسکا ضرور رکھتے ہیں کہ شاید امام سے اپنے اجتہاد میں خطا ہو گئی ہو۔

ومسائل غیرنا خطا یحتمل الصواب یعنی اور ہمارے علاوہ اور دوسرے حضرات کے مسائل خطا ہیں لیکن احتمال ہے کہ شاید صحیح ہی ہوں اور دوسری جماعت جن سے ہمارا اصولی اختلاف ہے انکے متعلق ہم یوں کہتے ہیں کہ :۔

عقائدنا حقٌ لا یحتمل الغلط و الباطل یعنی ہمارے عقائد بالکل حق اور صحیح ہیں جن میں غلطی اور بطلان کا احتمال ہی نہیں ہے وعقائد غیرنا باطلٌ لا یحتمل الحق یعنی ہمارے غیر جو لوگ ہیں انکے عقائد باطل ہیں اور ایسے باطل ہیں کہ جس میں حق اور صواب کا احتمال بھی نہیں۔

مؤلفؒ نے اوپر اسی کو بیان فرمایا ہے کہ فروعی اختلاف کرنے والوں پر احتساب نہیں ہے کیونکہ سب اہل فروع اہل حق ہیں تو کسی کے حق مسلک پر دوسرے اہل حق کو احتساب کا کیا حق ہے لیکن جن سے ہمارا اصولی اختلاف ہے ان پر احتساب کیا جائے گا اسلئے کہ وہ اہل باطل ہیں اگر ان پر روک ٹوک نہ کی گئی تو باطل کو فروغ ہو گا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

○☆○

فصل چہارم

احتساب کے درجات کا بیان

جاننا چاہئے کہ احتساب کے بھی مدارج ہیں اس لئے کہ مقصود اصلی احتساب سے یہ ہے کہ معصیت کے صدور کو روکا جائے تاکہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور غضب کا موجب نہ بنے تو اگر صرف پند و نصیحت ہی سے کام چل جائے اور انسان برائی سے باز آجائے تو جنگ وجدال کی ضرورت ہی نہیں۔

چوں کارے برآید بلطف و خوشی چہ حاجت بہ تندی و گردن کشی

ترجمہ۔ یعنی جب لطف و نرمی ہی سے کام چل جائے تو سختی اور مار پیٹ کی کیا ضرورت ہے۔

پہلا درجہ احتساب کا معصیت کا علم ہے کیونکہ اگر کسی کو اس برائی اور گناہ کا علم بھی نہ ہوگا تو اس سے منع کیونکر کریگا لیکن یہ لازم ہے کہ اسکا معلوم کرنا بطور تجسس کے نہ ہو کہ تجسس خود حرام ہے۔
پس نہیں چاہئے کہ لوگوں کے دروازے یا دیوار پر کان لگائے تاکہ سنیں کہ اندر باجہ بج رہا ہے یا نہیں۔ اسی طرح سے اگر کوئی شخص کپڑے میں کوئی چیز چھپائے لئے جا رہا ہے تو نہیں چاہئے کہ اسے ٹٹول کر باجہ کی ساخت اور نوع معلوم کرے۔ اسی طرح سے یہ بھی جائز نہیں ہے کہ کسی کے پڑوسیوں سے اس کے حال کا تجسس کرے۔ یوں اگر شروع ہی سے بدون تجسس دو عادل گواہ آکر کہیں کہ فلاں شخص اپنے گھر میں شراب پی رہا ہے تو البتہ جائز ہے کہ اس کے گھر میں گھس کر جام و سبو توڑ پھوڑ ڈالیں۔

اور اگر ایک گواہ عادل یا دو غلام گواہی دیں تو اس میں اختلاف ہے۔ مختار قول یہ ہے کہ یہاں نصاب شہادت معتبر ہے نہ کہ نصاب روایت اس لئے کہ مسلمانوں کے عیوب کا ڈھانکنا بہرحال اولیٰ ہے (نصاب شہادت وہ ہے جس سے یقین حاصل ہو جائے جیسے کہ دو عادل گواہی دیں اور اگر ایک ہی عادل ہو یا دو غلام گواہی دیں تو اس سے ظن و گمان حاصل ہوتا ہے یقین نہیں۔)

کہتے ہیں کہ حضرت لقمان کی مہر کا چھاپ یہ تھا "سَتْرُ مَا عَايَنْتَ اَحْسَنُ مِنْ اِذَاعَتِهٖ مَا ظَنَنْتَ"

یعنی جس عیب کو تو دیکھے تو جب تک تجھے ظن ہی حاصل ہو اسکا چھپا لینا اس کے افشا کرنے سے بہتر ہے۔ اور یہ بہتر دونوں ہی کے لئے ہے۔ ساتر کے لئے بھی اور مستور کے لئے بھی ساتر کے لئے تو اس لئے کہ تخلق باخلاق اللہ ہے اور اخلاق اللہ میں سب سے زیادہ پسندیدہ عفو ستر ہے اور

مستور کے لئے اس لئے کہ پردہ دری اور بے حرمتی سے اس کی حفاظت ہے۔ ھٰکذا حررہ مصلح الامۃ علیہ الرحمۃ علیٰ حاشیۃ الکتاب بخطہ الخاص)۔

دوسرا درجہ احتساب کا یہ ہے کہ جس پر احتساب کرنا ہو اس کو اس امر منکر کی برائی معلوم کرائے اس لئے کہ ہو سکتا ہے کہ اس گناہ پر جرأت کا منشاء اس شخص کی جہالت ہو یعنی اس کی برائی اور قباحت ہی سے۔ ناواقف ہو لیکن چاہئے کہ اس کو معلوم کرانے میں حلم اور خوش خلقی کو ملحوظ رکھے کہ اس کی وجہ سے مقصود اکثر حاصل ہو جایا کرتا ہے اور زجر اور سختی اور ایذدہی ہے اور کسی مسلمان کو بلا وجہ ایذا دینا حرام ہے خاص کر جب کہ کوئی ایسی بات کہہ دے کہ اس میں اسکا انتساب حمق اور جہل کی جانب ہو رہا ہو اور علی الخصوص جب کہ یہ دین کے متعلق کسی معاملہ میں ہو اسکی وجہ سے انسان کو اتنی تکلیف اور ایذا ہوتی ہے کہ اس سے زیادہ متصور نہیں یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں کے مزاج میں غصہ غالب ہوتا ہے۔ دینی مناظروں اور علمی بحثوں میں خاص کر جب کہ ان پر کوئی الزام آتا ہو نہایت درجہ غصہ میں آجاتے ہیں تو اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کو جہل کی جانب منسوب کیا جاتا ہے جسکی وجہ سے وہ شرمندہ بھی ہوتے ہیں اور نہایت درجہ ایذا پاتے ہیں۔

اور وجہ اس ایذا پانے کی یہ ہے کہ جہالت ایک ایسا عیب ہے کہ جسکی برائی کا دفع کرنا ممکن ہے اس طور پر کہ آدمی خوب محنت کر کے علم حاصل کرے نیز یہ ایسا عیب ہے کہ جو بہت سارے دینی اور دنیاوی امور میں سرایت کر جاتا ہے بخلاف عیوب ظاہری کے مثلاً بد صورتی وغیرہ کہ وہ ایسا عیب ہے کہ اسکو بدل دینا یا درست کر دینا اس کے اختیار میں نہیں اس لئے اس کو ایک امر غیر اختیاری سمجھ کر اس کی وجہ سے کم ایذا پاتا ہے (حاصل یہ کہ جہل کا عیب چونکہ اختیاری ہوتا ہے نیز اسکا اثر اور دوسرے امور پر بھی پڑتا ہے اس لئے اسکی طرف منسوب ہونا نہایت ناگوار ہوتا ہے بخلاف عیوب ظاہری کے)۔

چنانچہ ایک وجہ علم کے شرف کی یہ بھی ہے کہ جس شخص کو علم کے نقصان کی جانب منسوب کیا جائے اگرچہ وہ کوئی حقیر ہی چیز کیوں نہ ہو مثلاً شطرنج کا علم تب بھی اس کو اس سے ایذا ہوتی ہے اور خواہ کوئی معمولی ہی چیز ہو اس کے علم کی جانب منسوب کئے جانے سے آدمی خوش ہوتا ہے (مطلب یہ کہ علم ایسے شرف کی چیز ہے کہ کیسی ہی کوئی معمولی چیز ہو آدمی کو اس کا عالم کہلا تو وہ خوش ہو جاتا ہے اور اس سے جاہل کہلا تو خفا ہو جاتا ہے مثلاً شطرنج ہے۔ اب کسی کو کہلا کہ یہ شطرنج بہت اچھی جانتے ہیں تو پھولا نہ سمائے گا اور اگر کہلا کہ یہ شطرنج نہیں جانتے تو اس کو ناگوار ہو گا حالانکہ یہ ایسا کچھ کمال نہیں ہے مگر ایک شے سے جہل کی جانب نسبت ضرور ہے اس لئے کسی کو کوئی بات معلوم کرانی ہو تو اس میں اخلاق اور نرمی کا پہلو ملحوظ رکھے کیونکہ اس شخص کے لئے اپنے جاہل ہونے کی کڑواہٹ ہی کچھ کم نہ تھی چہ جائے کہ تمہارے لہجہ کی تندی اور ترشی مزید براں تو ہو

سکتا ہے کہ دونوں کے تحمل کا اس کو سہارا نہ ہو۔

حاصل یہ کہ مسلمانوں کو ان کی دینی خطا اور قصور پر مطلع کرنا اپنے ذمہ لازم بھی سمجھو اور انکو ایذا بھی نہ پہونچے۔ اسکا بھی دھیان رکھو اور یہ حکم دینی امور کے متعلق ہے اور جو امور دین کے علاوہ ہیں ان میں کسی سے کچھ مت کہو نہ کسی کی بات کا جواب دو اس لئے کہ اکثر لوگ اس قماش کے ہیں کہ تم ہی سے علم سیکھیں گے اور تمہارے ہی دشمن ہو نگے اور تم ہی پر دعویٰ کریں گے۔

(ادب) اور جو شخص علم کی قدر نہ کرے اس سے علم کی بات نہ کہو کہ اس میں علم کی بے عزتی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ علم کا طلب کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے اور علم کو اس کے غیر اہل میں رکھنے والا اس شخص کے مانند ہے جو کہ سونا موتی اور جواہرات کو سور کے گلے میں پہنائے (اور نا اہل سے مراد وہ شخص ہے جو علم کو سمجھے نہیں اور اس کی قدر نہ جانے یا وہ شخص جو اس سے کسی غرض دنیاوی کا ارادہ کرے)۔

چنانچہ اگر تم بنظر غور دیکھو گے تو ایسے لوگوں کو کم ہی پاؤ گے جو کہ نصیحت اور صحبت کے قابل ہوں اور انسانوں میں قابل آدمی ایسا ہی کم ہے اور اس کو جماعت انسانی سے وہی نسبت ہے جو آنکھ کی پتلی کو بدن انسانی سے ہوتی ہے خداوندا ہم کو ہمارے نفس کے شر سے اور لوگوں کے شر سے محفوظ رکھیو اور تمام لوگوں کو بھی ہمارے شر سے دور رکھیو اِنَّکَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْم (مترجم عرض کرتا ہے کہ انسان کامل کی اسی کمی کا شکوہ حضرت عالمگیرؒ نے اپنے مکتوب میں کسی سے یوں کیا ہے۔

فرماتے ہیں کہ ؎

انچہ بر جستیم و کم یا بیم و بسیار ہست نیست

نیست جز انساں دریں عالم کہ بسیار است و نیست

یعنی وہ چیز جس کو کہ میں نے تلاش کیا اور مجھے مل نہ سکی یوں ہے تو بہت مگر حقیقتاً نہیں ہے۔ ایسی چیز اس دنیا میں صرف انسان ہے کہ ہے تو بہت مگر نہیں ہے۔)

اور احتساب کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ آدمی اپنے وعظ و نصیحت کے ذریعہ لوگوں کو برائی سے روکے اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور دوزخ کے خوف کے ذریعہ لوگوں کو معصیت سے بچائے۔ چنانچہ یہ طریقہ ان لوگوں میں بھی مفید ہے جو کہ احکام شرع سے جاہل ہیں اور ان کے لئے بھی نافع ہے جو متجاہل ہیں یعنی جاہل بنتے ہیں معصیت کا انہیں علم ہے باوجود اس کے اس پر جرأت کرتے ہیں جیسے کسی پر ظلم کرنے والا یا شراب پینے والا یا غیبت کرنے والا یا زانی کہ یہ سب لوگ ان امور کی قباحت کو خوب جانتے ہیں مگر پھر بھی انکے مرتکب ہوتے ہیں انکو نصیحت کرنے اور ڈرانے کا طریقہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور حضرات صحابہ کرامؓ کے اقوال جو ان معاصی کے

بارے میں وارد ہوئے ہیں انہیں انکے سامنے بیان کرے اس طرح سے اگلے بزرگوں کی حکایات اور واقعات اور متقیوں کے طریقے اور انکے عادات ان لوگوں کے سامنے بیان کرے تاکہ یہ لوگ اس سے متاثر ہوں لیکن اس طریق میں بھی چاہئے کہ انداز نرمی اور مہربانی ہی کی ملحوظ رہے اور دوسرے لوگوں کے گناہ کو اپنے ہی گناہ کی طرح سمجھے کہ مسلمان سب ایک ہی ہیں (مطلب یہ کہ جس طرح کہ اپنے گناہوں سے نادم ہوتا ہے اور اس کو چھپانا چاہتا ہے اور اس کے تدارک کی فکر رہتی ہے اسی طرح سے انکے حق میں بھی خیر خواہ اور دلسوز رہے یعنی نہ ان کے گناہ کو بیان کرکے خوش ہو اور نہ اس سے ان کی تحقیر مقصود ہو)۔

لیکن جاننا چاہئے کہ یہاں پندو وعظ کہنا اور دوسرے کو گناہ سے ڈرانا ایک بڑا نازک مسئلہ بلکہ آفت عظیم ہے۔ کیونکہ عالم جس وقت دوسرے کو اسکا گناہ معلوم کراتا ہے اور اس کو وعظ و پند یا زجرو توبیخ کرتا ہے تو اپنے کو اپنے علم کی وجہ سے بڑا جاننے لگتا ہے اور دوسرے کو اس کے جہل کے سبب ذلیل سمجھتا ہے (وہ اکثرو بیشتر) اسکا قصد اپنے وعظ و نصیحت سے محض اپنے علم کا ظاہر کرنا اور غیر کو ذلیل کرنا ہی ہوتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ مقام بڑا ہی مزلۃ الاقدام ہے اس لئے کہ نیکیوں اور عبادتوں میں ایسی لغزش ہوا کرتی ہے کہ ویسی گناہوں میں بھی نہیں ہوتی۔

چنانچہ حضرت داؤد طائیؒ سے جو کہ اپنے وقت کے اولیاء اللہ میں سے ہیں لوگوں نے دریافت کیا کہ آپ اس شخص کے بارے میں کیا فرماتے ہیں جو کہ امرا اور سلاطین کے پاس جاوے اور انکو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے فرمایا کہ میں اس پر کوڑے پڑنے کا خوف کرتا ہوں (یعنی امراو سلاطین صاحب منصب اور باختیار لوگ ہوتے ہیں انہیں جب کوئی اسطرح سے برملا ٹوکے گا تو بوجہ کبر کے انکو ناگوار ضرور ہوگا اور چونکہ صاحب قدرت بھی ہوتے ہیں اس لئے ہو سکتا ہے کہ اس ناصح کے حق میں کوڑے لگائے جانے کا حکم صادر فرمادیں لہٰذا کام سمجھ بوجھ کر کرنا چاہئے) لوگوں نے عرض کیا کہ یہ چیز تو اس کو امرو نہی پر اور قوی کرتی ہے یعنی جس کا ارادہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا ہوتا ہے تو وہ ان امور سے ڈرتا نہیں بلکہ ثواب کا خیال کرکے اس پر اور قوی ہو جاتا ہے اور اپنے کو ان تکالیف کے لئے آمادہ کرلیتا ہے۔ حضرت داؤد طائیؒ نے فرمایا کہا اچھا تو پھر اس وقت مجھے اس پر تلوار کا خوف معلوم ہوتا ہے یعنی اگر کوڑے سے باز نہ آیا اور پھر جرائت کی تو نتیجہ ہوگا کہ تلوار سے ماردیا جائے گا۔ لوگوں نے عرض کیا کہ یہ بات تو اس کے ارادہ کو اور زیادہ قوی کرتی ہے۔ (یعنی وہ یہ خیال کرتا ہے کہ اگر ماردیا جاؤنگا تو راہ حق میں شہادت نصیب ہوگی) حضرت داؤد نے فرمایا اگر ایسا ہے تو پھر مجھے یہ اندیشہ ہے کہ ایک پوشیدہ بیماری ہے (جس کا نام عجب ہے) وہ محفوظ نہ رہ سکے گا (یعنی عجب نہیں کہ اپنے اس فعل پر دل میں وہ خوش ہو اور اپنے کو اچھا جانے جس کا نام عجب ہے اور غریب کو اسکا پتہ بھی نہ چلے اور سارا پندو وعظ اپنے نفس کے لئے ہو کر رہ جائے اس درجہ سے

نکلنا بہت مشکل ہے (الاماشاءاللہ)

ابو سلیمان دارانی ؒ نے فرمایا کہ ایک دفعہ میں نے ایک امیر شخص کو کوئی برا کام کرتے دیکھا چاہا کہ اس سے اس کو منع کروں، مگر نہیں منع کیا اور اس میں مجھے قتل کا بھی اندیشہ تھا لیکن قتل کا خوف میرے لئے منع سے مانع نہیں ہوا بلکہ میں اس بات سے ڈرا کہ مبادا میرا نفس اس سے خوش ہو (کہ واہ تم نے راہ خدا میں کیسی دلیری دکھائی اور اس کی وجہ سے میرا یہ فعل اخلاص سے خالی ہو جائے اور میرا نفس اس میں اپنا حصہ لے لے۔)

(فائدہ) لیکن اس مضمون اور ان حکایات سے یہ نہ سمجھا جائے کہ پھر تو وعظ و نصیحت ہی نہ کرنی چاہئے بلکہ حضرت شیخ کا مقصد اس کے بیان کرنے سے یہ ہے کہ وعظ و نصیحت کرے لیکن اس میں اپنی نیت کو خالص رکھے اس لئے کہ خلوص دل کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی بڑی فضیلت اور تاکید آئی ہے چنانچہ آیات و روایات صحیحہ اس پر صراحتاً دال ہیں اور نصوص میں اس کی خوبی اور کثرت ثواب کا بیان ہے (اس لئے اس سے کیسے منع کیا جا سکتا ہے۔)

چوتھا درجہ احتساب کا یہ ہے کہ اس سلسلہ میں مخاطب کو برا بھلا سخت اور سست بھی کہنا پڑے اور غصہ اور ترشروئی کی حاجت پڑے اور یہ اس صورت میں ہے کہ شفقت اور نرمی کے ساتھ منع کرنا نفع نہ دے اور وعظ و نصیحت سود مند نہ ہو اور یہ دیکھے کہ منع کرنے کے باوجود معصیت پر اصرار جاری ہے نیز نصیحت اور ناصح کے ساتھ تمسخر اور استہزا کیا جا رہا ہے اور یہ طریقہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے واقعہ سے ماخوذ ہے کہ انہوں نے اول اول وعظ و نصیحت ہی فرمائی لیکن جب وہ بے اثر ثابت ہوئی تو فرمایا کہ

اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝

یعنی فرمایا کہ تف ہے تم پر اور تمہارے ان معبودوں پر جن کی تم اللہ کے ماسوا پرستش کرتے ہو کیا تم محض بے عقل لوگ ہو کہ اتنی بات بھی نہیں سمجھتے (کہ اللہ کا کوئی شریک نہیں اور اس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے)۔

(ادب) مراد برا کہنے سے فحش بکنا نہیں ہے مثلاً یہ کہ اس کو زنا اور مقدمات زنا کی جانب منسوب کرے ایسا نہ کرے بلکہ چاہئے کہ کچھ اس طرح برا کہے کہ سچ سے خالی نہ ہو مثلاً یوں کہے کہ اے فاسق یا اے جاہل یا اے احمق خدا سے ڈر اور خود کو اپنے ہاتھوں ہلاک نہ کر اور اسی کے مثل کلمات کہے جو فی الجملہ سچائی بھی لئے ہوئے ہوں۔ چنانچہ یہاں یہ سچ یوں ہوا کہ جو شخص فاسق ہے (یعنی خدا کا نافرمان) وہ احمق پہلے ہے کیونکہ اگر احمق نہ ہوتا اور عقل والا ہوتا تو گناہ ہی کیوں کرتا اور عاصی اور نافرمان احمق اس لئے ہیں کہ عصیان میں نعمت کا کفران ہے اور ظاہر ہے کہ جس ذات نے اس کو اور اس کی تمام ظاہری اور باطنی نعمتوں کو پیدا کیا اس کی ناشکری کونسی عقل کی بات ہے نیز

یہ کہ گناہ عذاب آخرت کا سبب ہوتا ہے اور عذاب بھی کیسا کچھ کہ العیاذ باللہ اس سے بڑھ کر کوئی عذاب متصور نہیں (پس دوزخ میں جانے کا راستہ اختیار کرنا کونسی عقلمندی ہے) حدیث شریف میں آتا ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ آدمی عاقل وہ ہے جو اپنے نفس کی مخالفت کرے اور وہ عمل کرے جو موت کے بعد کام آنے والے ہیں اور احمق وہ شخص ہے جو خواہش نفس کا تابع ہو۔

(ادب) اور چاہئے کہ کسی کو قدر ضرورت سے زیادہ برا بھی نہ کہے اور اگر سمجھے کہ برا کہنے سے باز نہیں آئے گا تو غصہ اور کراہیت سے زیادہ کچھ اور نہ کرے۔

پانچواں درجہ احتساب کا یہ ہے کہ منکر کو ہاتھ سے مٹاوے مثلاً باجہ واجہ ہے تو اس کو توڑ ڈالے۔ شراب ہے تو اس کو گرادے اور کوئی مرد ریشمی کپڑا پہنے ہوئے ہے تو اس کے بدن سے اسے اتار دے یا کوئی شخص کسی کا گھر غصب کر کے اس میں رہ رہا ہے تو ہاتھ پکڑ کر اس کو اس سے نکال دے یا کوئی جنبی شخص مسجد میں ہے اور نرمی سے کہنے سے نہیں نکل رہا ہے تو دھکا دے کر اس کو باہر کر دے۔ اور یہ صورت ان ہی گناہوں میں ہو سکتی ہے جو زبان اور دل کے علاوہ ہیں باقی جو معاصی کہ زبان و دل سے متعلق ہیں ان کا ہاتھ سے ختم کرنا ممکن نہیں۔

(ادب) اور اگر ان مذکورہ بالا صورتوں میں سے کسی میں بغیر ہاتھ سے استعمال کئے ہوئے صرف زبان سے ہی کام چل جائے تو پھر ہاتھ کے استعمال کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور چاہئے کہ ان حالات میں بھی بغیر ضرورت کے کچھ نہ کرے اور حد اعتدال سے تو ہرگز تجاوز نہ کرے۔ پس کہیں کسی جگہ سے نکالنا ہو تو ڈاڑھی پکڑ کر یا اس کی ٹانگ کھینچ کر باہر نہ کرے جب کہ ہاتھ پکڑ کر باہر کرنا ممکن ہو تو اسی طرح سے اس کے ریشمی کپڑے پھاڑ نہ ڈالے بلکہ بند اور بٹن کھول کر بدن سے اتارے اور کھیل کی چیزیں مثلاً باجہ وغیرہ کو جلا نہ دے بلکہ توڑ دینا کافی ہے اسی طرح سے شراب کا گرا دینا کافی ہے اس کے برتن توڑنے کی ضرورت نہیں اگر بدون برتن کے توڑے ہوئے شراب کا گرانا ممکن نہ ہو تو اس صورت میں برتن توڑ ڈالنے میں اسکا تاوان اس پر لازم نہیں۔ اسی طرح سے اگر بوتل یا برتن کا منہ تنگ ہے جس کی وجہ سے شراب دیر میں گرے گی اور اسے اندیشہ ہو کر دیر ہونے کی صورت میں اہل فسق جمع ہو جائیں گے اور پھر میں یہ کام نہ کرسکوں گا تو اس صورت میں انڈیلنے کا پابند نہیں ہے بلکہ برتن کو توڑ ڈالے۔ اسی طرح سے اگر اہل فسق کے غلبہ کا خوف نہ بھی ہو لیکن وقت ضائع ہو تب بھی برتن کا توڑ ڈالنا جائز ہے کیونکہ شراب کے برتنوں کی رعایت کرنے سے وقت کی حفاظت اہم اور مقدم ہے اس کی خاطر اس کا ضیاع جائز نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اور احتساب کا چھٹا درجہ ڈرانا اور دھمکی دینا ہے مثلاً اس طرح کہنا کہ اس کام کو چھوڑتے ہو کہ نہیں۔ سیدھے سے چھوڑ دو ورنہ تمہارا سر توڑ دونگا یا یہ کہ گردن ماردوں گا یا اس کے مانند اور

کوئی بات کہنا چنانچہ کسی سخت معاملہ کے عمل میں لانے سے پہلے اس قسم کی دھمکی کو مقدم کردینا لازم ہے کیونکہ اگر مقصود محض ڈرانے اور دھمکانے ہی سے حاصل ہو جائے تو اس سے زیادہ کی حاجت ہی کیا ہے۔ لیکن یہ بھی چاہئے کہ تحدید ایسی چیز کے ساتھ نہ کرے جس کا کرنا جائز نہ ہو۔ مثلاً یوں کہنے لگے کہ اس کام سے باز آجاؤ ورنہ تمہارا گھر لوٹ لوں گا یا تمہارے بیٹے کو مار ڈالوں گا اور اسی قسم کی باتیں یہ سب نہ کہے۔

بلکہ اس قسم کی باتیں اگر قصد و نیت کے ساتھ کہتا ہے تو گنہگار ہو گا اور اگر بدون قصد کے کہا ہے تو دروغ کو متصور ہو گا۔

(ادب) اور جائز باتوں میں بھی جتنا کچھ نیت میں ہو اس سے زائد بطور مبالغہ کے کہنا تاکہ اس برے کام سے وہ رک جائے جائز ہے۔ اگر یہ سمجھتا ہے کہ مبالغہ کی وجہ سے وہ باز آجائے گا اور یہ بھی اگرچہ صورۃً کذب ہے لیکن اتنا کذب اس مصلحت کے لئے جائز ہے جس طرح سے کہ دو مسلمانوں کے درمیان صلح کرانے میں آخر جھوٹ بولنا جائز ہی ہے۔ پس یہ بھی اسی کے حکم میں ہے۔

اور احتساب کا ساتواں درجہ یہ ہے کہ کسی کو کسی برائی سے باز رکھنے میں ہاتھ و پیر سے پٹائی کو بروئے کار لایا جائے یا علاوہ اس کے ایسی صورت اختیار کی جائے جس میں آلات جنگ اور اعوان و انصار کی احتیاج نہ پڑے۔ اس کا حکم یہ ہے کہ بشرط ضرورت یہ درجہ ہر شخص کے لئے جائز ہے جب کہ کسی منکر کے دفع کرنے میں وہ اسے قدر حاجت پر ہی منحصر رکھے باقی اس میں بھی نرمی لازم ہے یعنی کسی ایسی جگہ نہ مارے کہ انسان کے مرجانے کا اندیشہ ہو۔

اور آٹھواں درجہ احتساب کا یہ ہے کہ انسان تنہا منع پر قادر نہ ہو بلکہ اسے معین و مددگار اور آلات و ہتھیار سے مدد لینی پڑے جس کی وجہ سے باہم قتل و قتال اور آپس میں مقابلہ کا احتمال ہو احتساب کے اس مرتبہ میں علماء کا اختلاف ہے کہ آیا بغیر اذن امام کسی کو احتساب کا یہ درجہ حاصل ہے یا نہیں ایک جماعت اس پر ہے کہ بدون اذن امام کسی کو یہ درجہ حاصل نہیں اس لئے کہ اس میں تحریک فتنہ و فساد ہے جس کا انسداد امام ہی کر سکتا ہے۔ اور دوسری جماعت کا یہ خیال ہے کہ اگر کسی شخص یا جماعت کو ایسی قوت حاصل ہے تو وہ اس مرتبہ میں بھی احتساب کر سکتا ہے۔ اس کے لئے اذن امام لازم نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

فصل پنجم

محتسب کے آداب کے بیان میں

ہم نے پہلے احتساب کے درجات جو بیان کئے ہیں ان میں محتسب کے آداب کا بھی کچھ ذکر آچکا ہے اس فصل میں ہم محتسب کے جملہ آداب اور اصول کا مفصل بیان کرتے ہیں۔ اس کو یوں سمجھنا چاہئے کہ محتسب کے جملہ آداب تین چیزوں میں منحصر ہیں۔ علم' ورع اور خوش خلقی یعنی محتسب میں ان تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ بہر حال علم تو اس لئے ضروری ہے تاکہ احتساب کے مقامات اور اس کے حدود اور احتساب جاری ہونے کے مواقع کو جان سکے۔ اور ورع اور تقویٰ اس لئے ضروری ہے تاکہ یہ چیز اس کو علم کی مخالفت سے باز رکھے کیونکہ ہر عالم عامل نہیں ہوتا اسلئے ورع اور پرہیزگاری کی ضرورت ہے.... تاکہ احتساب میں کمی زیادتی نہ کرے اور اگر پرہیزگار نہیں ہوگا تو باوجود یہ کہ جانتا ہوگا کہ یہ کام نہیں کرنا چاہئے مگر پھر کریگا اور یہ وجہ بھی ہے کہ انسان میں تقویٰ نہ ہو تو اس کا کلام اور وعظ مقبول اور مؤثر بھی نہیں ہوتا بلکہ لوگ ایسی صورت میں استہزا اور تمسخر کے ساتھ پیش آتے ہیں جو اہل معاصی کے لئے ان کی معصیت پر مزید جرأت کا سبب ہوجاتا ہے رہا محتسب کا خلق حسن کے ساتھ متصف ہونا تو اس لئے کہ نیک خلقی تو اصل اور بنیاد ہی ہے۔ احتساب کی اور محض علم' تقویٰ.... حسن خلق کے بغیر اس باب میں کافی بھی نہیں ہے اس لئے کہ وعظ و نصیحت جو بطور نرمی اور شفقت کے ہو وہی زیادہ مؤثر ہوتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ تقویٰ کا تمام مدار حسن خلق ہی پر ہے اس لئے کہ جس پر غضب و غصہ غالب ہوتا ہے وہ اپنے نفس کے ضبط کرنے پر قادر نہیں ہوتا اور ایسے شخص سے انصاف اور تدین بہت بعید ہے۔

بزرگوں نے فرمایا ہے۔

چوں مرکب بروں تاخت خشم از کمیں
نہ انصاف ماند نہ تقویٰ نہ دیں

یعنی غصہ نے جب کمین گاہ سے اپنا گھوڑا دوڑایا اس وقت نہ انصاف باقی رہتا ہے نہ دین و تقویٰ۔ حاصل یہ ہے کہ احتساب کا دارومدار ان ہی تینوں صفات پر ہے جو ذکر کی گئی ہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر نہ کرے مگر وہی شخص جو نرم مزاج حلیم اور فقیہ اور عالم ہو۔

اسی طرح سے منجملہ آداب محتسب کے یہ ہے کہ وہ صابر ہو یعنی ہر طرح کی ایذا پر جو لوگوں کی

طرف سے پہنچے صبر کرنے والا ہو یہ اس لئے کہ منصب احتساب پر بدون صبر کے قائم رہنا مشکل ہے نیز محتسب کو چاہئے کہ ہمیشہ اپنی نظر اجر آخرت پر رکھے اور مخلوق سے عزت نہ طلب کرے اور ان کو راضی کرنے اور ان سے تعریف چاہنے کے درپے نہ ہو کیونکہ کسی معصیت میں اس طرح احتساب جاری کرنا جس سے مخلوق بھی خوش جائے اور خدا بھی راضی ہو ان دونوں باتوں کا اجتماع ناممکن ہے۔

(ادب) محتسب کو چاہیے کہ اپنے دنیاوی علاقوں کو کم کرے تاکہ مخلوق سے طمع کم ہو اس لئے کہ طمع کے ہوتے ہوئے امر بالمعروف ممکن بھی نہیں۔ بعض بزرگوں کا قصہ منقول ہے کہ انہوں نے ایک بلی پال رکھی تھی۔ محلہ کے قصاب سے اس کے لئے چھیچھڑے لاتے تھے۔ ایک روز اس قصائی سے کوئی گناہ کی بات دیکھی پس پہلے اپنے گھر آئے اور اور بلی کو نکال باہر کیا اس کے بعد اس قصاب کو اس گناہ کی بات سے منع کیا۔ قصائی نے کہا کہ میاں آپ مجھے کہتے ہیں آپ کی بلی کو چھیچھڑے کون دیگا۔ انہوں نے فرمایا کہ میں بلی کو پہلے ہی بھگا چکا ہوں پھر تم سے احتساب کر رہا ہوں۔ حاصل یہ کہ پہلے طمع ختم کرے تب ہی احتساب کر سکتا ہے۔

(ادب) محتسب کے لئے ضروری ہے کہ احتساب میں نرمی برتے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں اگلے بزرگوں کی بہت سی حکایات منقول ہیں۔

لکھا ہے کہ خلیفہ مامون رشید کو ایک شخص نے سختی کے ساتھ کوئی نصیحت کی۔ ماموں نے کہا کہ اے محترم! اللہ تعالیٰ نے آپ سے بہتر کو (یعنی موسیٰ علیہ السلام) کو مجھ سے بدتر کی طرف (یعنی فرعون کی طرف) دعوت اسلام کے لئے بھیجا اور انہیں نرم گوئی کا حکم فرمایا چنانچہ ارشاد فرمایا کہ: فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى (یعنی کہیے اس سے بات نرم ..... تاکہ وہ نصیحت قبول کرے یا ڈرے)

ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ یا رسول اللہ مجھے زنا کرنے کی اجازت دیدیجئے۔ یہ سن کر حاضرین مجلس اسے ڈانٹنے لگے کہ نادان تو یہ کیا کہہ رہا ہے۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسے مت ڈانٹو اور اسے اپنے پاس بلا کر بٹھایا اور فرمایا کہ میاں یہ تو بتاؤ کیا تم یہ پسند کرتے ہو کہ لوگ تمہاری ماں کے ساتھ زنا کریں۔ اس نے عرض کیا میری جان فدا ہو آپ پر یا رسول اللہ ہرگز نہیں ایک آن کے لئے بھی میں اسے برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا اچھا اگر تمہاری بیٹی سے لوگ زنا کرنا چاہیں تو کیا تم پسند کرو گے۔ اسی طرح سے آپ نے اس کے اور رشتہ داروں کے نام لے لے کر یہی سوال کیا مثلاً بہن، خالہ، پھوپھی وغیرہ کے بارے میں یہی پوچھا۔ ہر ایک کے متعلق وہ یہی کہتا رہا کہ میری جان فدا ہو آپ پر یا رسول اللہ ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔ اس کے بعد حضرت نے اپنا دست مبارک اس کے سینہ

پر رکھا اور دعا فرمائی کہ یا اللہ اس کے قلب کو پاک کر دے اور اس کی شرمگاہ کی زنا سے حفاظت فرما۔ اس کے بعد وہ شخص اٹھ کر چلا گیا اور اس کے بعد سے کبھی اس کے دل میں زنا کا وسوسہ تک نہیں آیا بلکہ تمام عمر اس کے نزدیک زنا سے بد تر کوئی چیز نہ تھی۔

(فائدہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جو اس شخص سے کئی بار فرمایا کہ تم کو اپنی فلاں عزیزہ۔ فلاں عزیزہ کے ساتھ زنا کیا جانا پسند ہے تو ظاہرًا اس سے اس جانب اشارہ فرمانا منظور ہے کہ جس طرح اپنے رشتہ داروں اور محرموں کے ساتھ زنا کو تم پسند نہیں کرتے اسی طرح سے اجنبی عورت کے ساتھ زنا کو بھی ناپسند کرنا چاہیے کہ وہ بھی تو آخر کسی کی محرم اور رشتہ دار ہوگی اس کا عزیز قریب کیوں گوارا کریگا بس۔

"ہرچہ بر خود نہ پسندی بر دیگراں مپسند"

یعنی جو بات اپنے لئے پسند نہ کرو وہ دوسروں کے لئے بھی پسند نہ کرنا چاہیے کہ شرافت' انصاف اور دیانت کا یہی تقاضہ ہے۔

اسی طرح سے آتا ہے کہ ایک بزرگ اپنے دوستوں کے ہمراہ کہیں جا رہے تھے راستہ میں ایک شخص کو دیکھا کہ اس کا پائجامہ ٹخنوں سے نیچے ہو گیا ان کے ساتھیوں نے چاہا کہ ان پر سختی کریں ان بزرگ نے انہیں منع کیا اور فرمایا کہ آپ لوگ خاموش رہئے پس اس کام کو میرے حوالے کر دیجئے۔ چنانچہ اس کے پاس گئے اور نہایت ہی نرمی سے کہا کہ بھائی میرے مجھے تم سے ایک حاجت ہے وہ بھی نہایت اخلاق سے متوجہ ہوئے اور کہا کہ فرمایئے چچا جان کیا خدمت میرے لائق ہے۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ اگر تم اپنا پائجامہ کچھ اونچا کر لو تو بہت ہی بہتر اور پاکیزہ ہو اس نے کہا کہ آپ کا فرمانا سر آنکھوں پر لیجئے ابھی کئے لیتا ہوں اور ہمیشہ آپ کا احسان مند رہوں گا۔

اس کے بعد ان بزرگ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ دیکھا اگر تم سختی کرتے تو اس کی جہالت اور زیادہ ہو جاتی اور مقصد بھی حاصل نہ ہوتا۔

محمد ابن زکریاؒ کہتے ہیں کہ عبداللہ ابن عائشہ ایک مرتبہ بعد غروب آفتاب مسجد سے باہر نکلے راستہ میں قریش کے ایک غلام کو دیکھا کہ ایک عورت کا گلا دبائے ہوئے مست پڑا ہوا ہے اور عورت شور کر رہی ہے لوگوں کا مجمع ہو گیا ہے اور لوگ اسے مار پیٹ رہے ہیں لیکن وہ عورت کو چھوڑ نہیں رہا عبداللہ نے اسے دیکھا تو پہچان لیا لوگوں کو اس کے پاس سے ہٹایا اور کہا کہ تم لوگ اسے چھوڑ دو اور مجھے بات کرنے دو اور اس سے کہا کہ اے میرے بھتیجے یہ تمہارا کیا حال ہے۔ غلام یہ سن کر شرمندہ ہوا عورت کو چھوڑ دیا۔ عبداللہ نے غلام کا ہاتھ پکڑا اور اپنے گھر لے آئے اور اپنے غلاموں سے کہا کہ اسے اپنے پاس بٹھاؤ جب اس کا نشہ کافور ہوا اور ہوش میں آیا تو رات کے واقعہ سے اسے آگاہ کیا اور بہت دیر تک اسے نصیحت کرتے رہے غلام سر جھکائے سنتا رہا۔ بالآخر وہ رو دیا

اور کہا کہ آج سے عہد کرتا ہوں کہ پھر کبھی اس قسم کے کام کے گرد بھی نہ پھٹکوں گا۔ عبداللہ نے اس کے سر کو بوسہ دیا اور کہا کہ اَحْسَنْتَ یَابُنَیَّ شاباش میرے بیٹے تو نے خوب کام کیا کہتے ہیں کہ پھر اسکے بعد وہ غلام عبداللہ ابن عائشہ کی خدمت میں ہی رہ پڑا اور ان سے حدیثیں سن سن کر لکھتا تھا (یعنی عالم ہوگیا) یہ سب کچھ حضرت عبداللہ کی نرمی اور شفقت کی برکت سے ہوا۔

ان ہی عبداللہ ابن عائشہ کا ارشاد ہے کہ لوگ امربالمعروف کرتے ہیں لیکن اس طرح کرتے ہیں کہ ان کا معروف منکر ہو جاتا ہے۔ امور میں نرمی کیا کرو تاکہ اپنا مطلوب پاؤ۔

اسی طرح سے بیان کیا جاتا ہے کہ ایک شخص ایک عورت سے چمٹ گیا اس کے ہاتھ میں چھری تھی جو کوئی چھڑانے جاتا اس کو زخمی کر دیتا۔ لوگ عاجز تھے کہ کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ عورت کو اس سے چھڑائے کہ اس درمیان میں حضرت بشیر بن حارث جو کہ اس وقت کے اولیاء اللہ میں سے تھے وہاں سے گزرے اور انہوں نے اپنا مونڈھا اس شخص کے مونڈھے پر...... مارا اور وہاں سے گذر گئے وہ شخص زمین پر گر پڑا لوگوں نے پاس جاکر دیکھا کہ بے خود پڑا ہوا ہے اور پسینہ میں شرابور ہے اس سے پوچھا کہ تیرا یہ کیا حال ہے اور کیسے تم گر پڑے اس نے کہا کہ مجھے اور تو کچھ نہیں معلوم بس اتنا ضرور دیکھا کہ ایک شیخ میرے پاس سے گزرے اور اپنے مونڈھے سے میرے مونڈھے پر دھکا دیا اور چپکے سے یہ فرمایا کہ تو جو کر رہا ہے اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہے ہیں۔ بس ان کے فرمان کی ہیبت سے میرے پاؤں سست پڑ گئے اور میں کھڑا نہ رہ سکا اور زمین پر گر پڑا باقی میں یہ نہیں جانتا کہ وہ شیخ کون تھے۔ لوگوں نے کہا نہیں جانتے وہ بشیر ابن حارث تھے۔ اس شخص نے کہا ہائے افسوس۔ اب اس کے بعد دیکھا چاہیے کہ وہ مجھے کیسا دیکھیں۔

بیان کرتے ہیں کہ اسی وقت اس کو بخار چڑھا اور سات دن کے بعد اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دیا۔ (حضرت شیخ بشیر ابن حارث نے کچھ ایسے اخلاص اور درد کے ساتھ اسے خدا کا خوف دلایا کہ تیر نشانہ ہی پر جالگا۔ خدا کا خوف اس کے قلب میں گھر کر گیا اور خدا کی عظمت کا تصور اور اپنی معصیت اور اس پر ندامت بالآخر اس شکل میں ظاہر ہوئی جو کہ سامنے آئی)

مذکورہ بالا واقعات جو بیان ہوئے ان سے پند و نصیحت میں نرمی کا حال معلوم ہوا لیکن ایسا نہیں کہ اسلاف نے کسی موقعہ پر بھی سختی سے کام نہ لیا ہو بلکہ جس طرح سے نرمی کے موقعہ پر نرمی برتتے تھے اسی طرح سے سختی کے موقعہ پر سختی اور عنف سے بھی کام لیتے تھے۔ خصوصاً ظالم بادشاہوں اور دنیادار امرا کے مقابلہ میں تو سختی ہی برتنا ان حضرات کی عادت تھی۔ چنانچہ بیشمار حکایتیں اگلے بزرگوں کی اس سلسلہ میں بھی منقول ہیں۔

بیان کیا جاتا ہے کہ خلیفہ مہدی ایک مرتبہ طواف کر رہے تھے۔ ان کے ملازم لوگوں کو بیت اللہ سے ہٹاتے تھے یعنی ان کے طواف کے اہتمام کے لئے مطاف خالی کرا رہے تھے جس طرح سے

کہ امراء کے چلتے وقت آگے آگے راستہ صاف کیا جاتا ہے۔ عبد اللہ ابن مرزوقؒ بھی اس مجمع میں موجود تھے انہوں نے کود کر مہدی کی چادر پکڑی اور اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا کہ ہوش میں آ یہ کیا ہو رہا ہے۔ کیا تم کو تمہارے ان نوکروں نے بیت اللہ کا حقدار بنا دیا ہے اور یہ قریب اور بعید سے جو لوگ آئے ہوئے ہیں انہیں اس کا کوئی حق نہیں ہے؟

حالانکہ اللہ تعالیٰ تو یہ فرماتا ہے سَوَاءَنِ الْعَاكِفُ فِيهِ وَالْبَادِ یعنی اس بیت اللہ میں مقیم اور مسافر سب برابر ہیں۔ یہ حضرت عبد اللہ ابن مرزوقؒ مہدی کے آزاد کردہ غلام تھے۔ مہدی نے جب مڑ کر دیکھا تو ان کو پہچانا۔ کہا تم کون ہو؟ عبد اللہ بن مرزوقؒ؟ عبد اللہؒ نے کہا جی ہاں میں ہی ہوں مہدی نے انہیں گرفتار کر لیا اور اپنے ہمراہ بغداد لایا اور چاہا کہ ان کو سزا دے لیکن یہ بھی نہ پسند کیا کہ ان کو ایسی سزا دے جس کی وجہ سے وہ تمام مخلوق میں رسوا ہوں چنانچہ گھوڑوں کے ساتھ اصطبل میں انہیں بند کر دیا اور ایک بدذات سرکش کٹکھنا گھوڑا ان کے قریب باندھ دیا لیکن حق تعالیٰ نے اس گھوڑے کو ان کا مطیع کر دیا۔

مہدی جب اس میں ناکام ہوا تو انہیں ایک تنگ و تاریک حجرے میں مقفل کر کے کنجی اپنے پاس رکھ لی۔ تین دن کے بعد لوگوں نے دیکھا کہ حضرت عبد اللہ شہر کے باغ میں سیر کر رہے ہیں پکڑ کر مہدی کے پاس لے آئے اس نے پوچھا کہ تم کو کس نے باہر نکالا کہا جس نے قید کیا تھا یعنی اللہ تعالیٰ نے۔ مہدی نے کہا ابھی میں تجھ کو ختم کئے دیتا ہوں۔

عبد اللہؒ ہنسے اور فرمایا کہ اگر موت و زندگی تیرے قبضہ میں ہو تو ضرور مار ڈال۔ مطلب یہ تھا کہ میں مارنے والا جلانے والا خدا کو سمجھتا ہوں اور اس کو تیری قدرت میں نہیں سمجھتا۔ مہدی نے پھر انہیں قید خانہ میں ڈال دیا۔ چنانچہ جب تک مہدی بقید حیات رہا یہ قید خانہ میں مقید رہے اور اس کے مرنے کے بعد اس سے خلاصی پائی تو مکہ تشریف لائے اور سو اونٹ قربانی کرنے کی کوئی نذر مانی تھی وہ پوری کی۔

اسی طرح سے کتابوں میں لکھا ہے کہ ہارون رشید نے ایک مرتبہ ایک عورت کو حکم دیا کہ عود بجائے (عود ایک باجہ کا نام ہے) جب اس نے بجایا تو اس کا بجانا ہارون رشید کو کچھ پسند نہ آیا۔ اس عورت نے عذر کیا کہ حضور یہ میرا باجہ نہیں ہے اس لئے خراب بجا۔ اس نے حکم دیا کہ اس کا عود لایا جائے۔ ایک شخص گیا اور اس کا عود لے کر واپس آ رہا تھا کہ اچانک بوڑھے شخص کو دیکھا کہ سر جھکائے کھجور کی گٹھلیاں چن رہا ہے۔ باجہ والے نے کہا شیخ ذرا راستہ چھوڑ دو۔ شیخ نے جو سر اٹھایا تو دیکھا کہ ایک شخص عود لئے چلا آ رہا ہے۔ انہوں نے لپک کر اس کے ہاتھ سے عود چھین لیا اور زمین پر دے مارا باجہ ٹوٹ گیا۔ لوگ شیخ کو پکڑ کر کوتوالی لے گئے اور کوتوال سے کہا کہ ان کی نگرانی رکھئے میں امیر المومنین کو اس کی اطلاع کرنے جا رہا ہوں کہ ان کی فرمائش پر میں باجہ لئے جا رہا تھا انہوں

نے اس کو توڑ ڈالا۔

کوتوال نے کہا کہ ارے بھائی آج سارے بغداد میں کوئی شخص ان سے بڑھ کر زاہد نہیں ہے۔ امیر المومنین نے انہیں کیوں طلب کیا ہے۔ باجہ والے نے کہا کہ تم کو اس سے کیا مطلب میں کہتا ہوں کہ ان کو اپنی حراست میں رکھو۔ پھر وہ شخص ہارون رشید کے پاس گیا اور کہا کہ امیر المومنین میں عود لے کر آرہا تھا کہ ایک شیخ راستہ میں بیٹھے ہوئے ملے انہوں نے عود میرے ہاتھ سے چھین کر زمین پر پٹک دیا اور اس کو توڑ ڈالا۔ خلیفہ نے جب یہ بات سنی تو مارے غصہ کے چہرہ اس کا تمتما اٹھا اور آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ ہم نشینوں نے جب یہ رنگ دیکھا تو عرض کیا کہ حکم ہو جائے تو ہم اس کی گردن ماردیں۔ ہارون رشید نے کہا کہ نہیں پہلے اس کو یہاں بلاؤ تاکہ ہم اس سے مناظرہ یعنی بحث وگفتگو کریں۔ چنانچہ ایک خادم شیخ کے پاس آیا اور کہا کہ آپ کو امیر المومنین نے طلب فرمایا ہے سواری موجود ہے فوراً چلئے۔ شیخ نے فرمایا کہ میں سوار لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ مجھے پیدل ہی چلنا اچھا معلوم ہوتا ہے چنانچہ پیدل ہی خلیفہ کے محل تک آئے خدام نے اطلاع کی کہ شیخ تشریف لائے ہیں۔ ہارون رشید نے کہا کہ یہاں اس کمرے میں نہ بلاؤ کیونکہ یہاں بہت سی چیزیں خلاف شرع موجود ہیں چنانچہ خلیفہ خود ہی اٹھ کر دوسرے کمرے میں گیا اور وہاں شیخ کو طلب کیا۔ شیخ کی بغل میں کھجوروں کی گٹھلیوں کی ایک پوٹلی تھی لوگوں نے کہا اس کو یہیں باہر پھینک دیجئے خلیفہ کے سامنے اس کو لے کر کیا جایئے گا شیخ نے کہا یہی تو میرا رات کا کھانا ہے لوگوں نے کہا کہ آپ تو شاہی مہمان ہیں آپ کا کھانا ہمارے ذمہ ہے۔ شیخ نے فرمایا کہ تمہارا کھانا میرے کام کا نہیں ہے۔

جب شیخ خلیفہ کے روبرو حاضر ہوئے تو سلام کیا اور بیٹھ گئے۔ خلیفہ نے پوچھا کہ شیخ آپ نے یہ جو کام کیا ہے اس کا باعث کیا ہوا۔ خلیفہ نے شرم کی وجہ سے صاحب شرع عالم کے سامنے عود کا نام لینا بھی پسند نہ کیا شیخ نے فرمایا کہ میں نے تمہارے باپ دادا کو دیکھا ہے کہ ممبر پر برابر یہ آیت پڑھا کرتے تھے :۔

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ

یعنی اللہ تعالیٰ عدل واحسان کرنے کا حکم فرماتا ہے اور قرابت داروں کے دینے کا اور منع کرتا ہے بے حیائی اور خلاف شرع باتوں سے۔ اس کو میں نے تمہارے ہی باپ دادا سے سنا ہے اور یاد رکھا ہے۔ چنانچہ ایک چیز جب خلاف شرع دیکھا تو اس کو توڑ ڈالا۔ تیرا اس میں کیا نقصان کیا اور اب بتاؤ تمہارا اس کی بابت کیا خیال ہے خلیفہ نے کہا خدا کی قسم آپ نے بہت خوب کیا یہ فرما کر شیخ باہر تشریف لے گئے۔ خلیفہ نے ان کے پیچھے ایک خادم کو اشرفی کی ایک تھیلی دے کر بھیجا اور کہا کہ دیکھو اگر شیخ باہر جا کر لوگوں سے یہ کہیں کہ میں نے خلیفہ سے یوں کہا اور انہوں نے مجھ سے یوں کہا

(یعنی اپنی فتح پر فخر کریں) تو یہ تھیلی ان کو مت دینا اور اگر کچھ نہ کہیں تو دیدینا خادم ان کے پیچھے پیچھے گیا تو دیکھا کہ اسی جگہ جہاں پہلے گٹھلیاں چن رہے تھے جھک کر اسی طرح سے گٹھلیاں چننے میں مشغول ہو گئے ہیں اور کسی سے کوئی بات نہیں کی۔

چنانچہ خادم نے وہ تھیلی شیخ کے آگے پیش کی اور کہا کہ خلیفہ نے یہ آپ کو دیا ہے۔ شیخ نے فرمایا کہ اس کو اسی کے پاس واپس لے جاؤ یہ میرے کام کے نہیں ہیں اور یہ اشعار پڑھے۔

أَرَى الدُّنْيَا لِمَنْ هِيَ فِي يَدَيْهِ
هُمُوْمًا كُلَّمَا كَثُرَتْ لَدَيْهِ
إِذَا اسْتَغْنَيْتَ عَنْ شَيْءٍ فَدَعْهُ
وَخُذْ مَا أَنْتَ مُحْتَاجٌ إِلَيْهِ

یعنی میں دیکھتا ہوں کہ یہ دنیا جس کے پاس جتنی زیادہ ہوتی ہے اسی قدر اس کو ہم اور غم میں مبتلا کرتی ہے لہٰذا جب تجھے کسی چیز کی حاجت نہ ہو تو اس کی جانب توجہ ہی نہ کر اور اس چیز کو حاصل کرنے کی فکر کر جس کا تو محتاج ہے۔

اسی طرح سے بیان کیا جاتا ہے کہ خلیفہ مامون کے زمانہ میں ایک بزرگ لوگوں پر احتساب کیا کرتے تھے حالانکہ مامون کی جانب سے مقرر نہ تھے خلیفہ کو جب اس امر کی اطلاع ہوئی تو کہا کہ ان کو میرے سامنے حاضر کرو۔ لوگوں نے انہیں پیش کیا۔ خلیفہ نے ان سے پوچھا کہ آپ بدون ہماری اجازت کے کیوں امر بالمعروف کرتے ہیں آپ کو اس منصب پر کس نے مقرر کیا ہے۔ خلیفہ اس وقت کرسی پر بیٹھا ہوا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا اور بے خبری میں وہ کتاب اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر گئی تھی ان بزرگ نے اس کی بات کا تو جواب دیا نہیں اور اس سے کہا کہ "اٹھاؤ ورنہ مجھ سے کہو کہ میں اٹھا دوں" اس جملہ کو ان بزرگ نے دو تین بار کہا خلیفہ کو چونکہ کتاب کے گرنے کا علم ہی نہ تھا اس لئے وہ ان بزرگ کی بات سمجھا نہیں۔ پوچھا کہ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں اس پر ان بزرگ نے فرمایا کہ تیرے پاؤں کے نیچے خدا کا نام پڑا ہوا ہے اسے اٹھا۔ خلیفہ نے جب نیچے دیکھا تو پاؤں کے پاس کتاب پڑی ہوئی تھی بہت شرمندہ ہوا اس طرح سے ان بزرگ نے عملی طور پر خلیفہ کو بتایا کہ امر بالمعروف ہر عالم دین کا شرعی حق ہے رعایا تو الگ رہی میں تم کو بھی کر سکتا ہوں چنانچہ میں نے کیا اور تمہیں اس کو ماننا پڑا لیکن خلیفہ نے یا تو اسے سمجھا نہیں یا سمجھا لیکن شرم مٹانے کے لئے ٹال گیا اور ان بزرگ سے کہا کہ آپ اس کا جواب دیجئے کہ بغیر ہماری اجازت کے آپ نے احتساب کرنا کیوں شروع کیا؟ دراں حالیکہ اللہ تعالیٰ نے یہ کام ہمارے سپرد کیا ہے ہم اہل بیت رسول اور منصب خلافت پر فائز ہیں اللہ تعالیٰ نے ہمارے حق میں فرمایا ہے۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا

بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ

یعنی وہ صحابہ اور اہل بیت یا مطلق مسلمان ایسے ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین میں قوت دیں تو وہ نماز قائم کریں۔ زکوٰۃ ادا کریں۔ معروف کا امر کریں اور منکر سے منع کریں۔

دیکھئے اس میں یہ منصب امیر المومنین کا بیان کیا گیا ہے لہٰذا ہم ہی احتساب کرسکتے ہیں یا ہم جسے اجازت دیدیں وہ کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور کو احتساب کا حق نہیں ہے۔ پس آپ کیوں احتساب کرتے ہیں اس کا جواب دیجئے ان بزرگ نے فرمایا کہ آپ نے صحیح کہا بلاشبہ بات اسی طرح ہے جس طرح کہ آپ نے بیان کیا لیکن حق تعالیٰ نے ایک اور جگہ یہ بھی تو فرمایا ہے کہ :۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

یعنی مومن مرد اور مومن عورتیں اس میں سے بعض بعض کے دوست ہیں حکم کرتے ہیں اچھی باتوں کا اور منع کرتے ہیں بری باتوں سے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ :۔

اَلْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهٗ بَعْضًا

یعنی ایک مومن دوسرے مومن کے حق میں مانند بنیاد کے ہے کہ اس کا بعض بعض کو مضبوط کرتا ہے۔

(یعنی جس طرح بنیاد اور دیوار میں ایک اینٹ دوسری اینٹ سے کسی اور جڑی ہوتی ہے اور ہر ایک کو دوسرے سے تقویت پہنچتی ہے اسی طرح سے ایک مومن دوسرے کا خیر خواہ اور ناصح ہوتا ہے جسکی وجہ سے ہر ایک کو دوسرے سے دینی قوت حاصل ہوتی ہے) تو دیکھئے اے امیر المومنین یہ خدا کی کتاب ہے اور یہ حدیث رسول ہے اگر آپ اس کو مانتے ہیں تو میرا شکریہ ادا کیجئے کہ میں اس کام میں آپ کی مدد کر رہا ہوں اور اگر آپ اس کتاب و سنت ہی سے تکبر کریں تو آپ جانیں اور وہ ذات جانے جس کے قبضہ میں آپ کا معاملہ ہے۔ اب اسکے بعد آپ کیا فرماتے ہیں۔

ماموں رشید کو ان محتسب صاحب کی یہ بات بہت پسند آئی کہا کہ جب اس جذبہ کے پیش نظر آپ احتساب کر رہے ہیں تو آپ جیسے کو احتساب کرنا جائز ہے۔ جس طرح آپ ابتک احتساب فرماتے تھے فرماتے رہئے ہم آپ کو اس کی اجازت دیتے ہیں۔

(حکایت) شیخ ابوالحسن نوری قدس اللہ سرہٗ کا واقعہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ کشتی میں سوار ہو کر کہیں جا رہے تھے دیکھا تو اس میں شراب کے مٹکے معتضد باللہ کے لئے لوگ لے جا رہے تھے۔ شیخ نے سب کو توڑ ڈالا لیکن ایک مٹکا چھوڑ دیا۔ لوگوں نے ان کو معتضد باللہ کے سامنے پیش کیا جو کہ ایک ظالم بادشاہ تھا اور زبان سے پہلے اس کی تلوار چلتی تھی دربار میں لوہے کی کرسی پر بیٹھتا تھا اور

لوہے کا گرز ہاتھ میں لئے رہتا تھا۔ اس نے شیخ سے پوچھا کہ آپ کو محتسب کس نے مقرر کیا ہے؟

ان بزرگ نے برجستہ جواب دیا کہ جس نے تمہیں بادشاہ مقرر کیا ہے! معتضد باللہ نے یہ سنتے ہی سر نیچے جھکا لیا اور کچھ دیر تک جھکائے رہا اس کے بعد سر اٹھایا اور کہا کہ آخر آپ کے لئے اس پر باعث کیا امر ہوا۔ شیخ نے فرمایا کہ کچھ نہیں محض تم پر اور مخلوق خدا پر شفقت کے خیال سے میں نے ایسا کیا کہ تم کو گناہ سے بچایا اور مخلوق کو تمہاری اتباع کرنے سے۔ اس نے کہا کہ پھر ایک مٹکے کو کیوں چھوڑ دیا؟ فرمایا کہ ان مٹکوں کو توڑتے وقت میری قلبی توجہ حق تعالیٰ کے جلال کے مشاہدہ اور اس کے مطالبہ کے خوف میں لگی ہوئی تھی اور مخلوق کا ڈر اور تیرا رعب اور دبدبہ میرے قلب سے یکسر اٹھ گیا تھا اور میرے قلب کی ایسی حالت تھی کہ اگر تمام روئے زمین مٹکوں سے بھری ہوتی تو میں سب کو توڑ ڈالتا۔ یہ کیفیت مسلسل رہی لیکن آخری مٹکے پر پہنچ کر دلی خیال بدلا اور قلب میں ایک طرح کا عجب و تکبر پیدا ہوا کہ تجھ جیسے شخص کی بھی میں نے پرواہ نہیں کی اور ایسی جرأت سے کام لیا۔ بس اس خیال کے آتے ہی میں نے یہ سوچا کہ کار خدا میں نفس کی شرکت نہ ہونا چاہیے اس لئے آخری مٹکے کے توڑنے سے میں رک گیا۔ معتضد نے کہا کہ اچھا تو احتساب کے سلسلہ میں میں نے آپ کو اختیار کلی دیا آپ جو چاہیں کریں۔

شیخ نے فرمایا کہ امیر المومنین مجھ کو اس سے معاف رکھئے اس لئے کہ اب تک میں غیرت دین اور غیرت حق کی بنا پر امر بالمعروف کیا کرتا تھا اور اب میرا یہ کام بطور شرف امیر کے ہوا کریگا۔ یعنی آپ کے حکم کا پابند ہو کر کہ آپ کا حکم ہو تو کروں نہ ہو تو نہ کروں میں اسے پسند نہیں کرتا لہٰذا آپ یہ کریں کہ اپنے ملازمین کو حکم دیں کہ وہ مجھے صحیح سلامت یہاں سے نکال دیں اور آپ کے قلمرو سے باہر کردیں چنانچہ شیخ ثوریؒ وہاں سے تشریف لے گئے اور جب تک معتضد کا دور تھا بغداد میں قدم نہ رکھا۔ اللہ تعالیٰ کی ان پر رحمت ہو۔

اسی طرح سے کتابوں میں لکھا ہے کہ ہارون رشید ایک مرتبہ حج سے آرہے تھے جب کوفہ پہنچے تو چند روز وہاں قیام کیا۔ شہر کے لوگ اس کو دیکھنے کے لئے نکلے ان میں بہلول دانا بھی تھے (یہ حضرت بہلولؒ اس وقت کے اولیاء اللہ میں سے تھے اور امام اعظمؒ کے شاگرد تھے) راستہ میں ایک کوڑے خانہ پر بیٹھ گئے محلہ کے لڑکے ان کے گرد جمع ہو گئے۔ اتنے میں خلیفہ کی سواری سامنے سے گزری۔

حضرت بہلولؒ نے بلند آواز سے پکارا کہ اے امیر المومنین اے امیر المومنین، ہارون رشید نے منہ پر سے نقاب اٹھائی اور کہا لبیک یا بہلول، یعنی فرمایئے کیا فرماتے ہیں۔ بہلول نے کہا کہ اے امیر المومنین میں نے سنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب عرفات سے لوٹے تھے اور آپ اونٹنی پر سوار تھے تو آپ کے آگے آگے نہ تو مار پیٹ تھی اور نہ ہٹو بچو تھا اور نہ آگے بڑھو کا شور تھا

پھر یہ سب طمطراق تیرے ساتھ کیسی؟ امیرالمومنین تواضع اختیار کیجئے تواضع۔ تکبر کو چھوڑیئے۔ ہارون رشید یہ سن کر رو دیا یہاں تک کہ اس کے آنسو زمین پر گرے۔ اور کہا کہ بہلول کچھ اور نصیحت کیجئے اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی رحمتوں سے نوازے۔

حضرت بہلول نے فرمایا کہ اے امیرالمومنین جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے مال و جمال دیا ہو اور اس نے اپنا مال خرچ کیا ہو اور اپنے جمال کے ساتھ پارسائی اختیار کی ہو اللہ تعالیٰ اس کے نام کو اپنے دیوان خاص میں منجملہ ابرار کے لکھتا ہے۔

ہارون رشید نے کہا تم نے خوب بات کہی اچھا تو کچھ مجھ سے مانگو تاکہ میں تمہیں دوں۔ بہلول نے کہا جو مجھے دینا چاہتے ہو وہ ان لوگوں کو دیدو جن سے بطور ظلم کے تم نے مال وصول کیا ہے۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہارون رشید نے کہا کہ اچھا اگر تم پر کچھ قرض آتا ہو تو میں ادا کردوں۔ فرمایا کہ امیرالمومنین یہ تمام علمائے کوفہ موجود ہیں ان سب کا اتفاق ہے کہ قرض کی ادائیگی قرض سے جائز نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ تو نے لوگوں کا مال جو از راہ ظلم لیا ہے وہ تو ان کا تجھ پر قرض ہے اس سے تو چاہتا ہے کہ میں اپنا قرض ادا کروں پس قرض سے قرض کیونکر ادا ہو کیونکہ میرے سر سے بار اترا بھی تو تیرے سر رہا۔ ہارون رشید نے کہا کہ حضرت کچھ تو قبول کر لیجئے بقدر ایک دن کے کھانے کے ہی سہی۔ بہلولؒ نے آسمان کی طرف سر اٹھایا اور کہا کہ اے امیرالمومنین ہم اور تم سب خدا کے بندے ہیں یہ ہو نہیں سکتا کہ وہ تجھے تو یاد کرے اور ہمیں بھول جائے۔ ہارون رشید نے یہ سن کر نقاب منہ پر ڈالا اور روانہ ہو گیا۔

یہ واقعات اس امر پر دال ہیں کہ علماء نے امراء اور سلاطین کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلہ میں کبھی تیز تیز بھی کہا ہے اور ہر موقعہ پر نرمی ہی نہیں اختیار کی ہے۔ چنانچہ حضرت سفیان ثوریؒ نے ہارون رشید کو جو خط لکھا ہے اس میں تو بہت ہی سخت کلمے استعمال کئے ہیں مگر چونکہ یہ حضرات نفس سے خالی ہوتے تھے اور محض اللہ تعالیٰ کے لئے کسی کو کچھ کہتے تھے اس لئے ان کی تیزی بھی مفید ہی ہوتی تھی۔ ہم یہاں حضرت سفیان ثوریؒ کا وہ خط نقل کرتے ہیں اور اس فصل کو اسی پر ختم کرتے ہیں۔

بیان کیا جاتا ہے کہ جب ہارون رشید خلیفہ ہوئے اور امر خلافت ان کے سپرد ہوا تو تمام علماء اور صلحاء اس کے پاس مبارکباد دینے کے لئے آئے اور اس نے بھی یہ کیا کہ خزانوں کے دروازے کھولدئے اور ہر ایک کو انعام واکرام سے خوب خوب نوازا اور ہارون رشید خلیفہ ہونے سے پہلے عباد اور زہاد کے پاس زیادہ اٹھتے بیٹھتے تھے چنانچہ حضرت سفیان ثوریؒ سے بھی بڑی راہ و رسم تھی۔ حضرت سفیانؒ نے جب اس کے خلیفہ ہونے کی خبر سنی تو مبارکبادی کے لئے آنا تو درکنار اس سے ملاقات کرنا اور اس کی صورت دیکھنا ہی چھوڑ دیا۔ ہارون رشید چونکہ پہلے ان کے پاس بھی حاضر ہوتا

تھا اور ان سے قلبی تعلق تھا اس لئے خود ان کی ملاقات کا مشتاق ہوا۔ یہ خواہش ہوئی کہ ان کو اپنے پاس طلب کرے اور ان سے حدیث سنے۔ چنانچہ ایک خط سفیان ثوریؒ کے نام اس مضمون کا لکھا۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

یہ خط ہے خدا کے بندے ہارون رشید کی جانب سے اپنے دینی بھائی سفیان کے نام۔

بعد ازیں عرض ہے کہ برادر زم آپ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اخوت اور بھائی چارگی میں کیسی کچھ فضیلت رکھی ہے چنانچہ ہم کو جیسا تعلق اور رابطہ اخوت آپ کے ساتھ پہلے تھا ویسا ہی اب بھی ہے اور جو عقیدت و ارادت بندہ آپ سے رکھتا تھا ہنوز اس پر باقی ہے۔ اگر سلطنت اور حکومت کا یہ بار عظیم جسے اللہ تعالیٰ نے میرے کندھوں پر رکھا ہے۔ نہ ہوتا تو آپ کی خدمت میں میں خود حاضر ہوتا اور آپ کی صحبت سے مستفید ہوتا۔ آپ کو یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ میرے دوستوں میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو اس موقعہ پر میری ملاقات کو نہ آیا ہو اور مجھے مبارکباد ی نہ دی ہو میں نے بھی اپنے خزانہ کو ان پر کھول دیا تھا اور ہر ایک کو خاطر خواہ انعام واکرام دیا لیکن آپ تشریف نہ لائے آپ سے ملاقات کا بہت اشتیاق ہے۔ اسی شوق میں یہ خط لکھ رہا ہوں۔ مومن کی محبت اور باہم ملاقات کی جیسی کچھ فضیلت آئی ہے وہ آپ پر مخفی نہیں مجھے قوی امید ہے کہ آپ خط ملاحظہ فرماتے ہی فوراً۔ بلا توقف تشریف لائیں گے۔

فقط والسلام

خط لکھ کر ہارون رشید نے کسی خادم کو بلایا کہ اسے حضرت سفیان کے پاس پہنچا دے لیکن حضرتؒ کے مزاج کی تیزی کی وجہ سے کسی خادم کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ ان کے سامنے جائے۔ ایک شخص عباد نامی تھا اس کو بلایا اور وہ خط دیا اور کہا کہ کوفہ چلے جاؤ وہاں قبیلہ بنی ثور کو پوچھنا اس میں سفیان ثوری کو تلاش کر کے میرا یہ خط دیدینا اور جو کچھ وہ فرمائیں لفظ بلفظ یاد رکھنا اور مجھ سے آکر کہنا۔ عباد کہتے ہیں کہ میں قبیلہ ثور میں پہنچا تو پہلے مسجد میں گیا تو دیکھا کہ ایک بزرگ وہاں تشریف فرما ہیں اور لوگوں کی ایک جماعت ان کے گرد حلقہ باندھے بیٹھی ہوئی ہے اس طرح خاموش اور سر جھکائے جیسے چور ہو اور ان کو کسی ظالم بادشاہ کی پیشی میں لایا گیا ہو جس نے ان کے قتل کا حکم دیدیا ہو جیسے ہی نظر ان بزرگ کی مجھ پر پڑی تو گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا اَعُوْذُ بِاللّٰہِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ وَاَعُوْذُبِکَ اَللّٰھُمَّ مِنْ طَارِقٍ یَطْرُقُنَا اِلَّا طَارِقٌ بِخَیْرٍ یعنی پناہ مانگتا ہوں میں اس اللہ کی جو سننے والا اور جاننے والا ہے شیطان مردود سے اور اے اللہ میں پناہ مانگتا ہوں آپ کی ہر اس آنیوالے سے جو میرے پاس آئے بجز اس آنے والے کے جو خیر

کے ساتھ آئے۔

عباد کہتے ہیں کہ ان کے اس فرمانے سے میرے قلب پر بڑا اثر ہوا پھر میں مسجد کے باہر آیا۔ جب میں باہر آگیا تو وہ بزرگ نماز میں مشغول ہو گئے میں نے گھوڑے کو مسجد کے دروازے پر باندھا اور پھر اندر آگیا ان کے لوگوں میں سے کسی نے مجھے دیکھا تک نہیں اس لئے کہ مارے ہیبت کے کوئی سر اوپر اٹھا ہی نہیں سکتا تھا اس لئے کسی نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ بھی نہیں کیا چنانچہ میں خود ہی اس حلقہ میں ایک طرف کو بیٹھ گیا اور مجھ پر بھی وہی ہیبت طاری ہو گئی۔ میں نے کنکھیوں سے ان لوگوں کی طرف دیکھا اور آہستہ سے پوچھا کہ کیا حضرت سفیان یہی ہیں جو نماز پڑھ رہے ہیں۔ لوگوں نے کہا ہاں یہی ہیں میں نے خط ان کی طرف ڈالدیا۔ میرے خط پھینکتے ہی وہ اس طرح سے اچھل کر وہاں سے بھاگے جیسے مسجد کی محراب سے کوئی سانپ نکل آیا ہو پھر ہاتھ پر کپڑا لپیٹا اور خط کو لیکر ان لوگوں کی طرف جو ان کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے پھینک دیا اور فرمایا کہ تم میں سے کوئی پڑھے کہ اس میں کیا لکھا ہے۔ میں خدا کی پناہ چاہتا ہوں کہ ایسی چیز کو چھوؤں جسے ایک ظالم نے چھوا ہے جب خط سن چکے تو فرمایا کہ اس خط کی پشت پر جواب لکھو۔ لوگوں نے عرض کیا کہ اے عبداللہ (یہ حضرت سفیان کنیت تھی) وہ خلیفہ ہے اگر جواب علیحدہ کاغذ پر ہم لکھیں تو بہتر ہے۔ کہا کہ نہیں جی اسی کی پشت پر لکھو اگر یہ کاغذ حلال طریقہ سے اسکے پاس آیا ہے تو اس کو اسکا ثواب ملے گا اور اگر حرام طریقہ سے آیا ہے تو وہ جانے خود ہی اس کی سزا بھگتے گا اور فرمایا کہ میں اس پر اسلئے لکھواتا ہوں کہ جس چیز کو ظالم کا ہاتھ لگا ہے وہ ہمارے پاس رہ کر ہمارے دین کو خراب نہ کرے۔ ان لوگوں نے عرض کیا بہتر ہے فرمایئے کیا لکھیں۔ کہا لکھو۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ خط ایک بندۂ مردہ سفیان ابن سعید ثوری کی جانب سے ہے۔ بنام ایک ایسے بندے کے جو آرزوؤں کے ساتھ مغرور ہے جس کا نام ہارون رشید ہے جس سے سلب کرلی گئی ہے اس کے ایمان کی حلاوت

بعد ازیں سن لے میں تجھے لکھ رہا ہوں اور بتلا رہا ہوں کہ میں نے تجھ سے اپنا تعلق قطع کرلیا اور تیری دوستی سے بیزار ہوں اس لئے کہ تو نے مجھے اور میرے حاضرین کو اپنے اس فعل پر گواہ بنایا ہے کہ تو نے مسلمانوں کے لئے بیت المال کے دروازے کھولدئے اور بدون استحقاق کے ان پر مال خرچ کیا ہے یعنی ایسے لوگوں کو مال دیا ہے جو اس کے مصرف نہ تھے اور تو نے خود تو یہ کام کیا تھا مجھے

لکھ کر مجھے بھی گواہ بنالیا تو سن لے کہ میں اور میرے یہ سارے احباب کل بروز قیامت حق تعالیٰ کے سامنے یہ گواہی دیں گے کہ اے ہارون رشید تو نے مسلمانوں کے مال کو بغیر ان کی رضامندی کے بے محل صرف کیا۔ تو نے جس خرچ کرنے کو بڑے فخر سے لکھا ہے میں تجھ سے یہ پوچھتا ہوں کہ کیا فقیر اور مساکین تیرے اس فعل سے راضی تھے اور مولفتہ القلوب۔ مجاہدین فی سبیل اللہ اور ابن سبیل یعنی مسافرین کی رضامندی سے تو نے یہ کام کیا تھا۔ نیز یہ بتا کہ کیا حافظ قرآن اہل علم اور یتیم تیرے اس فعل سے خوش تھے۔ اے ہارون اپنے دامن سمیٹ لے اور اس کی جوابدہی کے لئے تیار ہو جا اور تدبیر کر اس مصیبت سے نجات پائیگی جو تجھ پر اس وقت نازل ہوگی کہ تجھے حاکم عادل جلالہ کے روبرو کھڑا کریں گے اے ہارون بس تجھ سے سلب کرلی گئی ہے علم و زہد کی حلاوت اور قرآن کی لذت اور صالحین کی ہم نشینی کی توفیق۔ تو ظلم کرنے پر راضی ہوا۔ تو ظالموں کا پیشوا بنادیا گیا۔

اے ہارون سن تو نے تخت حکومت پر بیٹھ کر تکبر کی چادر اوڑھی اور اپنے سامنے دروازے پر عزت اور نخوت کا پردہ ڈالا جس میں تو نے رب العالمین کے ساتھ مشابہت اختیار کی ہے (کہ ان کا ارشاد ہے کہ (الکبریاء ردائی) تو نے ظالم لوگوں کو اپنے دروازے پر بٹھایا تاکہ رعایا پر ظلم کریں اور ناانصافی کی داد دیں یعنی خود شراب پئیں اور لوگوں پر شراب کی حد جاری کریں خود زنا کریں اور مخلوق پر حد قائم کریں۔ خود چوری کریں اور چوروں کا ہاتھ کاٹیں۔ کیا تو یہ نہیں جانتا کہ ان سب کا گناہ تجھ پر ہوگا۔ اے ہارون اس گھڑی کو یاد کر جب کہ پکارنے والا یعنی اللہ تعالیٰ پکارے گا۔ کہ اُحْشُرُوْا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا یعنی جمع کرو ان لوگوں کو جنہوں نے ظلم کیا لہٰذا تو بھی لایا جائے گا اس حال میں کہ تیرے ہاتھ میں ہتھکڑی اور گردن میں طوق ہوگا اور تیرے اردگرد ظالم لوگ ہونگے اور تو ان کا پیشوا ہو کر آگے آگے ہوگا اور تیری نیکیاں دوسروں کے ترازو میں ڈالی جائیں گی اور تیرے ترازو میں بلا پر بلا اور ظلم پر ظلم لدا ہوگا۔

اے ہارون میری اس نصیحت کو گوش ہوش سے سن اور میری اس نصیحت کو محفوظ رکھ اور یہ جان رکھ کہ میں تیری خیر خواہی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ اے ہارون خدا سے ڈر اور رعیت کی رعایت کرنے میں حتی الامکان کوشش کر اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی حفاظت کر اور اپنی سرداری کا محافظ بن اور یہ سمجھ رکھ کہ ملک ہاتھ در ہاتھ چلا آرہا ہے اور اگر کسی کے پاس باقی رہتا تو تجھ تک پہنچتا۔ بعض لوگوں نے دنیا میں ایسا کام کیا کہ وہ ان کی آخرت میں مفید ہوا اور بعضوں نے ایسا کام کیا ہے کہ وہ ان کے لئے دنیا میں نافع ہوا اور بعضوں نے ایسا کام کیا جس نے ان کے دین اور دنیا دونوں کا نقصان کیا۔ اے ہارون! تو بھی اسی قبیل سے ہے کہ تو نے اپنے دین اور دنیا دونوں ہی کا نقصان کیا ہے۔ اب سن لے کہ اس کے بعد مجھ کو خط نہ لکھنا اگر لکھے گا تو میں جواب نہ دونگا

فقط والسلام

عباد جو قاصد تھا وہ کہتا ہے کہ جب خط پورا ہو گیا تو حضرت سفیان نے بغیر اس کو موڑے اور لپیٹے ہوئے میری طرف پھینک دیا اور اپنی مہر بھی اس پر نہیں لگائی۔ میں نے خط کو تو اٹھالیا لیکن خود اس درجہ متاثر ہو چکا تھا کہ میرے دل کی دنیا ہی بدل چکی تھی آخرت مستحضر ہو چکی تھا اور دل دنیا سے سرد ہو چکا تھا۔ مسجد سے نکل کر کوفہ کے بازار میں پہنچا اور اعلان کیا کہ ہے کوئی شخص ایسے غلام کا خریدار جو اپنے خدا سے بھاگ کر پھر اسکی طرف لوٹ آیا ہے۔ لوگ درہم و دینار لیکر آئے۔ میں نے کہا یہ میرے کام کے نہیں ہیں میں تو صوف کا ایک پرانا جبہ چاہتا ہوں اور اون کی کوئی کملی چنانچہ لوگ ایک خرقہ (ایک گدڑی) لے آئے میں نے خلیفہ کا لباس اور ہتھیار اتار کر لوگوں کو دیدیا اور وہ خرقہ پہن کر ہارون کے محل کی جانب ننگے پاؤں چلا راستہ میں جو کوئی مجھے دیکھتا تھا ہنستا تھا اور میرا مذاق اڑاتا تھا اور کہتا تھا کہ میاں یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔

غرض اسی حال میں میں ہارون رشید کے پاس پہنچا۔ جیسے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی بیٹھا تھا کھڑا ہو گیا۔ پھر بیٹھ گیا اور پھر کھڑا ہو گیا اور اپنے سر اور منہ پر طمانچہ مارنا شروع کیا اور بڑی واویلا مچائی اور کہا کہ اِنْتَفَعَ الرَّسُوْلُ وَخَابَ الْمُرْسِلُ یعنی ہائے افسوس قاصد کو تو فائدہ ہو گیا اور اسکو بھیجنے والا محروم ہی رہا۔ عباد کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ امیر المومنین اب مجھے بھی دنیا سے کیا لینا یہ کہہ کر وہ خط میں نے اسی طرح بلا تہہ کیا ہوا خلیفہ کی جانب پھینک دیا۔ خلیفہ نے خط کو پڑھنا شروع کیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اتنا رویا کہ تمام لباس اس کا تر ہو گیا۔ ہم نشینوں نے کہا کہ امیر المومنین سفیانؒ نے آپ کے مقابلہ میں بڑی بیباکی اور گستاخی سے کام لیا ہے اور کلام میں وہ حد سے تجاوز کر گئے ہیں ان کو ایسی سزا دیجئے اور اس طرح قید میں رکھئے کہ ان کو عبرت بھی ہو جائے۔

ہارون نے کہا چپ رہو خوشامدیو! دنیا میں پرلے درجہ کا احمق مغرور وہ شخص ہے جو تمہاری خوشامد پر مغرور ہو جائے اور بدنصیب ہے وہ شخص جو اس سلسلہ میں تمہاری بات سنے تم کو سفیانؒ سے کیا مطلب جو کچھ وہ کر رہے ہیں انہیں کرنے دو۔

راوی کہتا ہے کہ اس کے بعد سے حضرت سفیانؒ ری کا یہ خط برابر ہارون رشید اپنے پاس رکھتے تھے اور ہر نماز کے بعد اسے پڑھتے تھے اور خوب خوب روتے تھے۔ چنانچہ مرتے دم تک اس کا یہی معمول رہا۔ اللہ اس کو اپنی رحمت سے نوازے۔

(حضرت مؤلفؒ فرماتے ہیں کہ) دیکھو بادشاہوں اور امیروں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے کے باب میں اسلاف کا یہ طریقہ رہا ہے اور یہ تھا ان کا توکل حق تعالیٰ کے فضل پر اور یہ تھی ان کی سیرت کہ اہل ظلم کی پرواہ نہ کرتے تھے اور رب العزت کی قضا و قدر پر دل سے راضی رہتے

تھے۔ یعنی اللہ پر نظر کر کے بڑے سے بڑے خطرات اور مہالک میں بے خطر کود پڑتے تھے چونکہ نیت ان کی خالص تھی اور ارادہ میں صدق ہوتا تھا اس لئے ان کے کلام میں اثر ہوتا تھا اب اس زمانہ میں چونکہ علماء کی زبانوں کو طمع نے بند کر دیا ہے اس لئے وہ امراو سلاطین کے روبرو کلام ہی نہیں کر سکتے اس لئے کہ حق گوئی اور طمع دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔

طمع بند دو فتر ز حکمت بشوے
طمع بگسل و ہرچہ دانی بگوئے

کسی سے طمع رکھو تو دفتر کو حکمت سے دھو ڈالو (یعنی اب وہ حکمت تمہارے لئے بیسود ہے) اور جب لالچ کو اپنے اندر سے نکال پھینکو پھر کیا ہے جو چاہو کہو (بے خوف کہہ سکتے ہو)

علماء بیان فرماتے ہیں کہ رعیت کی خرابی بادشاہوں کی خرابی کی وجہ سے ہے اور بادشاہوں کی خرابی علماء کی خرابی کی وجہ سے ہے اور علماء کی خرابی بسبب غالب ہو جانے حب مال اور حب جاہ کے ہے اور جس پر کہ حب دنیا غالب ہوگی اس کے لئے رذیل اور چھوٹے لوگوں پر بھی احتساب ممکن نہ ہوگا چہ جائیکہ بادشاہوں اور بڑے لوگوں پر واللہ المستعان علیٰ کل حال۔ خدایا ہر ایک کو خصلت نیک نصیب فرما اور اے خدا ہم کو نیکی کی توفیق عطا فرما اور بدی سے محفوظ فرما۔ اور ہم کو ہم پر نہ چھوڑ کہ ہم اپنی رائے اور اپنی فکر سے جو جی چاہے کریں بلکہ اے اللہ تو ہمارا مددگار اور کارساز رہ اس لئے کہ بغیر تیری مدد کے ہم سے کچھ نہیں ہو سکتا اِنَّکَ اَنْتَ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ جَوَّادٌ کَرِیْمٌ مَلِکٌ بَرٌّ رَّؤُوْفٌ رَّحِیْمٌ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ یعنی بلاشبہ آپ ہی کثیر بخشش والے بردبار بہت سخی بزرگ شہنشاہ نیکی والے بہت مہربان اور نہایت رحم فرمانے والے بلکہ سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والے ہیں۔

فصل ششم

(ان منکرات کے بیان میں جو عادات میں برتی جاتی ہیں)

جانو کہ ان منکرات کی جزئیات اور تفصیلات کا احاطہ کرنا تو مشکل ہے تاہم اس فصل میں اجمالاً ان کا بیان کیا جاتا ہے ان ہی پر قیاس کر کے ان کی تفاصیل بھی معلوم کی جا سکتی ہیں۔ ایک بات یہاں یہ سمجھو کہ جو امور کہ مکروہ ہیں ان سے منع کرنا مستحب ہے اور سکوت مکروہ ہے اور جو چیزیں حرام ہیں بشرط قدرت ان سے منع کرنا واجب ہے اور سکوت کرنا حرام ہے اور علماء نے جہاں کسی امر کو مطلق منکر کہا ہے یا منکر محظور یعنی ممنوع کہا ہے تو مراد اس سے حرام ہے۔ ہم یہاں مساجد‘

بازار، راستہ، حمام اور دعوتوں کے منکرات کو بیان کرتے ہیں۔

مساجد کے منکرات کا بیان ازا نجملہ یہ ہے کہ لوگ نماز پڑھنے میں بڑی بے احتیاطی کرتے ہیں نہ تو تعدیل ارکان کرتے ہیں اور نہ رکوع اور سجدہ کو ہی اطمینان سے ادا کرتے ہیں اور یہ چیزیں امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک مکروہ ہیں اور امام شافعیؒ کے نزدیک مفسد نماز ہیں لہٰذا ان پر روک ٹوک کرنا ان کے مذہب میں تو واجب ہوا اور ہمارے مذہب پر مستحب ہے۔

(فائدہ) تعدیل ارکان اور طمانیت سے مراد یہ ہے کہ رکوع اور سجود میں بقدر تسبیح کے ٹھہرنا ایسا کہ بدن کا ہر ہر جزو اپنی جگہ پر آجائے یہ چیز رکوع اور سجدہ میں تو واجب ہے ہی قومہ اور جلسہ میں بھی واجب ہے لہٰذا اس کا ترک علماء محققین کے نزدیک مکروہ تحریمی ہے اور اسکا لحاظ نہ کرنے کی وجہ سے نماز بالکل ناقص ہو جاتی ہے یعنی واجب الاعادہ ہو جاتی ہے۔

جو شخص کسی نماز پڑھنے والے کے اندر کوئی عیب دیکھے مثلاً یہ کہ اس کے کپڑے میں نجاست لگی ہوئی ہے یا قبلہ کی جانب سے وہ کچھ پھر گیا ہے وغیرہ وغیرہ اور اس پر سکوت کرے تو خود بھی اس میں شریک سمجھا جائے گا۔ حدیث میں اسی طرح آیا ہے بلکہ یہ حکم ہر اس گناہ کا ہے جس پر قادر ہونے کے باوجود منع نہ کرے۔ چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ غیبت کا سننے والا جو اپنے کسی بھائی مسلمان کی غیبت سنے اور خاموش رہے غیبت کرنیوالے کے حکم میں ہے۔

اسی طرح سے منجملہ منکرات مسجد کے اس میں زور زور سے غلط قرآن شریف کا پڑھنا ہے اس سے منع کرنا اور اس کو صحیح قرآن سکھلانا واجب ہے چنانچہ اگر کوئی شخص مسجد میں معتکف ہو اور اس کا اکثر و بیشتر وقت اسی طرح سے لوگوں کے قرآن کی صحت کرانے اور انہیں منکرات مسجد سے منع کرنے میں صرف ہوتا ہو اور اسکی وجہ سے وہ نوافل ادا کرنے اور ذکر و فکر میں مشغول ہونے سے رہ جاتا ہے تو کچھ حرج نہیں ہے اس کا پہلا شغل ہی بہتر ہے اور اسی میں ثواب زیادہ ہے اس لئے کہ اس کا نفع دوسروں کو بھی پہنچتا ہے اور نوافل کا نفع تو محض اپنی ذات کے لئے خاص رہتا ہے اور اس عبادت کی فضیلت جو متعدی ہو لازمی عبادت سے زیادہ ہوتی ہے۔

جو شخص قرآن شریف بہت زیادہ غلط پڑھتا ہو اگر اس کے اندر اس کو صحیح کرنے کی قدرت و قابلیت ہو تو چاہئے کہ بدون تصحیح کئے پڑھنے سے اس کو منع کرے کیونکہ قرآن شریف کا غلط پڑھنا گناہ ہے اور اگر اس کے اندر سیکھنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے یعنی حروف کو اس کے مخارج سے نکالنے پر وہ قادر نہیں ہے تو اسے چاہئے کہ بہت مقدار نہ پڑھے بلکہ بقدر ضرورت پر یعنی اس قدر پر کہ جس سے نماز اس کی صحیح ہو جائے اختصار کرے لیکن اگر غلطی کم کرتا ہے اور زیادہ تر صحیح ہی پڑھتا ہے تو اگر قدر ضرورت سے زیادہ پڑھے تو کوئی حرج نہیں ہے لیکن ایسے شخص کو چاہیے کہ بلند آواز سے نہ پڑھے بلکہ آہستہ آہستہ پڑھے تاکہ اور لوگ اسکی قرأت نہ سنیں (یعنی چونکہ وہ کہیں

کہیں غلط پڑھ جاتا ہے تو وہ تو عند اللہ معذور ہو سکتا ہے دوسرے لوگ اس کی غلط قرأت کو کیوں سنیں) اور اگر اسکو زیادہ پڑھنے سے منع کردیا جائے تو یہ بھی ایک درجہ میں درست ہے باقی اگر اس کو تلاوت کا شوق ہی ہے اور قرآن شریف کے ساتھ انس ہے اس لئے وہ زیادہ پڑھنا چاہتا ہے تو اگر اس کے شوق و انس کو دیکھتے ہوئے اسے منع نہ کیا جائے تو اس میں بھی کچھ مضائقہ نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم

اور منجملہ منکرات مسجد کے موذنوں کا جلدی جلدی اذان کہنا ہے اور اس کے کلمات کو بہت زیادہ کھینچنا ہے (مطلب یہ کہ اذان ٹھہر ٹھہر کر کہنا چاہئے اور اس کے کلمات کو اس قدر نہ کھینچے کہ لفظ ہی بدل جائے۔ مثلاً اکبر کو ایسا کہا کہ اکبار ہو گیا یہ منع ہے) اور ایک غلط طریقہ ان لوگوں کا یہ ہے کہ حَیَّ علی الصَّلوٰۃ اور حیَّ علی الفلاح کہتے وقت سارے بدن کو قبلہ سے پھیر لیتے ہیں حالانکہ مستحب صرف چہرہ کا پھیرنا ہے۔ سینہ کا نہیں۔ اسی طرح سے ایک غلط طریقہ یہ ہے کہ فجر کی اذان صبح صادق سے پہلے کہہ دی جائے۔ اذان دینے والے اس کا بھی اہتمام نہیں کرتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ وقت کی پہچان نہیں رکھتے محض اذان پر رہتے ہیں ان کا نماز روزہ سب خراب ہو جاتا ہے اس لئے یہ سب چیزیں مکروہ ہیں۔

اسی طرح سے منجملہ ان مکروہات کے جو مسجد میں برتی جاتی ہی۔ خطیب کا سیاہ ریشمی کپڑا پہننا ہے جس میں کہ ریشم غالب ہو اسی طرح سے سنہری تلوار کا لٹکانا بھی ہے یعنی جس کا قبضہ یا نیام سونے کا ہو یہ اس لئے کہ ریشم اور سونے کا استعمال مردوں کے لئے حرام ہے۔ لہٰذا ان امور سے منع کرنا واجب ہے باقی خطیب کا لباس اگر محض سیاہ ہو اور ریشم کا نہ ہو تو حرام اور مکروہ تو نہیں ہے تاہم ترک کرنا اس کا بھی اولیٰ ہے اس لئے کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کپڑوں میں سے پسندیدہ سفید کپڑا ہے اور جن علماء نے کہ سیاہ کپڑے کو مکروہ اور بدعت فرمایا ہے تو ان کی مراد بھی یہی ہے کہ صحابہ کے وقت میں ان کے پہننے کا معمول نہ تھا اور یوں ہر بدعت حرام بھی نہیں ہے بلکہ حرام وہ بدعت ہے جو سنت کو متغیر کردے (یعنی جس کے عمل میں لانے سے سنت ترک ہو جائے)

منجملہ منکرات مسجد کے ایسے واعظوں کا وہاں۔ وعظ بیان کرنا ہے جو کہ بے اصل قصے اور موضوع حدیثیں بیان کریں اور جو شخص جھوٹے قصے بیان کرے وہ فاسق ہے اور اس سے اسکو روکنا واجب ہے۔ اسی طرح جو واعظ مبتدع یا دینی امور میں متہاون یعنی سستی کرنے والا ہو اور اکثر کلام اس کا اشعار اور بدعت کی باتیں ہوں تو اس کے وعظ میں بھی جانا جائز نہیں ہے مگر یہ کہ کوئی شخص اس لئے جائے کہ اس کو منع کریگا تو خیر وہ جا سکتا ہے۔ علماء نے فرمایا ہے کہ بہت زیادہ نقصان وہ چیز عالم فاسق (یعنی بے عمل عالم) اور صوفی جاہل یعنی زاہد بے علم۔ اور عمل میں سستی کرنے والے واعظ

ہیں۔ پس چاہئے۔ کہ وعظ کہنے والا صرف عفو و رجاہی کے مضامین نہ بیان کرے کہ یہ سبب بنے گا لوگوں کے طاعت میں سست اور معصیت پر دلیر ہو جانے کا (یعنی عمل میں سستی کریں گے اور نفس کی خواہشات بجالائیں گے اور ٹوکنے پر اس واعظ کے وعظ کا حوالہ دیدیں گے کہ خدا بڑا غفور رحیم ہے) اس لئے واعظ کو چاہئے کہ رجا اور خوف دونوں ہی کے مضامین بیان کرے جیسا کہ قرآن شریف کا طریقہ ہے۔

چنانچہ خوف اور تہدید بہت ہی نافع ہے اور خوف و رجا کا اعلیٰ درجہ یہ ہے جیسا کہ امیرالمومنین حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر قیامت کے دن (جب کہ تمام اولین و آخرین جمع ہونگے) حق تعالیٰ کی جانب سے یہ اعلان کیا جائے کہ تمام لوگ دوزخ میں ہونگے۔ بجز ایک شخص کے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے میں یہ امید رکھتا ہوں کہ وہ ایک شخص میں ہونگا۔ اور اگر یہ اعلان کیا جائے کہ سب لوگ جنت میں جائیں گے سوائے ایک شخص کے تو مجھے اندیشہ اور خوف ہو گا کہ شاید وہ میں ہی ہوں۔

منجملہ منکرات مسجد کے ایک یہ ہے کہ لوگ جمعہ کے دن حلقہ باندھ باندھ کر دوائیں بیچیں یا کھانے پینے کی چیزوں کی تجارت کریں یا تعویذ گنڈوں کا کاروبار پھیلادیں اور اسی قبیل سے یہ چیزیں ہیں کہ مسجد میں دھوکا فریب کا کوئی کام کیا جائے یا جھوٹ بولا جائے جیسا کہ پیشہ ور طبیبوں اور تعویذ فروشوں کا عام طریقہ ہوا کرتا ہے اور یہ چیزیں تو مسجد اور غیر مسجد ہر جگہ حرام ہیں اور ان سے منع کرنا واجب ہے۔ باقی جو معاملات اس قسم کے نہ ہوں مثلاً بغیر دھوکہ فریب کے دوائیں بیچیں یا وہاں کتابیں فروخت کرے یا کھانے پینے کی چیزیں فروخت کرے تو وہ حرام نہیں ہے بشرطیکہ ان کے اس عمل کی وجہ سے لوگوں پر جگہ نہ تنگ ہو جائے اور نماز پڑھنے والوں کو تشویش نہ ہو تاہم اولیٰ یہ ہے کہ اس قسم کا کام مسجد میں نہ کیا جائے اور ان کے جائز اور مباح ہونے کی بھی شرط یہ ہے کہ ایسا کبھی کبھی ہو جائے اور اگر مسجد کو دوکان ہی بنالے تو حرام ہے۔

چنانچہ بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ تھوڑی مقدار مباح ہوتی ہے اور بہت ہو جائے تو حرام ہو جاتی ہیں جس طرح سے کہ گناہ صغیرہ اگر کبھی کبھی اسکا صدور ہو جائے تو صغیرہ رہتا ہے اور لوگ اس پر اصرار کریں اور ہمیشگی برتیں تو کبیرہ ہو جاتا ہے۔ مسجد کے یہ منکرات جو (خرید و فروخت سے متعلق) اوپر بیان کئے گئے۔ حجتہ الاسلام امام غزالیؒ کے کلام سے ماخوذ ہیں (جو کہ مذہباً شافعی ہیں اس لئے یہ شافعیہ کا مسلک ہے) اور فقہ حنفی میں یہ لکھا ہے کہ مسجد میں خرید و فروخت کرنا۔ کھانا کھانا اور سونا وغیرہ۔ غیر معتکف کے لئے جائز نہیں ہے (اور معتکف بھی خرید و فروخت کے لئے زبانی معاملہ کر سکتا ہے۔ شے مبیع کو مسجد میں لانا اس کے لئے بھی جائز نہیں ہے لہٰذا اپنے طریقہ کے مطابق ہی عمل کرنا چاہئے۔

منجملہ منکرات مسجد کے ایک یہ ہے کہ پاگلوں اور دیوانوں اور چھوٹے بچوں کو مسجد میں نہ لایا جائے۔ ان لوگوں کا مسجد میں داخل ہونا اس لئے ٹھیک نہیں ہے کہ یہ خود تو کچھ کریں گے نہیں اور دوسرے لوگوں کے لئے بھی خلل اندازی ہی ثابت ہونگے نیز انکی وجہ سے مسجد کا نجاست سے آلودہ ہو جانا بھی کچھ بعید نہیں پس طہارت والے مقام کو نجاست سے ملوث کرنا اور عبادت گاہ کو تفریح گاہ بنانا کب زیبا ہے۔

(فائدہ) جو مٹی کہ مسجد میں پڑی ہوئی ہو یا ٹاٹ اور چٹائی جو مسجد میں بچھی ہوئی ہو اس سے اپنے پاؤں کا پوچھنا درست نہیں اس لئے کہ مسجد میں ہونے کی وجہ سے وہ قابل احترام ہے اور اس سے پاؤں پوچھنا ادب کے خلاف ہے۔ اسی طرح سے مسجد میں بیٹھ کر اجرت پر کچھ لکھنا یا اجرت پر لڑکوں کو اس میں پڑھانا یا اور کوئی پیشہ اور کسب کمائی مسجد میں کرنا مکروہ ہے۔ نیز اگر کوئی عید گاہ میں نفل پڑھے یا مسجد میں نماز جنازہ پڑھے تو اس سے منع کیا جائیگا کیونکہ یہ امور مکروہ ہیں۔ اسی طرح سے مسجد میں سائلین کا (لوگوں سے) سوال کرنا بھی جائز نہیں ہے بڑے گناہ کی بات ہے (کہ مسجد خالق سے مانگنے کی جگہ ہے نہ کہ مخلوق سے۔)

چنانچہ سوال کرنے والے کو مسجد میں دینا بھی مکروہ ہے لیکن بعض علماء نے فرمایا ہے کہ اگر سائل نمازیوں کے آگے سے نہ گزرے اور ان کی گردنوں کو نہ پھلانگے تو اس کو دینا مکروہ نہیں ہے۔ مسجد میں ریح خارج کرنا یا مسجد کے فرش اور دیوار پر تھوکنا اور مسجد کے اندر وضو کرنا اور بلند آواز سے بولنا یہ سب چیزیں منع ہیں اور بری ہیں۔ اسی طرح سے مسجد کو بلا ضرورت راستہ اور گزر گاہ بنانا مکروہ ہے۔ نیز بلا ضرورت مسجد میں دنیا کی باتیں کرنا بھی مکروہ ہے۔

کتاب الاشباہ والنظائر میں لکھا ہے کہ مسجد میں مباح کلام کرنا بھی نیکیوں کو اس طرح سے کھا جاتا ہے (یعنی ختم کر دیتا ہے) جس طرح آگ لکڑیوں کو جلا دیتی ہے اس لئے چاہئے کہ مسجد میں خاموش بیٹھے اور بس اللہ تعالیٰ کی جانب متوجہ رہے (جب مباح کلام کا یعنی جن باتوں کا ذکر کرنا جائز ہے اور وہ غیبت شکایت وغیرہ پر بھی مشتمل نہیں ہے۔ یہ اثر اور ضرر ہے تو ظاہر ہے کہ وہ باتیں جو فی نفسہٖ بری اور گناہ کی ہیں مسجد میں کس درجہ شنیع ہونگی)

اسی طرح سے مسجد کی چھت پر چڑھنا بلا کسی ضرورت کے مکروہ ہے۔ ہاں کوئی ضرورت داعی ہو مثلاً مرمت وغیرہ کرنا ہے تو جائز ہے اس لئے گرمی کی شدت کی وجہ سے مسجد کے نیچے کا حصہ چھوڑ کر چھت کے اوپر جماعت کرنا مکروہ ہے ہاں اگر نمازی زیادہ ہوں اور نیچے کا حصہ تنگ ہو جائے تو اوپر نماز پڑھنا جائز ہے اور اگر کوئی شخص مسجد میں لوگوں کی گردنیں پھلانگتا ہو تو اس کو اس سے منع کیا جائے گا (جیسا کہ لوگوں کا طریقہ ہے کہ بعد میں آتے ہیں اور صفوں میں بیٹھنے کے لئے لوگوں کی گردنیں پھلانگتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن جس طرح ان کا یہ فعل برا ہے اسی طرح پہلے آنیوالوں کو بھی

اس کا لحاظ ضروری ہے کے وہ پہلے اگلی صفیں پوری کریں ورنہ اگر سردی گرمی، دھوپ اور پنکھے کے خیال سے پچھلی صفیں بھرلیں ہیں اور آگے جگہ خالی چھوڑدی ہے تو اس وقت وہاں جانے والے سے اگر ان کو کوئی تکلیف پہنچ جائے تو وہ خود اس کے ذمہ دار ہیں دوسروں کو ملامت کرنے کے بجائے اپنے کو ملامت کریں کہ دنیاوی معمولی سی راحت کی خاطر صف اول کی فضیلت سے خود کو محروم رکھا۔

اسی طرح کسی مصیبت یا غم کی وجہ سے (لوگوں کی تعزیتی ملاقات کے لئے) مسجد میں تین دن تک یا اس سے کم بیٹھنا مکروہ ہے۔ پس یہ جو (ہمارے) یہاں رسم ہے کہ جس کا کوئی عزیز مرگیا تو وہ مسجد میں دوڑا گیا۔ پھول (یعنی تیجا وغیرہ) کرنے کے لئے یہ بات خلاف شرع ہے اس لئے کہ مسجد میں جب مطلق تعزیت کے لئے بیٹھنا مکروہ ہے تو کیا حال ہو گا اس کا کہ مسجد میں بیٹھا ہو قرآن کے پارے ہاتھ میں ہوں اور فاسق فاجر بلکہ غیر مسلموں تک کی تعظیم کے لئے بیچ بیچ میں کھڑا ہوتا ہو۔ نیز پڑھنے کے درمیان دنیاوی باتیں بھی کرتا جاتا ہو۔ تلاوت قرآن کرنے کے بغیر بھی مسجد میں دنیاوی باتیں کرنا مکروہ ہے چہ جائیکہ مسجد میں بھی ہو اور ہاتھ میں پارہ بھی لئے ہو اور تلاوت کے بیچ بیچ میں دنیا کی باتیں بھی ہوتی رہیں۔ اس کا قبح ظاہر ہے نیز اس کے علاوہ اس کی وجہ سے اور بہت سی خرابیاں ہوتی ہیں۔

چنانچہ کتاب نصاب احتساب میں تقریباً تیئیس[۲۳] وجہیں ایسی مجلس تعزیت کی کراہت کے متعلق لکھی ہیں جس کا نام لوگوں نے ثواب کی مجلس رکھا ہے۔ سبحان اللہ مجلس کریں اپنے نام و نمود کے لئے اور اس میں بیٹھ کر طرح طرح کے گناہوں کے مرتکب ہوں اور پھر امید رکھیں ثواب عظیم کی۔ ایسے لوگوں کو غور کرنا چاہیے کہ کہتے کیا ہیں اور کرتے کیا ہیں۔

راقم عرض کرتا ہے کہ اپنے ان ہی مفاسد کی وجہ سے تیجا اور چالیسواں کی مجلسیں علماء ربانی کے نزدیک بدعت اور منع ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جب ان میں ثواب نہ ملے گا تو پھر ایصال ثواب کیسا؟

بہرحال ہر چیز میں اتباع سنت کی برکت ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس نے میری سنت کو دوست رکھا اس نے مجھے دوست رکھا اور جس نے مجھے دوست رکھا وہ میرے ساتھ جنت میں ہو گا۔ لہٰذا اے بھائیو! اور عزیزو! اس سعادت عظمیٰ کے حاصل کرنے کی کوشش کرو اور اپنے جی سے نکالی ہوئی باتوں پر عمل کرنا چھوڑ دو۔ اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنَا وَاِیَّاکُمْ اتباع حبیبک صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اور تمہیں بھی اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

بازار کی منکرات کا بیان

اور منجملہ منکرات بازار کے معاملات میں جھوٹ بولنا ہے اور بیچی جانے والی چیزوں میں عیب کا چھپا لینا ہے اور جس شخص کو یہ معلوم ہو کہ خریدنے والا جھوٹا شخص ہے تو اس پر لازم ہے کہ بیچنے والے کو مطلع کردے ورنہ یہ بھی خیانت کے جرم میں شریک ہوگا کیونکہ جو شخص کہ کسی مسلمان کا مال ضائع کرنے کو پسند کرے وہ گنہگار ہے (خریدار کے کاذب ہونے کی صورت میں مال کے نقصان کی یہ صورت ہو سکتی ہے کہ مثلاً خریدنے والے نے کوئی سامان ادھار خریدنا چاہا اور بیچنے والے سے کہا کہ میں اس کی قیمت تین دن کے بعد دیدوں گا حالانکہ گزشتہ تجربات شاہد ہیں کہ یہ شخص کبھی اپنے وعدہ کو پورا نہیں کرتا اور اسی طرح سے جھوٹے وعدے کر کر کے لوگوں کو دھوکے دیا کرتا ہے۔ اس کی اس عادت کو ایک تیسرا شخص جانتا ہے تو اس پر لازم ہے کہ بیچنے والے کو اس سے باخبر کردے تاکہ مبادا وہ اس کے ہاتھ اپنا مال فروخت کرکے پھنس نہ جائے)

اور منجملہ منکرات بازار کے گز میں پیمانہ میں اور ترازو میں فرق کا ہونا ہے۔ (یعنی گز چھوٹا بنا رکھا ہے یا ناپ کا برتن کم ہے یا ترازو میں پاسنگ ہے اور اسی کو استعمال کرتا ہے جس کی وجہ سے خریداروں کو نقصان ہوتا ہے یا دو قسم کے باٹ یا ناپ رکھے ہوئے ہے ایک کم ایک زیادہ۔ ایک سے لیتا ہے دوسرے سے دیتا ہے) ایسی حالت میں اگر اس کو خود نہ روک سکے اور قدرت رکھتا ہو حاکم کو خبر کرنے کی تو اس کو خبر کردے۔ اور منجملہ بازار کے منکرات کے باجوں اور مزامیر کا بیچنا ہے مثلاً ڈھولک اور تنبورہ وغیرہ۔

اسی طرح سے حیوانات کی شکل کے کھلونوں کا بیچنا ہے مثلاً کتا، بلی، وغیرہ جیسا کہ عید وغیرہ کے موقعہ پر عام رواج ہے (اور اسی حکم میں ہے گھوڑے ہاتھی وغیرہ کی شکلوں کی مٹھائی کا بیچنا جیسا کہ ہمارے دیار میں غیر مسلموں کی بعض تقریبات میں رائج ہے)

اسی طرح سے منکر اور منع ہے سونے چاندی کے برتنوں کا فروخت کرنا (کیونکہ اس کا استعمال عورت اور مرد سب کے لئے حرام ہے) اسی طرح ریشمی کپڑوں کا بیچنا منع ہے جب کہ یہ معلوم ہو کہ یہ مردوں کے استعمال کے لئے خریدا جا رہا ہے کیونکہ ریشم کا استعمال مردوں کے لئے حرام ہے۔

اسی طرح سے کسی پرانے کپڑے مثلاً اونی چادر وغیرہ کو فریب دینے کے لئے دھو دھلا کر اور کلف استری وغیرہ کرکے نیا بنا کر بیچنا۔ یہ بھی منع ہے (مطلب یہ کہ بیچنے والے کی جانب سے ایسا کوئی طریقہ نہ استعمال ہونا چاہئے جس سے خریدنے والا دھوکے میں پڑے کہ یہ بھی منع ہے۔ باقی کسی پرانی چیز کو نیا کہنا یہ تو کذب بیانی بھی ہے۔ یہ چیزیں اگر نہ ہوں یا ان کا پرانا اور استعمالی ہونا ظاہر کردیا جائے تو پھر اس کا بیچنا منع نہیں ہے) بازار کی منکرات کے سلسلہ میں چند امور یہاں بیان کردیئے گئے ہیں اور باقی چیزوں کو ان ہی پر قیاس کرلیا جائے۔

(راستہ کی منکرات کا بیان) منجملہ رہگذر کی منکرات کے ایک یہ ہے کہ شارع عام میں (یعنی عام گذرگاہ پر) دوکان نہ رکھیں کہ لوگوں کے چلنے میں تنگی ہو جائے۔ اسی طرح سے کسی کے مکان کے قریب درخت لگائیں (کہ اس کی وجہ سے اس کے مکان کو نقصان پہنچے) اسی طرح جو چیز بھی راستہ کو تنگ کرے اور راستہ چلنے والے کو نقصان پہنچائے وہ منکر ہے اس سے احتراز کرنا چاہئے۔ مثلاً اپنی گائے بکری یا کسی جانور کو سڑک یا گلی میں باندھ دیا جس کی وجہ سے راستہ تنگ ہو گیا اور لوگوں کے اٹک کر گرنے کا بھی اندیشہ ہو گیا ہو تو یہ منع ہے۔ لیکن اگر راستہ کشادہ ہو اور چھوٹی رسی میں اپنے دروازہ کے سامنے ہی جانور کو باندھ دیا ہے جس سے چلنے والوں کو کوئی ضرر نہیں ہے تو یہ جائز ہے۔ کیونکہ ہر شخص کو اس قسم کی ضرورت پڑ ہی جاتی ہے۔ حاصل یہ کہ اس سلسلہ میں بطور قاعدہ کلیہ کے یہ سمجھ لو کہ جس چیز میں لوگوں کو ایذا اور ضرر ہو اس چیز کا شارع عام میں کرنا منکر ہے اور اس سے منع کرنا واجب ہے اور شارع عام سے مراد عام راستہ ہے جو کسی کے ساتھ مخصوص نہ ہو۔

اگر کوئی شخص کتا پالے ہوئے ہے جو اس کے دروازے کے باہر گلی میں بیٹھا رہتا ہے اور گذرنے والوں کو بھونکتا یا کاٹنے کو دوڑتا ہے تو صاحب خانہ کو اس سے روکنا واجب ہے یعنی اس سے کہا جائیگا کہ تم اپنے کتے کو باندھو یا گھر کے اندر رکھو تاکہ آنے جانے والے کو تکلیف نہ ہو۔

حمام کے منکرات کا بیان جس طرح سے کہ اس زمانہ میں ہوٹلوں کا رواج ہے جن میں مسافر اگر ٹھہرتے ہیں نہاتے دھوتے ہیں اور کپڑے بدلتے ہیں حتیٰ کہ شب کو قیام بھی کرتے ہیں اسی طرح سے اگلے زمانہ میں بکثرت اور اس زمانہ میں بھی کہیں کہیں شہروں میں صرف نہانے اور کپڑے وغیرہ بدلنے کے لئے جگہ مقرر ہوتی ہے جس میں غسل کی ساری ضروریات مہیا ہوتی ہیں۔ ٹھنڈے گرم پانی کا انتظام ہوتا ہے۔ نہلانے کے لئے ملازمین ہوتے ہیں۔ کچھ اجرت مقرر ہوتی ہے جس کو ادا کر کے اسے استعمال کر سکتے ہو۔ پھر جس طرح سے کہ جاذب نظر بنانے کے لئے ہوٹلوں کو سجاتے ہیں اسی طرح حمام بھی کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں بہت سی ایسی باتیں بھی اختیار کی جاتی ہیں جو شرعاً منع ہیں اس لئے حضرت مؤلف رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں ان ہی کو بیان کرنا چاہا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ۔

منجملہ منکرات حمام کے ایک یہ ہے کہ اس کے دروازوں پر جاندار چیزوں کی صورت یا مورت کھڑی ہو تو اگر قادر ہو تو انہیں توڑ دے اور تصویروں کو مٹا دے اور اس سلسلہ میں بس ان کے چہرہ کا بگاڑ دینا کافی ہے باقی درخت، دریا، پہاڑ وغیرہ کی تصویریں منع نہیں ہیں۔

اسی طرح منجملہ اس کے منکرات کے لوگوں کے روبرو اپنا ستر کھولنا یا دوسروں کا ستر کھولنا بھی ہے۔ اسی طرح سے منجملہ منکرات کے پٹ لیٹ کر حمام کے کسی نوکر کو اپنے اوپر لٹا بٹھا کر اپنے بدن

کو دبوانا بھی ہے جب کہ کوئی کپڑا وغیرہ درمیان میں حائل نہ ہو اور اگر شہوت کا خوف ہو تو حرام ہی ہے اور بعض جگہ یہ جو رسم ہے کہ حمامی تہمد کے اندر ہاتھ ڈال کر چڑھے اور کولھے وغیرہ ملتا ہے یہ تو بہت ہی برا ہے اس لئے کہ جن اعضا کا دیکھنا حرام ہے ان کا ہاتھ لگانا بھی حرام ہے (جب کہ درمیان میں کپڑے کا واسطہ نہ ہو)

منجملہ منکرات کے اپنے ہاتھ کپڑے اور نجس برتنوں کا اس حوض میں دھونا ہے جس میں تھوڑا پانی ہو، غیر مالکی کے لئے جائز نہیں البتہ مالکی کر سکتے ہیں اور اگر کہیں حنفی مالکی دونوں جمع ہوں تو احتساب نرمی کے ساتھ کرے۔

اور منجملہ منکرات حمام کے ایک یہ ہے کہ پانی اور صابن وغیرہ کہیں جمع ہو کر کائی بن جائے جس کے سبب آنے جانے والوں کے پھسلنے کا خطرہ ہو اس لئے اس کی صفائی کا بھی اہتمام چاہئے۔

ضیافت یعنی مہمانی کے منکرات کا بیان ازا نجملہ ایک یہ ہے کہ تکلف کے طور پر فرش ریشم کا ہو اور اس میں سونے چاندی کے برتنوں کا استعمال کیا گیا ہو۔ اسی طرح سے اس موقعہ پر باجہ بجانا اور گانے والی عورتوں کا موجود ہونا بھی ہے بالخصوص شہوت کے موقعہ پر اسی طرح سے منجملہ اس کے منکرات کے ایک یہ ہے کہ عورتیں مردوں کو دیکھنے کے لئے کوٹھے پر جمع ہوں کہ یہ تمام چیزیں حرام اور منع ہیں۔ اگر ان چیزوں کو روک نہ سکے تو ایسی مجلس میں جانا ہی جائز نہیں ہے البتہ فرش اگر بطور تکلف کے نہیں بچھایا گیا ہے بلکہ اس طور پر بچھا ہے کہ پامال ہوتا ہے اور روندا جاتا ہے تو منکر نہیں اور ضیافت کے اشد منکرات میں سے حرام کھانا ہے اور وہ مہمانی ہے جہاں کی جگہ اور فرش و فروش وغیرہ غصب کئے ہوئے ہوں نیز ظالم کے مجلس کی حاضری بھی ہے۔ اسی طرح سے نہایت ہی منکر اور خراب وہ مجلس ہے جہاں کوئی بدعتی شخص آکر بدعت کی باتیں بیان کرے۔ یا جہاں ایسا شخص موجود ہو جو زبان دراز اور فحش کنے والا ہو (اگر قدرت ہو تو ان برائیوں کو روک دے ورنہ خود اس مجلس سے کنارہ کش ہو جائے۔

اس طرح سے ضیافت کی خرابیوں میں سے ایک خرابی یہ ہے کہ اس میں کھانے پینے اور جائے قیام اور وہاں کے فرش و فروش میں اسراف بیجا اور تکلف بلیغ کیا گیا ہو یہاں پر ایک بات یہ سمجھو کہ مال کے سلسلہ میں دو چیزیں ہیں ایک تو اس کا ضائع کرنا ہوتا ہے اور ایک اس میں اسراف کرنا ہوتا ہے۔ ضائع کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بغیر کسی معتد بہ فائدہ کے مال کو تلف اور برباد کردینا۔ جیسے ریشمی کپڑوں کو بلا ضرورت جلا ڈالنا یا اس کو پھاڑ ڈالنا یا مال کو یونہی پھینک دینا اور اسی کے حکم میں ہے نوحہ اور مرثیہ پڑھنے والی عورتوں کو مال دینا یا گانے والی عورتوں پر خرچ کرنا۔ کیونکہ ان چیزوں میں عرفاً اگرچہ فائدہ ہے لیکن چونکہ وہ شرعاً حرام ہے اس لئے گویا یہ فائدہ ہی نہیں ہے اور اسراف کبھی ضائع کرنے کو بھی کہتے ہیں اور کبھی اس کا اطلاق مباحات میں زیادتی اور مبالغہ کے

ساتھ مال صرف کرنے پر بھی آتا ہے۔ مثلاً ایک شخص بال بچوں والا ہے اور اس کے پاس مثلاً سو دینار بھی موجود ہے اور وہ ان سب کو مہمان نوازی اور لوگوں کی خاطر ومدارات میں صرف کردیتا ہے تو وہ مسرف کہلائے گا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا۔ یعنی تم مال کے خرچ کرنے میں اپنے ہاتھ کو بالکلیہ فراخ بھی نہ کردو کہ محتاج ہو کر بیٹھ رہو اور لوگ تم پر ملامت الگ کریں۔ یہ آیت ایک ایسے شخص کے بارے میں نازل ہوئی تھی جو مدینہ میں رہتا تھا اور اس نے اپنا تمام مال بانٹ دیا تھا حتیٰ کہ اہل وعیال کے واسطے بھی کچھ نہ رکھا تھا اور بعضوں نے کہا ہے کہ یہ آیت خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے حق میں نازل ہوئی۔ ہوا یہ تھا کہ آپ نے ایک مرتبہ اپنا کرتہ اتار کر کسی کو دیدیا تھا اور نماز کے وقت مسجد میں تشریف لیجانے کے لئے فکرمند بیٹھے ہوئے تھے۔ بحرالعلوم اسی طرح سے قرآن شریف میں آتا ہے کہ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ○ یعنی بلاشبہ اسراف کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔

اسی طرح ایک مقام پر یہ فرمایا ہے کہ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا یعنی وہ لوگ جب کہ خرچ کرتے ہیں تو نہ تو اسراف کرتے ہیں اور نہ تنگی کرتے ہیں اور یہ حکم عام لوگوں کا ہے اور اس شخص کے لئے ہے جو بال بچوں والا ہے لیکن اگر کوئی شخص تنہا ہو اور اس کا توکل درست ہو چکا ہو تو اس کے لئے اپنا تمام مال صدقہ کردینا جائز ہے۔ باقی اہل وعیال والے کے لئے جب کہ اس کے اہل وعیال کا توکل بھی صادق ہو اور وہ لوگ اس پر راضی بھی ہوں ایسا کرنا شائد کہ جائز ہو۔

چنانچہ حضرت صدیق اکبرؓ کا واقعہ اس کی دلیل ہو سکتا ہے۔ یعنی یہ کہ وہ اپنا تمام مال جہاد کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آئے تھے پس ان کے اہل وعیال اس پر راضی ہونگے اس لئے ان کے لئے ایسا جائز ہوا۔ واللہ اعلم مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر عادات اور معاشرات کے بعض منکرات کا یہ بیان ہوا۔ باقی تمام منکرات کا بیان کرنا معہ انکے اصول وفروع کے بہت مشکل ہے اس لئے کہ اس پر موقوف ہے کہ ہر باب میں پہلے شرعی تفاصیل کا بیان کیا جائے اور اس کا طویل الذیل ہونا ظاہر ہے۔ واللہ الموفق والمعین۔

فصل ہفتم

ان چند متفرق مسائل کا بیان جن کا تعلق گزشتہ فصل سے ہے

مسئلہ۔ بیٹے کو یہ حق پہنچتا ہے کہ باپ پر احتساب کرے۔ اسی طرح سے غلام کو آقا پر۔ بیوی کو خاوند پر، شاگرد کو استاد پر اور رعیت کو حاکم پر بھی احتساب کا حق حاصل ہے لیکن اقسام احتساب میں سے درجہ اول اور درجہ دوئم ہی کا حق حاصل ہے یعنی غلطی کو ادب کے ساتھ بتا دینا اور نرمی کے ساتھ نصیحت کرنا۔ باقی احتساب کے جو اور دوسرے درجات ہیں۔ یعنی زجر اور توبیخ کرنا یا تشدید اور تہدید کے ساتھ پیش آنا یا زدوکوب وغیرہ کرنا ان کا استعمال ان لوگوں کے لئے جائز نہیں ہے لیکن احتساب کے پانچویں درجہ یعنی امر منکر کو بگاڑ دینا اور ہاتھ سے توڑ دینا جبکہ وہ امر منکر از قسم مزامیر یعنی باجہ وغیرہ کے ہو یا مثلاً شراب ہے تو اسکا بہا دینا اس میں باپ کو ایذا ہوتی ہو تو اس درجہ کو عمل میں لانے اور نہ لانے کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے (یعنی باپ کے آگے لڑکے نے شراب رکھی ہوئی دیکھی جس کے متعلق وہ یہ جانتا ہے کہ ابھی باپ اسے پئے گا اور یہ بھی سمجھتا ہے کہ اگر میں اسے گرا دیتا ہوں تو والد صاحب بہت خفا ہونگے اور ان کو سخت ایذاء ہوگی اور لڑکا قادر ہے کہ اسے پھینک دے تو آیا اسے احتساب کا یہ درجہ کہ باپ کے آگے سے شراب اٹھا کر پھینک دے اگرچہ وہ متاذی ہو حاصل ہے یا نہیں اس میں علماء کا اختلاف ہے) قول مختار یہ ہے کہ اگر باپ کو اس لئے ایذا ہوتی ہو کہ وہ شراب کا عاشق اور اس گناہ کا دلدادہ ہے تو بیٹے کے لئے اس کا پھینک دینا جائز ہے اور اگر مال کے نقصان کی وجہ سے ایذا ہو رہی ہے تو جائز نہیں۔

اور یہ حکم جو بیان ہوا باپ بیٹے کا ہے۔ باقی غلام اور آقا اور بیوی اور خاوند بھی ان ہی کے حکم میں ہیں اور رعایا اپنے بادشاہ کو احتساب صرف گناہ کے معلوم کرانے اور نرمی کے ساتھ نصیحت کرنے ہی کی حد تک کر سکتی ہے کیونکہ زجر اور توبیخ یا تشدد کی وجہ سے حشمت سلطنت اور شاہی رعب کے فوت ہونے کا اندیشہ ہے جو سب کے لئے مضر ہے۔

اسی طرح استاد اگر اپنے علم کے تقاضہ پر عمل نہ کرتا ہو تو شاگرد کو اس پر احتساب کرنے کا حق حاصل ہے کیونکہ یہ احتساب اس علم کا تقاضہ ہے جو اس نے اس سے حاصل کیا ہے۔

مسئلہ مسلمانوں کے مال کی حفاظت کے لئے بقدر اپنی استطاعت کے کوشش کرنا واجب ہے۔ اس لئے کہ یہ بھی منجملہ حقوق اسلام کے ہے کیونکہ اس میں اس سے ایذا کا دفع کرنا ہے اور اس کا درجہ سلام کے جواب دینے اور دیگر حقوق سے بڑھا ہوا ہے اور گواہی کو چھپانا جب کہ اس کی وجہ

سے کسی مسلمان کا مال ضائع ہو رہا ہو منجملہ ممنوعات کے ہے البتہ اگر گواہی دینے میں اس کا مالی یا جانی ضرر ہو ایسا کہ جس سے خود کو بچانا ضروری ہو اس وقت سکوت جائز ہے کیونکہ دوسرے کے نفع کے لئے اپنا نقصان اٹھانا واجب نہیں۔ باقی دوسری مخلوق کی حاجت روائی کو اپنی حاجت پر مقدم رکھنا بہتر اور مستحب ہے اور انسان کے دینی کمال اور اس کے اسلام کی پختگی کا ثمرہ ہے۔ تاہم اس کو عام مخلوق پر واجب کرنا اس کے ضرر اور حرج کا موجب ہے۔ (اس لئے ہر شخص اپنی مصلحت اور جذبہ ہمدردی کو خود دیکھ لے) مثلاً اگر یہ دیکھے کہ کوئی جانور کسی کا کھیت چر رہا ہے اور اس کے نکالنے میں پریشانی اٹھانی پڑے گی تو اس کی خاطر خود تکلیف اور مشقت اٹھانا واجب تو نہیں ہے لیکن اگر معمولی ہی سی تکلیف ہو اور محض اس کے مالک کو خبر کر دینا کفایت کر جائے تو اس کو ترک کرنا جائز نہیں۔ مالک کو خبر تو ضرور کر دے۔

اسی طرح سے اگر اپنے اوپر معمولی سی مشقت اٹھانی پڑے اور اس سے کسی مسلمان کو نفع کثیر پہنچ جائے تب بھی اس کام کو ترک نہ کرے۔ مثلاً اگر اپنے ایک درہم کے نقصان ہونے میں کسی مسلمان کا سو درہم کا فائدہ ہوتا ہے (یعنی وہ سو درہم کے نقصان سے بچ جاتا ہے) تو چاہئے کہ اپنا نقصان برداشت کرے اور اس کو اس نقصان سے بچا لے۔

مسئلہ کسی مسلمان کی کوئی چیز راستہ میں پڑی ہوئی ہو تو اس کو اٹھانا اور اسے پہنچانا آیا واجب ہے یا نہیں اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ حق یہ ہے کہ اس میں تفصیل ہے۔ اگر وہ پڑی ہوئی چیز ایسی جگہ میں ہے کہ اگر وہ نہ اٹھائے تو ضائع نہ ہو گی جیسے کسی ایسی مسجد میں ہو جہاں کے آنے جانے والے لوگ متعین ہیں اور وہ سب کے سب امین اور دیندار ہیں۔ ایسی جگہ سے اس چیز کا اٹھانا واجب نہیں۔ اور اگر ایسے مقام پر پڑی ہو جہاں ضائع ہونے کا احتمال ہو (یعنی غالب گمان یہ ہو کہ اگر میں نہیں اٹھاؤں گا تو مالک کو بھی نہ مل سکے گی تو یہاں پر دو صورتیں ہیں۔ اگر اس کے اٹھانے میں اور اپنے یہاں رکھنے میں تکلیف اور مشقت زیادہ ہو یا مثلاً کوئی جانور ہے جو دانا گھاس اور اصطبل کا محتاج ہے تب بھی اس کو لانا واجب نہیں اور اگر زیور یا کپڑے یا اسی قبیل کی کوئی چیز ہے کہ اس میں صرف اعلان اور تشہیر کی ضرورت تو ہے اس کے علاوہ کوئی مشقت نہیں تو چاہئے کہ اس کو اٹھا لے اور اعلان وغیرہ کی مشقت کو مسلمان کا حق سمجھ کر گوارا کرے تاہم اگر نہ اٹھائے تو بھی جائز ہے اس لئے کہ دوسرے کے حق کی خاطر خود تکلیف اٹھانا اور اپنے کو مشقت میں ڈالنا واجب نہیں جس طرح سے کہ ادائے گواہی کے لئے دور دراز شہر میں جانا ضروری نہیں حاصل یہ کہ یہاں تین صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس کے اٹھانے اور پہنچانے میں بڑی محنت اور مشقت سے دوچار ہونا پڑیگا یہاں اٹھانا واجب نہیں۔

اور دوسری صورت یہ ہے کہ محنت اور مشقت بھی کچھ نہیں اس کی معمولی کوشش سے ایک

مسلمان کا مال ضائع ہونے سے بچ جائے گا اس صورت میں اٹھالینا لازم ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ نہ تو بہت زیادہ مشقت ہو اور نہ بالکل ہی آسانی ہو اس میں بہت سے مراتب متوسط ہو سکتے ہیں۔ اس کا معاملہ اور حکم انسان کی عقل اور اس کے قلب کے فتویٰ کے حوالہ کیا گیا ہے۔ جس میں اپنے دین کی سلامتی پائے وہی شق اختیار کرے باقی اتنا ضرور خیال رکھے کہ فعل ہو یا ترک اس میں بہرحال حق تعالیٰ کی رضا ملحوظ ہو نہ اپنے نفس کی خواہش کو پورا کرنا۔

(فائدہ) جو مال کہ کہیں راستہ میں گرا پڑا ملے اور اسکا مالک معلوم نہ ہو اس کو شرعاً لقطہ کہتے ہیں۔ فقہاء فرماتے ہیں کہ لقطہ کی تعریف لازم ہے۔ اور تعریف اس کو کہتے ہیں کہ لوگوں میں اس کا اعلان کرتا رہے۔ جس جگہ وہ چیز ملی ہے اس کے آس پاس فرداً فرداً بھی کہہ دے یا مجمع میں اعلان کردے کہ میں نے ایک چیز پائی ہے (اور اس کا اجمالی پتہ بتائے تعین نہ کرے مثلاً یوں کہہ دے کہ میں نے کوئی رقم پائی ہے یا ایک گھڑی مجھے ملی ہے یا ایک کپڑا مجھے ملا ہے) اور یہ تشہیر اتنی مدت تک کرے کہ اس کو یقین ہو جائے کہ اب اس کا مالک اس کو تلاش نہ کرتا ہو گا اور اسے صبر آگیا ہو گا کہ اب وہ چیز نہ ملے گی اور یہ ان چیزوں کا حکم ہے جو کچھ مدت تک ٹھہر سکتی ہوں اور جو ایسا سامان ہو کہ جس کے سڑنے اور خراب ہو جانے کا اندیشہ ہو تو اس کے خراب ہونے سے پہلے پہلے اعلان کرے۔

اور لقطہ کا حکم یہ ہے کہ اگر مالک مل جائے (اور پتہ اور نشان صحیح صحیح بتلادے) تو اس کو دیدے ورنہ مذکورہ بالا مدت تک تعریف اور تشہیر کرنے کے بعد اگر غریب ہے تو اپنے تصرف میں لاسکتا ہے اور اگر امیر ہے تو اس کو صدقہ کردے لیکن صدقہ کرنے کے بعد اگر مالک آگیا تو اگر اس نے صدقہ کو جائز رکھا تو فبہا اس کا ثواب اس کو مل جائے گا اور اگر اس نے اپنی چیز ہی کے لینے پر اصرار کیا تو وہ اب تو باقی رہی نہیں اس کو اختیار ہے چاہے اٹھانے والے سے ضمان لے لے یا اس فقیر سے جس پر صدقہ کیا گیا۔ باقی اس کی پوری تفصیل فقہ کی کتابوں سے معلوم کرنا چاہیے۔

مسئلہ کسی شخص کو دیکھا کہ وہ اپنا ہاتھ کاٹنا چاہتا ہے تو اس کو روکنا واجب ہے۔ اگرچہ اس کے منع کرنے میں اس کے قتل ہو جانے کا اندیشہ ہے (یعنی اس کا احتمال ہو کہ یہ جب اس کو منع کرے گا تو وہ اپنے ارادہ سے باز نہیں آئے گا اور پھر ہو سکتا ہے کہ ...... (دھینگا مشتی میں نوبت اس کے قتل کی ہو جائے۔)

سوال :۔ یہاں اشکال یہ ہوتا ہے کہ اس کا اپنا ہاتھ کاٹنا تو اس قدر شنیع سمجھا گیا کہ اس سے روکنا ضروری ہو گیا لیکن اس کا قتل کیونکر جائز ہو گیا اس سے تو کہیں اہون تھا کہ وہ اپنا ہاتھ ہی کاٹ لیتا۔

جواب :۔ اس اشکال کا یہ ہے کہ ہمارا مقصود اس کے جان یا ہاتھ کی حفاظت نہیں ہے بلکہ ہماری غرض تو صرف ایک امر منکر سے اس کو روکنا تھا۔ اب اگر اس سلسلہ میں وہ قتل ہو جائے تو ہم پر کوئی الزام نہیں کیونکہ مقصود ہمارا نہی عن المنکر تھا نہ کہ قصداً اس کا قتل۔

مترجم عرض کرتا ہے کہ یہاں یہ صورت ہوگی کہ قتل اتفاقی طور پر بلا قصد و اختیار ہے، اور بلا شان و گمان کے پیش آگیا ہو مثلاً اس سے چھری یا تلوار چھین رہا تھا اچانک گلے پر لگ گئی جس کی وجہ سے اس کی جان تلف ہو گئی باقی اگر پہلے سے اس کا احتمال غالب ہو تو اس کا روکنا لازم نہیں اس لئے کہ مؤلف نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے واجب ہونے کی شرط یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ بشرطیکہ جس منکر کو منع کر رہا ہے اس سے بڑھ کر دوسرے کسی منکر کے پیدا ہو جانے کا احتمال نہ ہو۔ تب واجب ہے ورنہ نہیں۔

مسئلہ جو مال کہ صوفیوں میں تقسیم کرنے کے لئے وصیت کیا ہو تو جو شخص بظاہر صوفیوں کی صفت پر ہو تو وہ اس کے پانے کا مستحق ہے اس لئے کہ تصوف کی حقیقت تو ایک امر باطن ہے کسی پر اس کا حکم لگانا مشکل ہے اور ظاہری صفات صوفیوں کی پانچ ہیں۔ صلاح، فقر، صوفیوں کا سا لباس اور کسی پیشہ کا اختیار نہ کرنا۔ صوفیوں کے ساتھ خانقاہ میں رہنا۔

چنانچہ جس شخص میں صلاح نہ ہو وہ اس کا مستحق نہیں اور اگر صلاح رکھتا ہو لیکن فقر نہ رکھتا ہو تو وہ بھی اس کا مستحق نہیں اور فقر نہ رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ امیر شخص ہے، روپیہ پیسے والا ہے اور اگر ایسا امیر ہے کہ جو کچھ آتا ہے اس کو خرچ کر دیتا ہے تو یہ غنا مانع نہیں ہے۔ اس کو بھی وصیت کی تقسیم سے حصہ ملے گا۔ اور اگر ان میں ملا جلا نہیں رہتا لیکن لباس ان ہی جیسا پہنتا ہے اور اخلاق ان ہی جیسا رکھتا ہے تو یہ بھی مستحق ہے اور اگر ان کے سے صفات تو رکھتا ہے لیکن ان کے جیسا لباس نہیں پہنتا تو مستحق نہیں ہے مگر یہ کہ ان کے ساتھ خانقاہ میں رہتا سہتا ہو تو پھر مستحق ہو جائے گا اس لئے کہ ملا جلا رہنا اور لباس پہننا ان دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کی کفایت کر جاتا ہے اور اگر بال بچوں والا ہے کہ کبھی تو خانقاہ میں آتا ہے اور کبھی گھر چلا جاتا ہے تو یہ شخص مستحق نہیں ہے۔

فائدہ۔ پیشہ اور کمائی میں سے بدترین کسب (کمائی) سنار۔ قصاب اور اسی قسم کے لوگوں کی ہے۔ کیونکہ یہ موجب قساوت قلب اور سبب بددیانتی بنتی ہے۔ اور بہترین پیشہ کتابت ہے اور قرآن کا پڑھانا اور دینی مسائل کا سکھانا۔ بعضوں کے نزدیک اجرت کے ساتھ مکروہ ہے اور بعض علماء نے اسے جائز فرمایا ہے چنانچہ متاخرین کا فتویٰ جواز ہی پر ہے لیکن کافروں کا پڑھانا عین گمراہی اور بے نصیبی ہے اس لئے کہ اکثر احوال میں یہ فعل ان کی محبت اور خیر خواہی کا سبب بنتا ہے

کیونکہ احسان کرنے والے کی محبت فطری اور جبلی ہوتی ہے۔
چنانچہ ہم نے بعضے کافروں کے معلمین کو دیکھا ہے کہ ان کی صحبت اور تعلق کی تاثیر سے ایسے ہوگئے ہیں کہ صفت جہل اور گمراہی ان میں گویا جبلی ہوگئی ہے نعوذ باللہ منہ اور بچوں کو تعلیم دینا موجب حماقت ہے اور ذریعہ ہے سبکی عقل کا اس لئے کہ محبت کی بڑی تاثیر ہوتی ہے۔

مسئلہ۔ ہدیہ اور رشوت کے درمیان فرق دقیق ہے کیونکہ دونوں صادر ہوتے ہیں۔ رضا اور خوشی سے اور خالی نہیں ہوتے غرض سے لیکن ایک حرام ہے یعنی رشوت اور دوسرا حلال ہے یعنی ہدیہ۔ نہ صرف حلال بلکہ مستحب ہے۔ پس ان میں فرق معلوم کرنا ضروری ہے۔ ان میں باہم فرق سمجھنے کے لئے پہلے یہ سمجھو کہ جو شخص کسی دوسرے کو اپنا مال دیتا ہے وہ بغیر غرض کے نہیں دیتا پس غرض اس کی یا تو اخروی (یعنی ثواب آخرت) ہوتی ہے یا دنیوی ہوتی ہے یعنی نفع عاجل۔ پھر دنیوی نفع جو مقصود ہوتا ہے تو وہ یا مال کے قبیل سے ہوتا ہے یا یہ مقصود ہوتا ہے کہ تحصیل مقصود کے لئے اس سے کچھ مدد حاصل کرے یا یہ کہ اس کا قرب اور اس سے محبت دلی حاصل کرے پھر اس کا قرب و محبت جو حاصل کرنا چاہتا ہے یا اس سبب سے کہ واقعی اس کی ذات ہی مطلوب ہے اور یا اس لئے کہ اس کی محبت کو کسی اور مقصود کی تحصیل کا ذریعہ بنانا چاہتا ہے یہ کل پانچ قسمیں ہوئیں غرض کی۔

یعنی اول یہ کہ کسی کو مال دینے سے غرض ثواب آخرت ہو اس کی چند صورتیں ہیں وہ یہ کہ جس کو مال دے رہا ہے وہ کوئی محتاج اور فقیر شخص ہے یا بزرگ اور عالم ہے یا کوئی دینی شرف و نسب رکھتا ہے۔ مثلاً یہ کہ سید ہے یا یہ کہ کوئی صالح اور متقی شخص ہے۔
پس جسے مال محتاج اور فقیر سمجھ کر دے رہا ہے اگر اسے احتیاج نہ ہو تو اس کو یہ مال نہ لینا چاہیے اور احتیاج کے بھی مختلف درجات ہیں اور مدار اس کا مال دینے والے کی نیت اور قصد پر ہے کہ اس نے ان صاحب کو جس درجہ کا محتاج سمجھ کر دیا ہے یہ بھی اتنے محتاج ہیں یا نہیں اور جس شخص کو اس کے نسب کے شرف کے خیال سے دیا ہے تو اگر وہ اس نسب کو نہ رکھتا ہو تو اس کے لئے مال کا لینا حرام ہے۔ اسی طرح سے اگر علم کا لحاظ کر کے دے تو اگر اتنی مقدار میں علم نہ رکھتا ہو جو کہ دینے والے کے گمان میں ہے تو وہ مال نہ لے۔ اور اگر اس کے صلاح کے خیال سے دے تو اگر واقعہ میں یہ شخص ایسے فسق کا مرتکب اور اس سے متصف ہو کہ اگر دینے والا اس سے مطلع ہو جاتا تو نہ دیتا تب بھی اس کو نہ لینا چاہیے کیونکہ ایسے آدمی دنیا میں بہت کم ہیں کہ جسے وہ صالح سمجھتے ہوں اور اس کا باطن کھل جائے تب بھی ان کی جانب میلان قلبی بدستور رہے۔ حاصل اس کا یہ کہ کسی کی بد وضعی دیکھ کر اعتقاد پھر ہی جاتا ہے لیکن یہ جمیل مطلق اور رحیم برحق کی ستاری ہے کہ اس نے اپنے لطف و کرم سے ہماری برائیوں کو اچھائیوں سے چھپا دیا ہے۔

چنانچہ پہلے زمانہ کے بزرگ اگر کسی معاملہ میں کسی کو اپنا وکیل بناتے تھے تو اس کو لوگوں سے چھپاتے تھے یعنی لوگ نہ جانیں کہ یہ فلاں کا وکیل ہے تاکہ ایسا نہ ہو کہ لوگ ان کے ساتھ معاملات کرنے میں ان بزرگ کے صلاح و تقویٰ کی رعایت کریں۔ (اس طور پر لوگ اپنی رعایت کا مدار ایک ایسی چیز کو بنالیں جس کا تعلق باطن کے ساتھ ہے اس لئے ڈرتے تھے کہ لوگ مجھے کچھ سمجھ کر معاملہ کریں اور میں ویسا نہ ہوا تو یہ تو ان کی رعایت کو فریب کے ساتھ حاصل کرنا ہوا اس لئے اہتمام کرتے تھے کہ لوگوں کو یہ معلوم ہی نہ ہو کہ یہ فلانے کے وکیل ہیں) یہ تمام صورتیں تو قسم اول کی تھیں جہاں مال دینے سے غرض آخرت کا ثواب ہو۔

رہی دوسری قسم تو وہ یہ ہے کہ مال کے دینے سے مقصود کوئی خاص غرض ہو۔ مثلاً کوئی فقیر ہے جو کسی غنی کو اس لئے ہدیہ دیتا ہے کہ اس سے اس کے عوض کا طالب ہے تو اس کا حکم بیع کا حکم ہے اس لئے کہ ہبہ بعوض بیع کی طرح ہوتا ہے اور اس کا مسئلہ فقہ میں ظاہر ہے۔

چنانچہ اس کا جائز ہونا عوض کی ادائیگی کے ساتھ مشروط ہے (یعنی کوئی شخص اگر یہ جان رہا ہے کہ زید مثلاً جو مجھے ہدیہ دے رہا ہے تو اس کی نیت اور غرض اس سے یہ ہے کہ میں بھی اس کے بدلے میں اسے کچھ دوں تو اگر دینے کی نیت نہیں ہے تو اس کا لینا بھی جائز نہیں ہے اور وہ ہدیہ کیا ہوا لین دین ہوا اسی کو مؤلف نے بیع فرمایا ہے۔)

اور تیسری قسم یہ ہے کہ مال دینے سے اس کا مقصد یہ ہو کہ وہ شخص مال پا کر کسی مخصوص معاملہ میں اس کی مدد کرے۔ جیسے کسی شخص کو بادشاہ سے کوئی حاجت ہے اور وہ ہدیہ دیتا ہے وزیر۔ وکیل اور دربان کو یا ایسے کسی شخص کو جس کے بادشاہ سے تعلقات ہیں تاکہ یہ لوگ بادشاہ سے ملاقات اور حاجت روائی میں اس کی مدد کردیں۔ پس یہاں اس ہدیہ کے جائز اور ناجائز ہونے میں اس کام کو دیکھا جائے گا جو اس کو مقصود ہے اگر وہ کوئی حرام فعل ہے مثلاً ظلم پر اعانت کرنا یا حرام آمدنی حاصل کرنا تو اس کا لینا حرام ہے (یعنی بادشاہ سے ملاقات کرنے والا یہ چاہتا ہے کہ وہ جو ایک ظلم کا کام کر رہا ہے یا حرام آمدنی میں کوشاں ہے۔ بادشاہ سے اس کے جواز کی سند اور تائید حاصل کرلے۔ اس ملاقات کے لئے جن لوگوں کو واسطہ بنایا اور ان کو خوش کرنے کے لئے انہیں کچھ ہدیہ دیا تو چونکہ مقصد ناجائز تھا اس لئے یہ ہدیہ حرام ہوگیا۔) اور اگر وہ فعل کسی شخص پر واجب ہے مثلاً کسی خاص ظلم کو دفع کرنا ہے۔ یا متعینہ گواہی کو ادا کرنا ہے تو اس پر اس سے عمل کرانے کے لئے جو مال خرچ کیا جائے گا وہ رشوت ہے۔ جس کے حرام ہونے میں کچھ شک نہیں ہے۔ مثلاً کوئی شخص کسی عہدہ پر فائز ہے اور کچھ امور اس کے فرائض منصبی میں داخل ہیں تو اب اگر کوئی شخص اسے کچھ دے اور اس کی وجہ سے وہ اپنے فرائض کی ادائیگی کی جانب متوجہ ہو تو یہ رشوت ہے۔

اور اگر وہ کام جس کے کرنے کے لئے روپیہ دے رہا ہے کوئی مباح کام ہے یعنی نہ حرام ہے

اور نہ اس کرنے والے پر واجب ہے تو یہاں یہ دیکھنا چاہئے کہ اس کام کے کرنے میں آیا ایسی محنت اور مشقت ہے کہ مال کی دی ہوئی مقدار بالعموم جس کی اجرت ہوا کرتی ہے۔ مثلاً کسی مقدمہ کا کسی کو وکیل بنانا یا بادشاہ کے سامنے کسی طویل معاملہ کو بیان کرنے کے لئے کسی کو پیشکار تجویز کرنا یا اسی طرح کا اور کوئی کام کسی کے حوالے کرنا (تو ظاہر ہے کہ ان کاموں کے انجام دینے میں محنت پڑتی ہے اور اس کے ترتیب دینے میں وقت اور دماغ صرف ہوتا ہے لہٰذا اس وکیل اور پیشکار کو اگر کوئی شخص بطور محنتانہ کے کچھ روپیہ دیتا ہے) تو اس کے لئے اس مال کا لینا جائز ہے اور اس کی حیثیت اجرت کی ہوگی اور اگر کوئی ایسا فعل مباح ہے جس میں کچھ بھی محنت نہیں۔ مثلاً کسی نے کسی شخص سے یہ خواہش کی کہ آپ فلاں سے میری جانب سے دو کلمہ خیر کہہ دیجئے آپ کا ان سے متعلق ہے وہ بھی آپ کا احترام کرتے ہیں میری ایک جائز حاجت پوری ہو جائے گی۔ ظاہر کہ اس طور پر دو کلمہ بطور سفارش کے کسی سے کہہ دینا کیا مشکل بات ہے لہٰذا محض اس کام کے لئے اگر صاحب حاجت اس شخص کو کچھ مال دے تو اس کا لینا حرام ہے۔

چنانچہ اسی حکم میں ہے طبیب کا فیس لینا جب کہ تعین مرض کے سلسلہ میں محض سرسری طور پر اس کی رائے معلوم کی جائے یا کسی مرض کی دوا اس سے پوچھی جائے۔ اس لئے کہ محض اتنا سا عمل کچھ قیمت نہیں رکھتا اس کی حیثیت رائی کے دانے کے برابر ہے اس لئے اس پر عوض لینا جائز نہیں دراں حالیکہ اس کے علم میں سے کچھ کمی بھی نہ ہوئی بلکہ کچھ تجربہ ہی بڑھا۔

البتہ بعضے عمل ایسے ضرور ہیں کہ دیکھنے میں تو ہیں معمولی لیکن قیمت ان کی زیادہ ہے مثلاً تلوار کی کجی کو دور کر دینا۔ یا اسکا زنگ دور کر دینا یا اس پر پانی چڑھا دینا کہ یہ سب کام ہیں تو تھوڑی دیر کے لیکن زیادہ عمل کا حکم رکھتے ہیں لہٰذا اس پر اگر اجرت دے تو مضائقہ نہیں۔

اور چوتھی قسم یہ ہے کہ مال دینے سے مقصود اس شخص سے انس حاصل کرنا ہو یا قائم شدہ محبت کو بڑھانا ہو اور علاوہ اس کے قطعی کوئی دوسری غرض نہ ہو اور یہ مستحب ہے۔ احادیث اور آثار صحابہ میں اس کی بڑے فضیلت آئی ہے۔

کسی کو مال دینا جن اغراض کی بنا پر ہوا کرتا ہے ان میں سے پانچویں (یعنی آخری) قسم یہ ہے کہ مقصود اس شخص سے تعلق اور صحبت ہی ہو جس کو مال دے رہا ہے۔ لیکن یہ محبت اس کی ذات کے ساتھ نہ ہو بلکہ اس لئے ہو کہ وہ وسیلہ ہو گا اس کے کسی مقصود برابری کا مثلاً اس کے ذریعہ سے اسے عزت اور جاہ حاصل ہوگی۔ اگر اس جاہ کا منشا علم اور نسبت ہے مثلاً یہ کہ کوئی بڑا عالم ہے یا خاندان کا سید ہے اور اس کے تعلق اور دوستی سے اسے بھی علم یا اس صاحب نسب سے فی الجملہ شرف حاصل ہو جائے گا۔ تو یہاں معاملہ بہت ہی خفیف اور معمولی ہے یعنی اس کی شناعت کچھ زیادہ نہیں ہے تاہم ان عالم یا سید صاحب کو اس قسم کا مال لینا جائز بھی نہیں ہے کیونکہ گو بظاہر یہ ہدیہ ہے مگر

رشوت کے مشابہ ہے اور اگر وہ جاہ جو ہدیہ دینے والا حاصل کرنا چاہتا ہے اس قبیل سے ہے کہ مثلاً وہ کسی وقف کا متولی ہونا چاہتا ہے یا شہر کا قاضی یا حاکم بننا چاہتا ہے یا شاہی مناصب میں سے کسی منصب پر فائز ہونا چاہتا ہے اور حال یہ ہے کہ اگر یہ ہدیہ نہ ہو تا تو یہ مرتبہ بھی اسے حاصل نہ ہو تا تو یہ بھی اگرچہ صورتاً ہدیہ ہے لیکن معناً رشوت ہی ہے اس لئے کہ یہاں اس شخص سے کسی معینہ غرض کو اگرچہ نہیں طلب کر رہا ہے غرض کی جنس تو متعین ہی ہے۔ یعنی یہ تو معلوم ہی ہے کہ دوستی پیدا کرنے سے اسکا مقصد کیا ہے اور کس وجہ سے میرے پاس آتا جاتا ہے پس یہ بھی غرض معین ہی کی طرح ہوا۔ یعنی ایسا ہی ہوا جیسے کوئی شخص اپنی کسی معین غرض کے لئے کسی کو واسطہ بنائے اور اس سلسلہ میں اسے کچھ پیش کرے۔ حالانکہ اس کام کے کر دینے میں کوئی مشقت بھی نہیں۔ ہے۔

چنانچہ اس بات پر اتفاق ہے کہ یہاں اس صورت میں اس سے کچھ لینے کی کراہت شدید ہے اور یہ بھی حرمت میں رشوت ہی کے قریب قریب ہے۔ یوں اس مال کے حرمت میں علماء کا اختلاف ہے۔ یعنی بعضوں نے فرمایا ہے کہ حرام نہیں ہے تاہم اس کو مکروہ اور اشد مکروہ سبھی نے فرمایا ہے :۔

والسلام علی من اتبع الھدیٰ وصلی اللہ علیٰ خیر خلقه محمد واٰلهٖ واصحابه اجمعین ○

(اضافہ مفیدہ از مترجم ثانی غفرلہ) اوپر حضرت مؤلف رحمۃ اللہ علیہ نے ہدیہ اور رشوت کا فرق بیان فرمایا ہے۔ اس سلسلہ میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ رشوت سے متعلق قدرے تفصیل اور بیان کر دی جائے کیونکہ صحیح علم نہ ہونے کی وجہ سے بسا اوقات انسان ایک جائز چیز کو بھی ناجائز سمجھ لیتا ہے۔ مرشدنا و مقتدانا حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ سیر کبیر سے اس مسئلہ کی عجیب تفصیل سنایا کرتے تھے جس کو یہاں نقل کرتا ہوں۔ فرمایا کہ سیر کبیر میں ہے کہ

لَا بَأْسَ بِاَنْ يَّرْشُوَ الْاَ سِيْرُ الْمُسْلِمُ بَعْضَ اَہْلِ الْحَرْ بِ لِيَتْرُكَهٗ حَتّٰى يَخْرُجَ اِلٰى دَارِ الْاِ سْلَامِ

یعنی اس میں کچھ حرج نہیں کہ کوئی مسلم قیدی کسی حربی کو کچھ رقم دیدے تاکہ وہ اس کو چھوڑ دے اور یہ دار الاسلام کو چلا جائے۔

آگے اس کی دلیل بیان فرماتے ہیں کہ :۔

لِاَنَّهٗ يَجْعَلُ مَالَهٗ وِقَايَةً لِّنَفْسِهٖ وَبِهٖ اُمِرَ قَالَ صَلَّى اللّٰه عليه وَ اٰلِه وَسَلَّمَ بَعْضَ اَصْحَابِهٖ اِجْعَلْ مَالَكَ دُوْنَ نَفْسِكَ وَنَفْسَكَ دُوْنَ دِيْنِكَ

یعنی ایسا کرنا اس کے لئے اس لئے جائز ہے کہ اس نے اپنے مال کو اپنی جان کی حفاظت کا ذریعہ بنایا جس کا کہ وہ شرعاً مامور ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کسی صحابی سے یہ فرمایا

تھا کہ اپنے مال کو اپنی جان (بچانے) کے لئے خرچ کرو اور اپنی جان کو اپنے دین کی حفاظت میں صرف کرو۔

آگے فرماتے ہیں کہ

وَالأَصْلُ فِيهِ حَدِيثُ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ فَإِنَّهُ حُبِسَ بِالْحَبَشَةِ فَرَشَاهُمْ دِينَارَيْنِ حَتّٰى خَلَّوا سَبِيلَهُ

یعنی اصل اس باب میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا وہ واقعہ ہے جب کہ وہ حبشہ میں قید کر لئے گئے تھے تو انہوں نے اہل حبشہ کو دو دینار رشوت دیکر خلاصی حاصل کرلی تھی۔ آگے فرماتے ہیں کہ

فَعَرَفْنَا اَنَّ هٰذَا لَيْسَ مِنْ جُمْلَةِ السُّحْتِ فِي الْمُعْطِيْ وَاِنْ كَانَ مِنْ جُمْلَةِ السُّحْتِ فِي حَقِّ الْآكِلِ وَاِنَّهُ غَيْرُ دَاخِلٍ تَحْتَ قَوْلِهٖ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ اَلرَّاشِيْ وَالْمُرْتَشِيْ فِي النَّارِ۔ اِنَّمَا قَالَ ذَالِكَ فِيْ حَقِّ الْمُعْطِيْ اِذَا قَصَدَ بِهِ الظُّلْمَ اَوْ اِلْحَاقَ الضَّرَرِ بِغَيْرِهٖ۔

یعنی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے اس فعل سے ہم نے جانا کہ اس قسم کا معاملہ (یعنی ایسے موقع پر رشوت دینا) اس دینے والے کے حق میں حرام نہیں ہے، ورنہ تو ایک صحابی ایسا ہرگز نہ کرتے اگرچہ رشوت کھانے والے کے حق میں وہ حرام ہی ہے۔

نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں بھی داخل نہیں ہے جو آپ نے فرمایا کہ رشوت لینے والا اور رشوت دینے والا دونوں دوزخ میں جائیں گے اس لئے کہ آپ کے ارشاد کا مصداق رشوت دینے والوں میں سے وہ شخص ہے جو کہ اپنی رشوت کو کسی پر ظلم کرنے یا اس کو نقصان پہنچانے کا ذریعہ بنائے۔

آگے فرماتے ہیں کہ :

فَاَمَّا اِذَا قَصَدَ رَفْعَ الظُّلْمِ عَنْ نَفْسِهٖ اَوْ تَحْصِيْلَ مَنْفَعَةٍ لِنَفْسِهٖ مِنْ غَيْرِ اَنْ يَلْتَحِقَ الضَّرَرُ بِغَيْرِهٖ فَلَا بَأْسَ بِهٖ

یعنی اور اگر رشوت دینے سے مقصود اپنے کو نقصان اور دوسرے کے ضرر سے بچانا ہو یا اپنے لئے نفع ہی حاصل کرنا ہو بغیر اس کے کہ کسی دوسرے کا اس سے کچھ نقصان ہو تو اس رشوت میں دینے والے کو کوئی گناہ نہیں ہے۔

آگے فرماتے ہیں کہ :

وَكَذٰلِكَ الْجَوَابُ فِيْ دَارِ الْاِسْلَامِ اِذَا قَصَدَهُ ظَالِمٌ فَلَا بَأْسَ بِاَنْ يُعْطِيَ شَيْئًا مِنْ مَالِهٖ اِلَيْهِ لِيَدْفَعَ الظُّلْمَ عَنْ نَفْسِهٖ

اور یہ حکم جواز رشوت کا دارالاسلام میں بھی ہے جب کہ کوئی ظالم کسی کے پیچھے لگ جائے یعنی یہ کہ اس کو کچھ مال دے دلا کر خود کو اس کے ظلم اور ضرر سے بچانے میں کچھ حرج نہیں ہے۔
اور اس کا یہ دینا حرام نہیں ہے آگے اس کی بھی دلیل بیان فرماتے ہیں کہ :
قَالَ بَلَغَنَا عَنْ أَبِی الشَّعْثَاءِ جَابِرِ بْنِ زَیْدٍ قَالَ مَا وَجَدْنَا فِی زَمَنِ الْحَجَّاجِ شَیْئًا خَیْرًا مِنْ رَشْیٍ۔ وَفِیْ وَصْفِهٖ ذَالِكَ بِالْخَیْرِیَّةِ دَلِیْلٌ عَلٰی اِنَّهٗ لَا اِثْمَ عَلَی الْمُعْطِیْ فِی الْاَعْطَاءِ وَاِنْ كَانَ الْاٰخِذُ اٰثِمًا فِی اَخْذِهٖ۔ وَاللّٰهُ الْمُوَفِّقُ
(شرح السیر الکبیر صفحہ ۲۲۲ ج ۴)

امام سرخسیؒ نے فرمایا کہ ہمیں حضرت ابی الشعثاء جابر بن زیدؒ کا یہ ارشاد پہنچا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ ہم نے حجاج بن یوسف کے زمانہ میں (کہ اس کا اور اس کے عاملین کا ظلم بڑھا ہوا تھا) رشوت سے بہتر (جان و مال اور عزت و آبرو کو بچانے والی) کوئی چیز نہیں پائی۔
دیکھئے رشوۃ کو خیر اور بہتر جو فرما رہے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ ان حالات میں اس کے دینے والے پر کوئی گناہ نہیں۔ اگرچہ لینے والا رشوت کا بہر حال گنہگار ہوتا ہے اس کے لئے جواز کی کوئی صورت نہیں۔ (واللہ الموفق)
دیکھئے علماء کی اس تصریح سے معلوم ہوا کہ رشوت میں تفصیل ہے اور یہ جو عام طور سے ذہنوں میں بسا ہوا ہے کہ ہر رشوت حرام ہے ایسا نہیں ہے۔ لینا اس کا تو بیشک ہر موقعہ پر حرام ہے مگر دینے میں تفصیل ہے یعنی دوسروں کو ضرر پہنچانے کے لئے دینا تو حرام ہے باقی اور صورتوں میں اس کا یہ حکم نہیں ہے۔ خوب سمجھ لیجئے۔
اضافہ مفیدہ ختم ہوا۔

فائدہ از مترجم اولؒ) للہ الحمد اولاً و آخراً وظاہراً و باطناً کہ آداب الصالحین کا ترجمہ مسمی بہ ہادی الناظرین تمام ہوا۔ اس ہیچمدان مترجم نے حتی الامکان اس کی تسہیل اور وضاحت میں کوتاہی نہیں کی لیکن بعض مضامین چونکہ فی نفسہ ادق تھے اس لئے اگر اس کے سمجھنے سے عوام اب بھی قاصر رہ جائیں تو مجبوری ہے تاہم کتاب آداب الصالحین اس میں شک نہیں کہ عجیب و غریب کتاب ہے ہر طرح کے مفید اور پر از ہدایت مضامین اس میں موجود ہیں اور اس عاجز نے اثناء ترجمہ میں کہیں کہیں جو فائدے (لفظ فائدہ لکھ کر) بڑھا دیئے ہیں وہ بھی از بس مفید ثابت ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائے اور ہم کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔
طالبان دین اور سالکان راہ طریق کو چاہیے کہ اس کو اکثر مطالعہ میں رکھیں اس لئے کہ یہ رسالہ درستگی و آراستگی ظاہر اور تصفیہ باطن کے لئے اکسیر اعظم ہے۔
یوں تو یہ بندہ بہر حال ایک عاجز و قاصر انسان ہے اگر مجھ سے اس میں کہیں خطا ہو گئی ہو اور

کوئی صاحب اس پر مطلع ہوں تو ان سے میری گزارش ہے کہ ضرور اس کی اصلاح فرمادیں کہ مقصود اظہار حق ہے جس کے ذریعہ سے بھی ہو جائے خوب ہے اور اس مسکین اور بینوا کو دعائے خیر سے یاد رکھیں۔

نیز اس کتاب آداب الصالحین میں خاص تاثیر دیکھی گئی ہے (یعنی اس کے پڑھنے والے کو کچھ نہ کچھ نفع ضرور پہونچتا ہے) اور کیوں نہ ہو یہ کتاب ہے بھی تو ایک عالم ربانی حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی جو ایک بلند پایہ بزرگ تھے ان کے فضائل اور کمالات میں لوگوں نے مضامین اور رسالے لکھے ہیں۔ ان کے مختصر حالات حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ ہی کے مقبرے میں ایک تختی پر لکھے ہوئے ہیں، جسے یہاں نقل کرتا ہوں :۔

"مجمل احوال کرامت منوال اس مقتدائے وقت صاحب الفاخر وا لمجد شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ رحمۃً واسعۃً کا یہ ہے کہ انہوں نے ابتدائے سن شعور ہی سے عبادت گزاری اور طلب علم میں کمر ہمت باندھی اور سن بلوغ کو پہنچتے پہنچتے اکثر علوم دینیہ حاصل کرلئے اور تقریباً بائیس برس کی عمر میں تمام علوم وفنون سے فارغ ہوگئے اور کلام اللہ حفظ کر کے مسند ارشاد پر رونق افروز ہوئے۔ ابھی جوان ہی تھے کہ جاذبہ الٰہی نے دستگیری فرمائی ایک بارگی یار اور دیار سے دل اچاٹ ہوگیا۔ چنانچہ عازم حرمین شریفین ہوئے۔ ایک طویل مدت تک ان مقامات مقدسہ میں اقامت اختیار کی اور وہاں کے اولیاء و اقطاب کی صحبتوں سے مستفید ہو کر باطنی کمالات حاصل کئے۔ یہاں تک کہ طالبین کی اصلاح اور تربیت کی اجازت پائی۔

علاوہ اس باطنی سلسلہ کے فن حدیث کی بھی تکمیل کر کے علوم ظاہری وباطنی کی برکات سے مالا مال ہو کر وطن مالوف واپس تشریف لائے اور باون سال تک ظاہری وباطنی جمعیت وسکون کے ساتھ یہاں اقامت فرمائی اور اپنے فرزندان نیز دیگر طلباء وطالبین کی تکمیل فرمائی اور جملہ علوم دینیہ بالخصوص حدیث شریف کی اشاعت میں تو ایسے مشغول ومعروف ہوئے کہ اتنا شہرہ دیار عجم میں علماء متقدمین ومتاخرین میں سے کسی کو بھی حاصل نہیں ہوا۔

چنانچہ آپ نے دیگر علوم وفنون میں بھی اور خاص کر علم حدیث میں معتبر کتابیں تصنیف فرمائیں اور علماء نے انہیں قبول کیا اور اپنا دستور العمل بنایا چنانچہ خواص وعوام میں کے جو اہل دانش ہوئے انہوں نے تو اپنے جان ودل کو اس کی قیمت قرار دیا۔ مجموعی تعداد اس صاحب فیض کے چھوٹی بڑی تصانیف کی سو تک پہنچتی ہے اور باعتبار سطروں کے شمار کے پانچ لاکھ کو پہنچتی ہے۔ ماہ محرم ۹۵۸ھ میں آپ کی پیدائش ہوئی اور ۱۰۵۲ھ میں آپ نے وفات پائی (اس لحاظ سے گویا آپ کی عمر شریف ۹۴ سال کی ہوئی۔

آپ کی تاریخ ولادت "شیخ اولیائی" اور تاریخ وفات "فخر العالم" ہے۔ لوح مذکورہ کا مضمون

ختم ہوا۔

اور یہ ترجمہ جو آپ کے سامنے ہے حضرت سلطان ابن سلطان کابرًا عن کابر ابوالظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ بادشاہ ثانی کے عہد ہمایوں مہد میں تالیف کیا گیا۔

اللھم اید الاسلام بتقویۃ سلطنتہ ووفقہ لمرضاتہ واختم جمیع امورہ علی الخیر والسعادۃ اللھم انصر من نصر دین محمد واخذل من خذل دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم

(یعنی اے اللہ آپ اسلام کی مدد فرمایئے ان کی سلطنت کو مضبوط بنا کر اور خود ان کو اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق عطا فرمایئے اور تمام امور کا انجام خیر اور سعادت کو بنایئے۔ اے اللہ اس کی مدد فرما جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی نصرت کرے اور تو اس کی نصرت سے ہاتھ کھینچ لے جو آپ کے حبیب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی مدد نہ کرے) یا الٰہی اس ترجمہ میں مجھ سے جو کچھ خطا اور چوک ہوئی ہو اسے آپ معاف فرما دیجئے اور میرے سب گناہ بخش دیجئے۔ اور میرا خاتمہ بخیر فرمایئے اور مجھ ناکارہ کا حشر زمرۂ صلحا میں فرمایئے اور اے اللہ میرے ماں باپ کو اور تمام مسلمانوں کو بخش دیجئے اور ہم پر رحم فرمایئے۔

مناجات

الٰہی میں ہوں بندہ بس گنہگار
کہ بھاگا در سے تیرے دن میں سو بار
الٰہی در بدر بھٹکا پھرا میں
نہ آسودہ ہوا ہرگز ذرا میں
الٰہی نفس و شیطاں نے ستایا
نہ جانا تھا جہاں رستا بتایا
الٰہی ہر طرف سے پھر پھرا کر
پڑا اب تیرے دروازے پہ آ کر
الٰہی تو شہنشاہِ جہاں ہے
الٰہی دوسرا تجھ سا کہاں ہے
نہیں قادر الٰہی کوئی تجھ سا

نہیں عاجز الٰہی کوئی مجھ سا
الٰہی تو غنی میں بے نوا ہوں
الٰہی شاہ تو ہے میں گدا ہوں
الٰہی تو غفور اور میں گنہگار
الٰہی تو کریم اور میں گرفتار
الٰہی تو قوی اور ناتواں میں
خداوند کہاں تو اور کہاں میں
کیا میں نے جو تھا مجھ کو سزاوار
تو اب وہ کر جو ہے تجھ کو سزاوار
الٰہی میں کروں غم کس سے اظہار
الٰہی کون ہے میرا مدد گار
الٰہی کمترین بندگاں جاں
الٰہی کر مری مشکل تو آساں
الٰہی بخش دے اپنے کرم سے
چھڑا دے دین اور دنیا کے غم سے
الٰہی ہیں سبھی محتاج تیرے
الٰہی بخش دے ماں باپ میرے
الٰہی آسرا رکھتا ہوں تیرا
تو کر دے خاتمہ باخیر میرا
الٰہی نام سے دے اپنے الفت
الٰہی غیر کی صورت سے نفرت
نہ رکھوں کچھ غرض شاہ وگدا سے
جو کچھ چاہوں سو چاہوں تجھ خدا سے
الٰہی ترک دنیا جب کروں میں
تری ہی یاد میں آخر مروں میں
الٰہی عشق میں احمد کے رکھ چور
کہے بیمار محبت اس کا مغفور
الٰہی درد عشق مصطفیٰ دے

پھر اس کے وصل کی مجھ کو دوا دے
الٰہی سینۂ بریاں عطا کر
الٰہی دیدہ گریاں عطا کر
الٰہی مجھ کو کر خاک مدینہ
لگا دے گھاٹ سے میرا سفینہ
الٰہی ہوں میں یاں سے جب نرالا
تو میری گور میں کردے اجالا
الٰہی آگ سے امن واماں دے
الٰہی جنت اعلیٰ مکاں دے
الٰہی نجنی من کل ضیق
بجاہ المصطفیٰ مولیٰ الجمیع
وھب لی فی مدینتہ قرارًا
بایمان ودفن بالبقیع

امین رب العالمین وصل علیٰ خیر خلقہ محمد والہ واصحابہ اجمعین برحمتک یاارحم الرحمین۔

(گزارش از ناقل) حق تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر اور احسان ہے کہ اس نے رسالہ "آداب الصالحین" (بزبان فارسی) کے ترجمہ اور شرح میں تالیف شدہ رسالہ "ہادی الناظرین" (بزبان اردو قدیم) کی تسہیل وتوضیح (بزبان اردو جدید) توفیق عطا فرمائی۔ چنانچہ رسالہ "اسوۃ الصالحین" جو اسی خدمت کے انجام دینے کے لئے معرض وجود میں آیا تھا الحمد اللہ کہ پایہ تکمیل کو پہنچ گیا۔

جیسا کہ مقدمہ میں عرض کیا جاچکا ہے کہ سبب اس کی تالیف کا تو دراصل مرشدی ومولائی حضرت شاہ وصی اللہ صاحب فتحپوری قدس اللہ سرہ کی خواہش اور پسندیدگی ہوئی تھی چنانچہ۔

"می دہد یزداں مراد متقیں"

بحمد اللہ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اقدس کے خدام ہی کے ذریعہ حضرتؒ کی اس خواہش کو پورا فرمادیا۔ لیکن یہ کام چونکہ حضرت والاؒ کی حیات مبارکہ میں نہ ہوسکا اس لئے اس کی صحت پر ویسا اطمینان جو حضرت والاؒ کی نظروں سے کسی مضمون کے گزار لینے سے ہوجاتا تھا ظاہر ہے کہ یہاں نہیں ہوسکا پھر بھی جہاں تک انسانی کوشش کا تعلق ہے اہتمام کے ساتھ ترجمہ کیا گیا ہے اور واقعہ میں تو یہ رسالہ قدیم اردو سے جدید اردو میں منتقل کیا گیا ہے لیکن اس کو ترجمہ اس لئے کہا کہ جاننے

والے جانتے ہیں کہ بسا اوقات قدیم اردو کے بھی جملے اس انداز کے ہوتے ہیں کہ انکا سمجھنا نہایت مشکل ہو جاتا ہے چنانچہ مجھے بھی کتاب ہادی الناظرین کی زبان بدلتے وقت یہ اندازہ ہوا کہ شاید اصل کتاب یعنی آداب الصالحین اگر سامنے ہوتی تو براہ راست اس کا ترجمہ کر دینا اس تبدیلی سے کہیں آسان تر ہوتا۔

بہرحال الانسان مرکب من الخطا والنسیان بھی حق ہے اس لئے عجب نہیں کہ اس بے استعداد سے کسی مقام پر مؤلف رحمہ کا منشاء سمجھنے میں غلطی ہو گئی ہو یا مضمون کی ادائیگی سے الفاظ قاصر رہ گئے ہوں ارباب صلاح اس کی اصلاح فرمادیں۔

یہ ترجمہ رسالہ معرفت حق میں جب ابتداءً شائع ہونا شروع ہوا تھا اسی وقت احباب نے اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا پھر درمیان درمیان بعض حضرات اس سلسلہ کو اپنے تحسینی کلمات اور ارباب رسالہ کو اپنی دلی دعاؤں سے نوازتے رہے اس سے امید ہوتی ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ اس ترجمہ سے لوگوں کو نفع پہنچے گا۔

اللہ تعالیٰ ہم کو اور سب مسلمانوں کو اس سے مستفید فرمائے اور ان تمام حضرات کو جنہوں نے اس کے منظر عام پر لانے میں کسی قسم کا بھی تعاون فرمایا ہے اجر کثیر عطا فرمائے اور ہم سبکو اپنی محبت و نسبت کا ایک ذرہ نصیب فرمائے اور ہماری اس تمام ترسعی اور محبت کا ثواب حضرت اقدس نور اللہ مرقدہ کی روح پر فتوح کو پہنچائے۔

بحرمۃ حبیبہٖ محمدٍ والہٖ واصحابہٖ اجمعین وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

تمت